ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

فروری ۱۹۹۴ء

شرارت نمبر

۱۰۰ شرارتی تحریریں

شرارتی تصویریں

شرارتی کارٹون

شرارتی معمّے

چسپ نظمیں

اور اس کے علاوہ

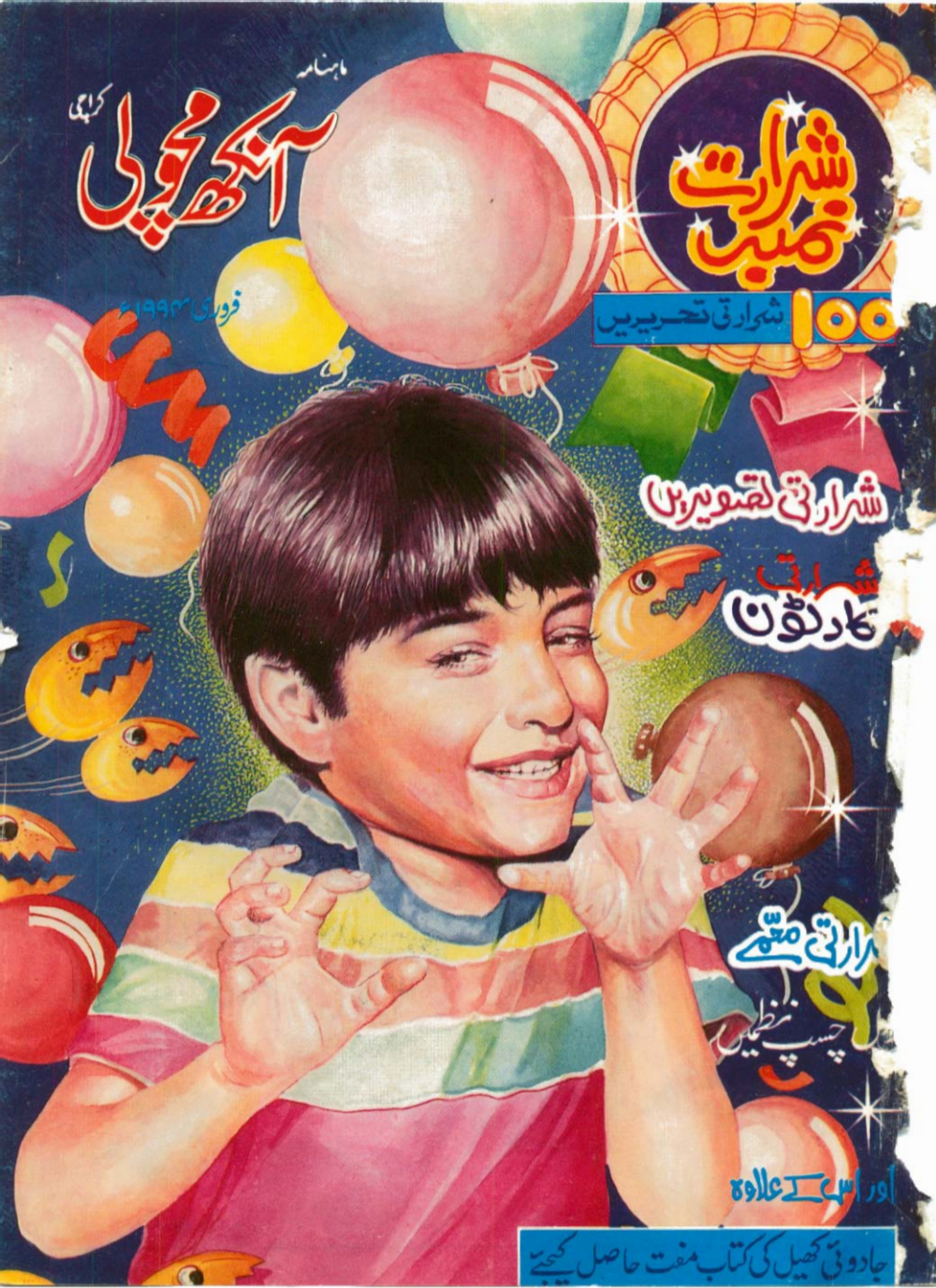

جادوئی کھیل کی کتاب مفت حاصل کیجیے

Hilal
Hajmola
CANDIES
Hilal
Hajmola
CANDY
albela
aam
Hilal
Hajmola
CANDY
chulbuli
imli
Hilal
Hajmola
CANDY
ھلال کی ہاجمولا
ادرک ، املی ،آم
Hilal Confectionery (Pvt) Ltd.
Noorani Process

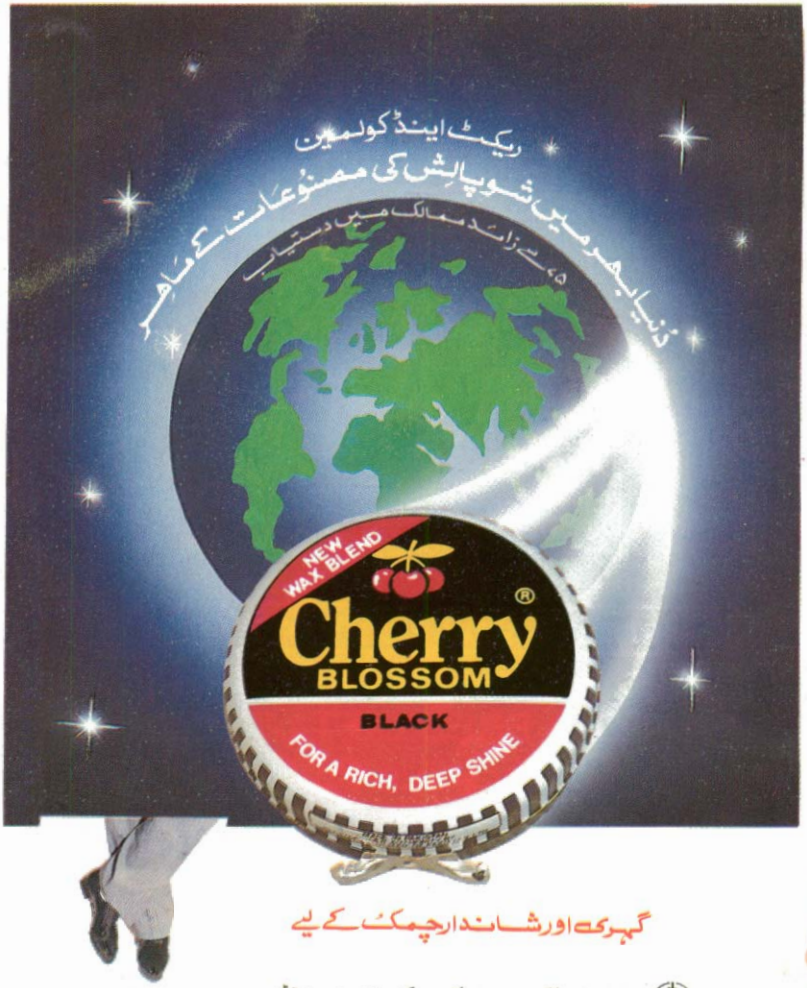

گہری اور شاندار چمک کے لیے

R&C ریکٹ اینڈ کولمین آف پاکستان لمیٹڈ

Trust Your Favorite Sweater to Your Drycleaner

Member ABCH International

Snowhite
DRY CLEANING INDUSTRIES
Karachi – Multan – Lahore – Rawalpindi

IFI U.S.A.

Head Office: Snowhite Centre, Abdullah Haroon Road, Karachi. Phones: 5681723-2 Lines-5685124-3 Lines, Fax: 5683936.

Branches: Bahadurabad, Tel: 413695 • Burns Road, Tel: 213336 • Clifton, Tel: 573298 • Defence, Tel: 577834 • Gurumandir, Tel: 410521 • Garden Road, Tel: 7722433 • Kharadar, Tel: 204175 • Shahrah-e-Faisal, Tel: 446682 • Carpet Cleaning Div., Tel: 5685124 3 Lines • Multan, Tel: 40538 • Lahore, Tel: 874933 • Rawalpindi, Tel: 567988

IMAGE Communications

As soon as you turn it on, you're the boss.

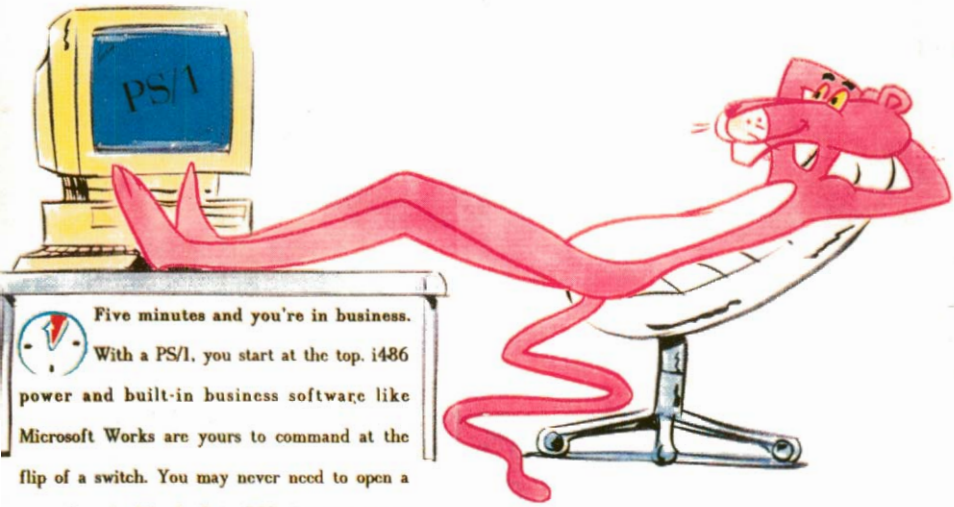

Five minutes and you're in business. With a PS/1, you start at the top. i486 power and built-in business software like Microsoft Works are yours to command at the flip of a switch. You may never need to open a manual again. The built-in PS/1 Tutorial shows you how everything works, and the PS/1 Index is always there to answer your questions. PS/1 Fitness lets you adjust and maintain your PS/1 yourself. And of course, IBM offers its full Support & Services round the year. Sound easy? Sure. But then, isn't it time you had a computer that understands who's the boss?

intel inside

PS/1
The easy one.

For details, please call our Business Partners:

IBM Business Partner

BCI Khi ☎ 570021 Lhe ☎ 5880193 Isl ☎ 211013 Pshr ☎ 42822
I.O.P. Khi ☎ 2412023 Lhe ☎ 7587292 Pindi ☎ 424322 Pshr ☎ 45474
C.G.S. Khi ☎ 440368 Lhe ☎ 877805 Isl ☎ 256563
E.G.S. Khi ☎ 4535970 Lhe ☎ 6661809 Isl ☎ 211034
Pshr ☎ 273337 Qta ☎ 45442 Fsbd ☎ 48176
Hi-Tech. Khi ☎ 525609 Lhe ☎ 6364484 Isl ☎ 821836
SBS Khi ☎ 5689823

IBM
Personally yours

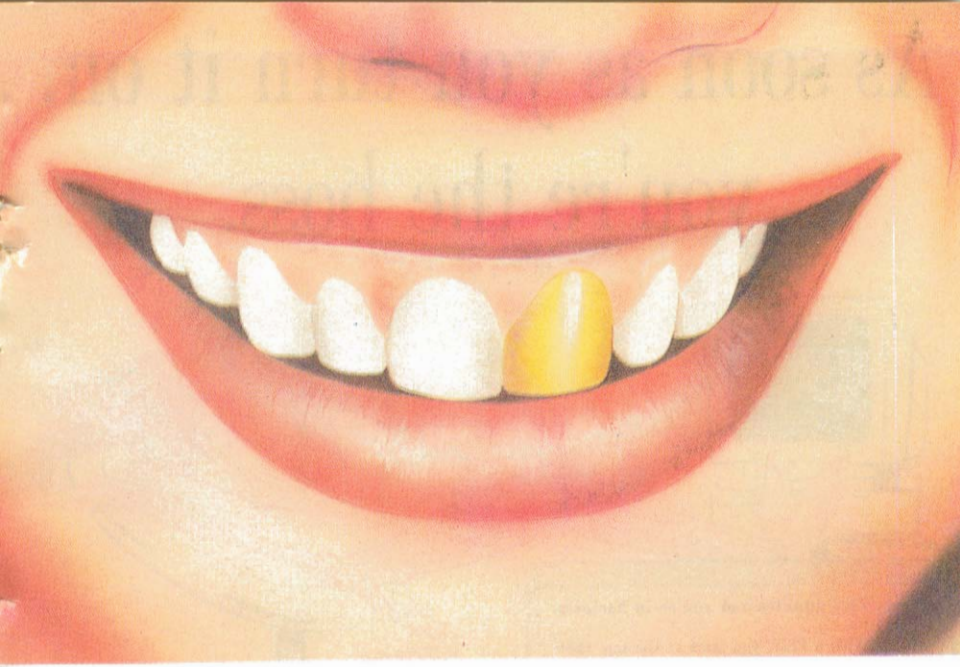

سونا بھی
آپ کی کھوئی ہوئی مُسکراہٹ
وَاپس نہیں لاسکتا

"عام ٹوتھ پیسٹ آپ کے دانتوں کی صفائی اور مسوڑھوں کی مکمل حفاظت نہیں کرتے جس کی وجہ سے آپ کے دانت جلد گر جاتے ہیں اور آپ کی مسکراہٹ ہمیشہ کیلئے کھوجاتی ہے۔ میں نے طویل تحقیق کے بعد فارہینز تخلیق کیا اور اس میں ایک منفرد اسٹرنجنٹ شامل کیا جو آپ کے دانتوں کو مسوڑھوں میں مضبوطی سے قائم رکھتا ہے جس کی وجہ سے ان میں خلاء پیدا نہیں ہوتا اور اس طرح پلاک جیسے دشمن کے خلاف تحفظ فراہم کرتا ہے۔ میری ضمانت ہے کہ فارہینز کے باقاعدہ استعمال سے آپ کے دانتوں اور مسوڑھوں کو مختلف بیماریوں کے خلاف تحفظ فراہم ہوگا۔"

R.J. Forhan DDS

(امریکہ کے مشہور ڈینٹل سرجن ڈاکٹر آر۔ جے فارہین)

کھانے کے اجزاء اور جراثیم دانت اور مسوڑھوں کے درمیان جمع ہوکر پلاک بناتے ہیں۔
فارہینز میں موجود اسٹرنجنٹ آپکے دانتوں کو مسوڑھوں میں مضبوطی سے قائم رکھتا ہے جسکی وجہ سے آپکے دانت اور مسوڑھوں کے درمیان خلاء پیدا نہیں ہوتا اور یوں پلاک بننے نہیں پاتا۔

صحت مند مسوڑھے۔ مضبوط دانت

انٹرنیشنل لیبارٹریز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، کراچی

رُوح پَرَوَر
ہمدرد چائے

پرورش رُوح و جسم کے لیے مقدس سرزمینِ پاکستان میں روئیدہ جڑی بوٹیاں!

نباتات سے تیار کردہ ایک رُوح پرور چائے' درآمدہ چائے کی ہر خرابی سے معرّیٰ و مبّرا

ہمدرد کے ماہرینِ نباتات اَور بلند مرتبہ سائنس داں بیت الحکمہ میں اَور مدینۃ الحکمۃ کی
تحقیقاتی معملوں میں عرصہ تک کوشاں رہے اَور سرگرداں کہ پاکستان کی مقدس سرزمین میں
روئیدہ نباتات سے ایک رُوح پَرَوَر" ہمدرد چائے" تیار کی جائے کہ جس کے
ایک دو چمچے خفتہ حواس و اعصاب میں اعتدال کے ساتھ بیداری پیدا کرکے انسان کو کار ہائے بسیار
کے لیے تیار کر دے اَور فکر و ذہن کو تازگی دے کر صحتِ کار کے لیے آمادہ کر دے۔
بہ یک وقت رُوح پَرَوَر اَور ہاضم ہمدرد چائے اب تیار ہے۔
اور ہاں' اس طرح تیار ہے کہ ایک یا دو چمچے گرم پانی میں ملائیے اور نوشِ جان کیجیے۔
دودھ میں ملائیے تو ایک اور ذائقہ پائیے۔

نونہال ہوں کہ نوجوان' جواں ہوں کہ بوڑھے سب کے لیے رُوح پَرَوَر

مدینۃ الحکمۃ

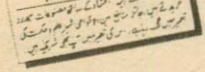

رُوح پَرَوَر
ہمدرد چائے
ایک نہایت نفیس چائے

ہمدرد لیبارٹریز (وقف) پاکستان

Abundant dewy raindrops become the river flow, Rushing torrents quell so languid lakes can grow: Water, water everywhere, less and less to drink. What of tomorrows ahead, without this living link ?

WATER POLLUTION

Clean air and clean water should be basic human rights the world over but they are becoming increasingly scarce and expensive commodities At least 1 in 15 city dwellers and 3/4 of villages in the Third World are without reasonably safe supplies of drinking water.

ICI

ICI Pakistan Limited

Soda Ash • Polyester Staple Fibre • Paints • Agrochemicals & Seeds • Chemicals • Pharmaceuticals • Consumer Products

capri
قدرتی موئسچرائزر
Aloe Vera کے ساتھ
ایلوویرا
کیپری کا ملائم جھاگ نرمی سے آپ کی جلد کو صاف کرتا
ہے اور اس میں موجود خصوصی ایلوویرا موئسچرائزر جلد کی
قدرتی نمی کو محفوظ رکھتا ہے۔ ریگولر کے علاوہ تین حسین رنگوں
اور منفرد خوشبوؤں ۔ Sandalwood ۔ Floral
Gardenia ۔ میں دستیاب۔ گھر کے ہر فرد کا انتخاب
جلد کی حفاظت، جلد کی نفاست
PRESTIGE

الٹرامیڈ
ایک منفرد ٹوتھ پیسٹ
جو یقینی علاج بھی ہے
اور خوش ذائقہ بھی۔
اب برش کیئر کور کے
تحفہ
کے ساتھ
IFF انگلینڈ کے
تعاون سے تیار کردہ
Shield®
S
ULTRAMED
Toothpaste with advanced medicated formula.

LASER DOT

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

آنکھ مچولی

جلد نمبر ۸ شمارہ نمبر ۸

آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے تصدیق شدہ اشاعت
رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی
رکن پاکستان چلڈرنز میگزین سوسائٹی

شعبان/رمضان ۱۴۱۴ھ فروری ۱۹۹۴ء

مدیر اعلیٰ
ظفر محمود شیخ
منتظم اعلیٰ
تجمل حسین چشتی
منیجنگ ایڈیٹر
ایم اے فاروقی
مدیر اعزازی
طاہر مسعود
مجلس ادارت
منیر احمد راشد، محمد عمر احمد خان
سرکولیشن مینجر
بابر فاروقی
مصوّر
مومن رحیم

ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جا سکتی۔ ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں۔ کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔ ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیر سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا ہے۔

قیمت ۲۰ روپے
۱۴ درہم ۱۴ ریال

فون: ۴۹۴۲۸۵۷

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی ۵-اے پی آئی بی کالونی کراچی ۵ (۷۴۸۰۰)

ناشر: ظفر محمود شیخ ۔ طابع: زاہد علی ۔ مطبع: لاریب پرنٹنگ پریس ایم اے جناح روڈ کراچی

حسنِ ترتیب

۱۱۶ — نعیم مشتاق نومی —— ببلو گبلو
۱۲۱ — سیدہ صدف عرفان —— یونیورسل شرارتی
۱۲۵ — شازیہ فرحین —— شرارت برائے روزگار
۱۲۹ — شبّر علی چنگیزی —— اُف میری کہانی
۱۳۷ — فرحین —— عانی تم بہت شریر ہوگئے ہو
۱۴۱ — مُنیرا احمد فردوس —— بن بلایا مہمان
۱۴۷ — محمد عاقل احمد خان —— امّاں بی کی شرارت
۱۵۲ — سلمان غزالی —— شرارت ہی تو ہے
۱۵۷ — مہوش سکندر —— شریر ہرن
۱۶۰ — تنویر پھول —— نغمۂ شرارت
۱۶۱ — خان اکبر علی خان —— ایڈیسن کی شرارتیں
۱۶۳ — افشاں بشیر —— موج میلہ
۱۶۶ — ابنِ مالک —— جن کا بچہ
۱۶۹ — صفیان علی شیخ —— بارش، آبا جان اور ہمیں
۱۷۳ — اشتیاق احمد —— بچاؤ
۱۷۹ — عثمان بن سلیم —— کرنے چلے شرارت
۱۸۵ — عرفان احمد —— مجھے یاد ہے وہ ذرا ذرا
۱۸۹ — لطائف —— ہنستے ہنستے
۱۹۳ — ادارہ —— امتحان ہے آپ کی ذہانت کا
۱۹۷ — ادارہ —— عکس ادھورے کیجئے پورے
۲۰۱ — محمد فاروق دانش —— شرارتی نیکی
۲۰۶ — ایاز محمود —— سوال یہ ہے
۲۰۹ — محمد عمر احمد خان —— وہ کیا راز تھا
۲۱۳ — قارئین کے منتخب خطوط —— بنام آنکھ مچولی
۲۱۷ — منیر احمد راشد —— تمھیں پتہ ہے
۲۲۲ — ادارہ —— مزید محنت کی ضرورت ہے
۲۲۳ — الف خان —— پورب کی ہوا
۲۳۱ — ادارہ —— جادوئی کھیل
۲۳۳ — ۲۴ ننھی تحریریں —— قلم دوست
٭ ٭ — دُنیا بھر سے انتخاب —— کارٹون، لطیفے اور آقتباسات

حسن ترتیب

سنہرے حروف	اداریہ	۱۶
ماہِ رواں کی پہلی بات		۱۷
مدیرِ اعزازی کا صفحہ		۱۸
ایک خوش طبع صحابی	ممتاز حبیب	۱۹
میری پہلی اور آخری شرارت	میرزا ادیب	۲۱
جنید شریر	آصف وقار آصف	۲۶
بے چارے بھائی جان	سیدہ فاکہہ عرفان	۲۹
میاں جی کی جوتی	س، م، دانش	۳۲
شادی اور شرارت	عمر فاروق	۳۶
شرارتوں کے شہر میں	ضیاء الحسن ضیاء	۳۹
جیوں ہوتا	سہلہ فیاض	۴۰
شریر جانوروں کا باوا آدم	محمد جاوید خالد	۴۴
شریر لڑکوں کی قوالی	عبدالقادر	۴۶
اے خدا مجھے معاف کر دے	محمد یوسف گل	۴۹
پہاڑی بکرا	سجاد حسین	۵۴
لینے کے پڑ گئے دینے	تسکین زیدی	۵۸
مینا بازار	نذیر انبالوی	۶۲
توبہ توبہ	حافظ محمد سلیم	۶۶
شرارت کا بدلہ	محمد فاروق منیر	۷۱
میں شرارت نہیں کرتا	شیخ عاکف حمید	۷۳
ابو جی کے کمالات	حمیرا نان سرور	۷۵
شرارت مہنگی پڑی	اظہر رضا اجنبی	۸۱
کھل نہ جائے میرا پول	نعیم مشتاق نومی	۸۵
اشرف کی شوخی	شان الحق حقی	۸۶
میری جو شامت آئی	شگفتہ شمیم	۸۷
ادیبوں کی شرارتیں	شیخ عبدالمجید عابد	۹۳
اُف میری توبہ	سلمان مراد	۹۸
چوہے کی شرارت	محمد عادل منہاج	۱۰۱
اچھا تو دُنیا ایسی ہے	عباس عالم	۱۰۸
بیگار کیمپ اور شرارت	محمد بن مالک	۱۱۰

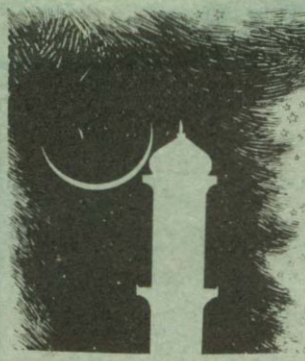

سنہرے حروف

آدھی رات گزر چکی تھی۔ بایزید بسطامیؒ قبرستان سے تنہا گھر واپس آرہے تھے۔ راستے میں انہیں ایک شرابی ملا جو باجا بجا رہا تھا اور راہ گیروں کو گالیاں دے رہا تھا۔ بایزیدؒ نے شرابی کو سمجھانے کی کوشش کی تو وہ سخت طیش میں آگیا اور گالیاں دیتے دیتے ان کے سر پر اپنا باجا دے مارا۔ باجا ٹوٹ گیا اور بایزیدؒ کے سر سے خون کا فوارہ بہہ نکلا۔ بایزیدؒ نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا اور خون پونچھتے ہوئے خاموشی سے گھر واپس آگئے۔

دوسرے دن بایزیدؒ نے اس شرابی کو مٹھائی کی ایک ٹوکری اور کچھ درہم بھجوائے اور یہ کہلوایا۔

"رات تمہارا باجا میرے سر پر لگنے سے ٹوٹ گیا تھا۔ میرے سر نے تمہارا باجا توڑ دیا۔ یہ درہم بھیج رہا ہوں۔ تم نیا باجا خرید لو اور کل رات تمہاری زبان بہت تلخ تھی۔ اس کے لئے یہ مٹھائی بھی بھیج رہا ہوں تاکہ تمہاری زبان شیریں ہو جائے۔"

شرابی نہایت شرمندہ ہوا۔ اپنے بہت سے شرابی دوستوں کو لے کر بایزید بسطامیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور معافی کا طلب گار ہوا۔

اس نے اور اس کے دوستوں نے آئندہ شراب پینے سے توبہ کرلی۔

پہلی بات

آپ نے اب تک نہ جانے کتنی بار سنا اور پڑھا ہوگا کہ انسان اشرف المخلوقات ہے لیکن کیا آپ نے کبھی اس کے معنی پر بھی غور کیا ہے۔ آپ کہیں گے جی ہاں انسان اس لئے ساری مخلوق سے برتر ہے کہ خدا نے اسے عقل کی صلاحیت دی ہے۔ اسے بُرے بھلے میں تمیز کرنے کا سلیقہ بخشا ہے وغیرہ۔ آپ کی بات بالکل صحیح ہے لیکن بھلا کیا حرج ہے کہ ہم اس معاملے کو ایک اور طریقے سے دیکھیں۔

آپ خوب جانتے ہوں گے کہ خدا نے اپنی ہر مخلوق میں کوئی نہ کوئی ایسی صلاحیت ضرور رکھی ہے جس کی بنا پر وہ باقی دوسری مخلوقات سے افضل نظر آتی ہے۔ جیسے خدا نے شیر کو بہادری، لومڑی کو چالاکی، بھیڑیئے کو درندگی دی ہے، گھوڑے کو رفتار، مور کو حسن، چیونٹی کو عقل عطا کی ہے، سانپ کو زہر، گینڈے کو طاقت اور بچھو کو ڈنک دیا ہے۔ اسی طرح طوطے کو بولنے اور بندر کو نقل کرنے کی مہارت دی ہے۔ غرض یہ کہ ہر جانور میں کوئی ایسی خاصیت رکھی ہے جس سے وہ پہچانا جاتا ہے۔ یہ صرف انسان ہی ہے جس کے اندر خدا تعالیٰ نے تمام مخلوقات کی ساری صفات ایک ساتھ جمع کر دی ہیں۔ انسان شیر کی طرح بہادر بھی ہے، لومڑی کی طرح چالاک بھی اور بھیڑیئے کی طرح سفاک بھی۔ انسان گینڈے کی طرح طاقت ور بھی ہے اور مور سے زیادہ حسین بھی اور چیونٹی سے کئی لاکھ گنا عقل مند بھی۔ وہ سانپ کی طرح زہریلا اور بچھو کی طرح اپنے ہی بھائی کو نقصان پہنچانے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ وہ طوطے کی طرح بچپن میں بولنا سیکھتا ہے اور بندر کی طرح شرارتی بھی ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان میں جہاں اتنی صلاحیتیں ایک ساتھ جمع کر دی ہیں وہاں اسے ایک مشکل میں بھی ڈال دیا ہے۔ وہ مشکل یہ ہے کہ اسے ہر عمل کا ذمہ دار بنا دیا ہے۔ انسان اور حیوان میں فرق یہ ہے کہ حیوان اپنے عمل کے ذمہ دار نہیں ہوتے۔ وہ اپنی صفات کو عادتاً استعمال میں لاتے ہیں، بغیر سوچے سمجھے۔ انسان کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ انسان ہر بات اور ہر عمل کا جواب دہ ہے۔

ایک بات اور یہ ہے کہ خدا نے انسان کو کوئی بھی صلاحیت بلاوجہ نہیں دی ہے۔ ہر صلاحیت کا کوئی نہ کوئی فائدہ ضرور ہے۔ انسان میں شوخی، شرارت اور چنچل پن اس لئے ہے تاکہ ماحول کی سنجیدگی ذرا کم ہو سکے۔ زندگی میں رونق اور چہل پہل ہو۔ لوگ ہنس بول سکیں اور خوش رہ سکیں لیکن ہر ایسی شرارت جو دوسروں کو خوش کرنے کے بجائے ان کو تکلیف پہنچانے کا سبب بن جائے وہ شرارت نہیں شر انگیزی ہے اور اس کے لئے انسان کو کہیں نہ کہیں جواب دہ ہونا پڑتا ہے۔ گھر والوں کے سامنے، عام لوگوں کے سامنے اور پھر خدا کے سامنے۔ چنانچہ انسان ہونے کے ناطے ہماری شرارتیں بھی ایسی ہونی چاہئیں کہ ہم اپنی شرارتوں میں بھی تمام مخلوقات سے اشرف نظر آئیں۔ "شرارت نمبر" کو پڑھتے ہوئے اور شرارتیں کرتے ہوئے اس بات کو کبھی نہ بھولئے۔ آپ کا دوست

ظفر محمود شیخ

مدیر اعزازی کا صفحہ

اب مجھے یاد نہیں کہ "شرارت نمبر" کی تجویز کس نے پیش کی تھی۔ ہماری اپنی تھی یا کسی ساتھی کا مشورہ تھا۔ بہر حال "شرارت نمبر" آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس شمارے کے اعلان کے ساتھ ہی ڈھیروں تحریریں موصول ہونی شروع ہوئیں۔ یہاں تک کہ ان کی تعداد کو دیکھتے ہوئے ہمیں یہ شمارہ جنوری کے بجائے فروری تک ملتوی کرنا پڑا۔ اس کی معذرت قبول کیجئے۔ بعض ساتھیوں نے لکھا کہ یہ بھی آپ کی شرارت ہے۔ وعدہ خلافی بھلا شرارت کیسے ہو سکتی ہے۔ اس شمارے کے سلسلے میں ہمیں بس اتنا ہی کہنا ہے کہ یہ آپ ہی کی تحریروں سے ترتیب دیا گیا ہے۔ گویا اس کی خوبیوں اور خامیوں کے ذمہ دار بھی آپ ہی لوگ ہیں۔

آنکھ مچولی نے ضخیم موضوعاتی شمارے نکالنے کا جو سلسلہ اب سے پانچ سال قبل شروع کیا تھا وہ اتنا مقبول ہوا کہ دعوہ اکادمی نے موضوعات دے کر رسالوں میں مقابلوں کا آغاز کر دیا۔ آنکھ مچولی ان مقابلوں میں دو مرتبہ بہترین شمارے کا ایوارڈ جیت چکا ہے۔ اگلے مہینے "خاص بچے نمبر" کے موضوع پر رسائل کے درمیان مقابلہ ہے۔ ہم اس مقابلے میں شریک نہیں ہوں گے۔ دیئے گئے موضوع پر تحریریں ہمارے رسالے میں شامل ضرور ہوں گی لیکن اس مقابلے سے ہم دستبردار ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔ ہماری رائے میں یہ مقابلہ اب ان رسالوں میں ہونا چاہئے جو وسائل نہیں رکھتے اور جن کی حوصلہ افزائی ضروری ہے۔ اس موقع پر ہم اپنی ایک تکلیف کا اظہار بھی کرنا چاہتے ہیں۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض رسالوں نے اپنے صفحات کو فلمی اداکاروں اور اداکاراؤں کی تصویروں اور فیچروں سے رنگین بنانے کی پالیسی اپنائی ہے۔ غالباً اس طرح وہ اپنی اشاعت بڑھانا چاہتے ہیں۔ ہم اس طرز عمل کو بچوں کی صحافت کے لئے انتہائی نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ بچوں کے رسائل اس لعنت سے محفوظ تھے، خدانخواستہ اگر اس کی تقلید دوسرے رسالوں نے بھی شروع کر دی تو بچوں کے رسائل کا حلیہ ہی بگڑ جائے گا۔ فلمی اداکار یقیناً ہمارے معاشرے کا حصہ ہیں لیکن اس طبقے کے لئے فلمی رسائل اور اخبارات کے فلمی ایڈیشن بہت کافی ہیں۔ بچوں کے رسائل کو ان سے دور رکھنا ہی مناسب ہے۔ ہم دعوہ اکادمی کے شعبہ بچوں کا ادب سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس سلسلے میں اپنے اثر و رسوخ کو بروئے کار لائے اور ایک غیر صحت مند روایت کا ابتدا ہی میں خاتمہ کر دیا جائے۔ ہر چند "شرارت نمبر" اس موضوع پر اظہار خیال کے لئے موزوں نہیں ہے لیکن ہم اس عمل کو بھی "صحافتی شرارت" کا حصہ سمجھتے ہیں اس لئے اپنا احتجاج ریکارڈ کرائے بغیر نہیں رہ سکتے۔

"شرارت نمبر" آنکھ مچولی کا تیرھواں موضوعاتی شمارہ ہے۔ آپ کا تعاون شامل حال رہا تو یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔ تازہ شمارے کے بارے میں اپنی رائے سے آگاہ کرنا نہ بھولئے گا!

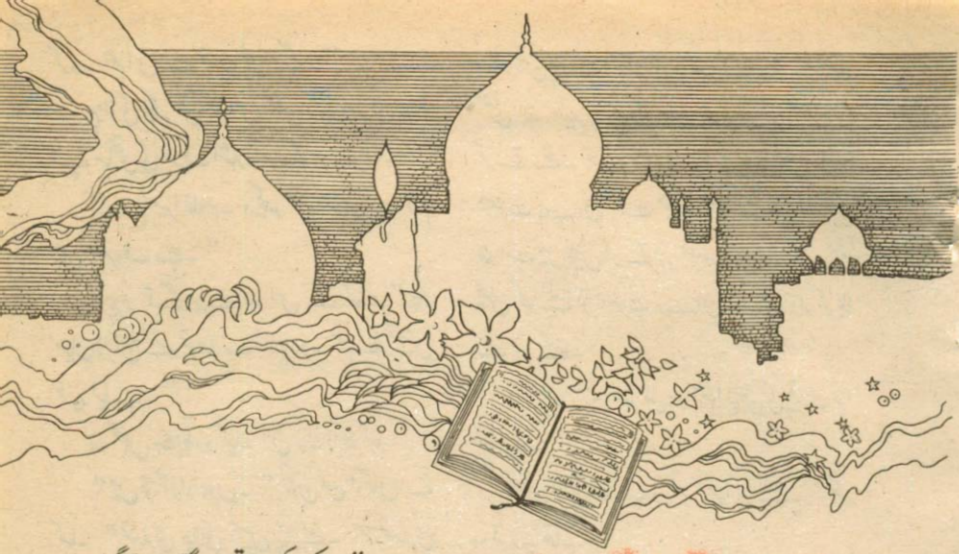

ایک خوش طبع صحابی

ممتاز حبیب، مردان

صدیوں پہلے کا واقعہ ہے۔

تین افراد کا قافلہ ایک تجارتی مہم کے سلسلے میں بصرہ جا رہا تھا۔ راستے میں ایک مقام پر پڑاؤ ڈالا گیا۔ قافلے کے امیر نے اپنے ایک ساتھی کو کھانا تیار کرنے کی ذمہ داری سونپی اور خود کسی کام سے رخصت ہوا۔ جب کھانا تیار ہو گیا تو دوسرے ساتھی کو بھوک نے ستایا۔ اس نے کھانا مانگا لیکن پہلے ساتھی نے یہ کہہ کر کھانا دینے سے انکار کر دیا کہ امیر آ جائے تو دسترخوان بچھے گا۔ دوسرے ساتھی نے اصرار کیا لیکن جب کوئی صورت نظر نہ آئی تو اس نے کہا "اچھا میں ابھی تمہارا بندوبست کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ قریبی گاؤں چلا گیا۔ اس زمانے میں غلاموں کی تجارت ہوتی تھی۔ گاؤں پہنچ کر اس شخص نے بازار میں چند افراد سے رابطہ قائم کیا اور ان سے کہا۔

"میرے پاس ایک عربی غلام ہے، صحت مند اور بہت محنتی ہے لیکن زبان دراز ہے۔ میں اس سے تنگ ہوں۔ اگر خریدنا چاہو تو سستے داموں بیچ دوں گا۔"

گاؤں کے لوگ تیار ہو گئے۔ سودا دس اونٹوں پر طے ہو گیا۔ راستے میں اس شخص نے کہا۔

"ایک بات کا خیال رکھنا کہ غلام اپنے آپ کو آزاد بتائے گا لیکن تم لوگ اس کی بات کا یقین نہ کرنا۔ وہ کئی بار یہی کہہ کر گاہکوں کو چلتا کر چکا ہے۔"

خریداروں نے کہا۔ "تم اس کی پروا ہی نہ

کرو۔ ہم اس سے نمٹ لیں گے۔"

پڑاؤ کی جگہ پہنچ کر اس شخص نے دور ہی سے اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ رہا میرا غلام۔ دیکھو کتنی محنت سے کام میں مصروف ہے۔"

خریدار آگے بڑھے اور اس سے کہا۔ "چلو میاں! آج سے تم ہمارے غلام ہو۔ ہم نے تمہیں خرید لیا ہے۔"

وہ شخص ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے لاکھ کہا۔

"میں تو آزاد ہوں۔" لیکن ان لوگوں نے کہا۔ "تمہاری چالاکی ہمیں پتا ہے۔ ہم تمہاری باتوں میں آنے والے نہیں۔" اور پھر اسے زبردستی باندھ کر اپنے ساتھ لے گئے۔ تھوڑی دیر بعد جب امیر لوٹا تو اپنے پہلے ساتھی کو نہ پا کر استفسار کیا۔ دوسرے ساتھی نے اصل قصہ بیان کیا۔ سارا ماجرا سن کر امیر کو بھی ہنسی آ گئی اور واپس گاؤں جا کر دس اونٹوں کے عوض اپنے ساتھی کو چھڑا لائے۔

یہ امیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست راست حضرت ابو بکر صدیقؓ تھے اور یہ خوش طبع صحابی حضرت نعیمان بن عمر رفاعہؓ تھے۔ جن صحابی کو بیچ دیا گیا تھا ان کا نام حضرت سویطؓ تھا۔

حضرت نعیمانؓ بہت خوش مزاج اور شوخ طبیعت کے مالک تھے۔ اکثر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی چھوٹی موٹی شرارتیں کیا کرتے تھے لیکن پورے احترام اور ادب کے ساتھ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان شوخیوں پہ مسکرا دیا کرتے تھے۔ جب کبھی مدینے میں نیا پھل آتا تو حضرت نعیمانؓ اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پھل کھا لیتے تو حضرت نعیمانؓ دکان دار کو بلا لیتے اور کہتے۔

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم! پھل کی قیمت ادا فرمائیے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا کر کہتے۔ "مگر وہ تو ہدیہ تھا۔"

حضرت نعیمانؓ کہتے۔ "حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کو میرا حال تو معلوم ہی ہے۔ پیسے میرے پاس ہوتے نہیں ہیں اور مدینے میں کوئی نیا پھل آتا ہے تو میری خواہش ہوتی ہے کہ اسے سب سے پہلے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) چکھیں اور مجھے اپنی خواہش پوری کرنے کی اور کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ اس کی ادائیگی بھی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ہی کرواؤں۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا دیتے اور پھل کی قیمت ادا فرما دیتے۔

حضرت نعیمانؓ بنو نجار میں سے تھے۔ آپؓ نے حضرت معاویہؓ کے عہد میں رحلت کی۔

(بحوالہ مسلم شخصیات کا انسائیکلو پیڈیا از ایس ایم ناز)

..... ○ ..... ○ .....

میری پہلی اور آخری شرارت

مرزا ادیب

اپنے لڑکپن کے زمانے میں دوسرے لڑکوں کی طرح چھوٹی موٹی شرارتیں میں نے بھی کی تھیں مگر ساری کی ساری گھر کے اندر کی تھیں باہر کبھی کوئی شرارت کرنے کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ اپنے ساتھیوں کو گھر کے باہر شرارتیں کرتے ہوئے دیکھتا رہتا تھا لیکن خود شرارت کرنا تو دور کی بات ہے کہ شرارت میں حصّہ بھی نہیں لیتا تھا..... مگر ایک روز میں نے شرارت کر ہی ڈالی اور آج اسی شرارت کا حال لکھنا چاہتا ہوں۔

یہ اسوقت کی بات ہے جب میں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا۔ ہماری کلاس کے ماسٹر صاحب اسکول چھوڑ کر کہیں چلے گئے۔ ان کی جگہ جو صاحب آئے ان کا نام اسمٰعیل تھا۔ بڑے لمبے قد کے آدمی تھے اور تھے بھی دیہاتی۔ چال ایسی چلتے تھے کہ لم ڈھینگ معلوم ہوتے تھے۔ ہم نے ان کا نام ہی لم ڈھینگ رکھ دیا۔

یہ نام سارے اسکول میں مشہور ہو گیا۔ جب وہ کلاس میں نہیں ہوتے تھے تو لڑکے ان کا ذکر لم ڈھینگ کہہ کر ہی کرتے تھے۔ وہ آتے تھے تو سارے لڑکے ایک دم مؤدب ہو جاتے تھے۔

ایک روز اسکول میں چھٹی تھی۔ مجھے چھٹی کا خیال نہ رہا اور اسکول جا پہنچا۔ وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔ خاکروب کمروں میں جھاڑو دے رہا تھا۔ میں اپنے کمرے کے دروازے کو کھلا پا کر اندر چلا گیا۔ باہر نکلنے ہی والا تھا کہ میری نظر بلیک بورڈ پر پڑی اور ساتھ ہی چاک بھی نظر آگیا جو بورڈ کے پاس میز کے کنارے پر پڑا تھا۔

میں نے بتایا ہے ناکہ میں نے گھر سے باہر کبھی شرارت نہیں کی تھی مگر اس روز بے اختیار جی چاہا کہ کوئی شرارت کرلی جائے ..... چنانچہ میں بورڈ کے قریب گیا چاک اٹھایا اور بورڈ پر بڑے بڑے حرفوں میں لکھ دیا "لم ڈھینگ"۔

یہ لفظ لکھ کر میں خود ہنس پڑھا اور چاک وہی رکھ کر دروازے سے باہر نکل گیا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ بھلا کون مجھے دیکھ سکتا تھا۔

گھر آیا تو ابا جی کے پوچھنے پر بتا دیا "آج چھٹی ہے، مجھے یاد نہیں رہا تھا۔"

"کوئی بات تمہیں یاد ہی نہیں رہتی۔" انہوں نے غصے سے کہا ..... اتنے میں امی آگئیں اور انہوں نے مجھے سبزی لانے کے لئے بھیج دیا۔

میں بالکل بے فکر تھا کیونکہ کسی نے مجھے اسکول میں دیکھا ہی نہیں تھا مگر میں اس بات کا انتظار کر رہا تھا کہ دیکھیں ہوتا کیا ہے.....!! دوسرے روز میں اسکول میں ذرا دیر سے پہنچا۔ کمرے میں داخل ہوا تو ایک عجیب منظر سامنے آیا۔ سارے لڑکے چُپ چاپ کھڑے تھے اور ماسٹر صاحب انہیں غصے بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

"میں پوچھتا ہوں یہ بورڈ پر کس نے لکھا ہے؟ ..... بولو ..... جواب دو.....!!"

"ہم کیا بتائیں جناب!" ایک لڑکے سعید احمد نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ کلاس کا مانیٹر بھی تھا۔

"تم ہی میں وہ بدتمیز لڑکا ہے جس نے یہ سخت بے ہودہ حرکت کی ہے۔ بولو کون ہے وہ؟"

اب کے سعید احمد بھی چپ رہا۔

ماسٹر صاحب سب کو غضب ناک نظروں سے دیکھتے رہے۔ اور کچھ بولے نہیں۔ پھر وہ کمرے سے نکل گئے۔ لڑکے بیٹھ گئے۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ ماسٹر صاحب کی "چھیڑ" کس نے لکھی ہے۔ پھر سب یہ سوچنے لگے کہ ماسٹر صاحب گئے کہاں ہیں اور کیا کرنے گئے ہیں؟ عام خیال یہ تھا کہ وہ ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس شکایت کرنے گئے ہیں اور ابھی ہیڈ ماسٹر صاحب کلاس میں آجائیں گے۔ آدھ گھنٹہ گزر گیا اور ماسٹر صاحب آگئے مگر وہ تنہا تھے۔ آتے ہی بولے۔

"سعید! بورڈ صاف کر دو۔"

سعید نے ڈسٹر سے بورڈ صاف کر دیا۔ ماسٹر صاحب اس طرح کام کرنے لگے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ انہوں نے حساب کا نیا قاعدہ سمجھایا۔ اُردو

کتاب میں سے نیا سبق پڑھایا۔ اتنے میں آدھی چھٹی ہوگئی۔

اس روز باغ میں سب لڑکے چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر بیٹھ گئے اور جو کچھ ہوا تھا اس پر اپنی اپنی رائے کا اظہار کرنے لگے۔ ایک ٹولی میں، میں بھی بیٹھا تھا مگر خاموش تھا۔

آدھی چھٹی ختم ہوئی تو ماسٹر صاحب کام کرواتے رہے اور جب چھٹی کی گھنٹی بجی تو انہوں نے کہا سارے لڑکے اپنی اُردو کی کاپیاں میز پر رکھ کر جائیں۔ یہ بھی کوئی ایسی بات نہیں تھی جو انوکھی سمجھی جاتی۔ ماسٹر صاحب کبھی کبھی حساب یا اُردو کی کاپیاں دیکھنے کے لئے گھر لے جاتے تھے ہم نے کاپیاں میز پر رکھ دی اور خوش خوش اپنے گھروں کو روانہ ہوگئے۔

اگلے روز بھی میں ذرا دیر سے اسکول پہنچا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کمرے کے باہر میری جماعت کے لڑکے باغ میں بیٹھے ہیں۔ میں آگے بڑھا تو سعید احمد نے کہا۔

"ریاض! اندر جاؤ۔ ماسٹر صاحب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

"کیوں؟" میں نے سوال کیا۔

"ہمیں کیا پتہ؟" سعید احمد نے جواب دیا۔

میں کچھ ڈر گیا اندر تو جانا ہی تھا۔ گیا دیکھا ماسٹر صاحب کرسی پر بیٹھے ہیں۔ ان کے آگے میز پر کاپیوں کا ایک ڈھیر ایک طرف پڑا ہے اور تین کاپیاں کھلی پڑی ہیں۔ اور میز کے آگے احمد اور ماجد کھڑے ہیں۔

"آگئے ریاض؟" ماسٹر صاحب مجھے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر بولے۔

"جی جناب!"

"ان کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔" ماسٹر صاحب نے مجھے احمد اور ماجد کے ساتھ کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ جب میں کھڑا ہو گیا تو بولے۔

"تم تین ہو جن کی کاپیاں دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا ہے کہ تمہیں میں سے ایک نے وہ بے ہودہ حرکت کی ہے۔ شرارت ایک نے کی ہے۔ میں تینوں کی کھال اُدھیڑنا نہیں چاہتا۔ جس نے بورڈ پر لکھا ہے وہ بتادے۔"

تینوں خاموش رہے۔

"احمد تم نے؟"

"جی نہیں — خدا کی قسم نہیں!"

"ماجد تم نے؟"

"بالکل نہیں جناب!"

"ریاض! تم بتاؤ؟"

نہ جانے مجھے کیا ہوا کہ میرے منہ سے کوئی لفظ نکل ہی نہ سکا۔

"شاباش بتا دو۔"

"ریاض!"

"جی!" میں بہ مشکل بولا۔

"کیا ہوا! صاف صاف بتا دو ورنہ وہ حال کروں گا کہ زندگی بھر بھول نہیں سکو گے!"

"میں جی....."

اور میں نے سارا واقعہ بتا دیا۔

ماسٹر صاحب خاموشی سے سُنتے رہے۔ جب میں بتا چکا تو بولے۔

"ماجد! سب کو بلا لو۔ اور تم تینوں بھی اپنی جگہوں پر جا کر بیٹھ جاؤ۔"

یہ سب کچھ ہو گیا۔

"سب آ گئے ہیں۔" ماسٹر صاحب نے پوچھا۔

"جی ہاں!" میرے سوا سب بولے۔

"ریاض! ادھر آؤ — جو کچھ تم نے مجھے بتایا ہے سب کو بتا دو۔"

میں کیا کرتا بتا دیا۔

سب لڑکے حیرت سے مجھے دیکھنے لگے کیونکہ میں نے کبھی کوئی معمولی سے شرارت بھی نہیں کی تھی۔

"ریاض! بتاؤ کیا تم اس بے ہودہ حرکت پر پریشان ہو۔"

"جی!" اور میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

"جاؤ تمہیں معاف کیا جاتا ہے۔" ماسٹر صاحب کے لہجے میں معافی کا اعلان تھا۔ میں معافی ملنے کے بعد جب اپنی سیٹ کی طرف جا رہا تھا تو بے حد شرمندہ تھا اور میرے قدم کسی شکست خوردہ انسان — کی طرح اُٹھ رہے تھے۔

یہ تھی میری گھر سے باہر..... پہلی اور آخری شرارت.....!!

جو تھی کل بھی پسند
وہ ہے اب بھی پسند
میری مٹھی میں بند
ہے کیا... بتادو ناں
ناز
پان مصالحہ
ASHRAF PRODUCTS
P.O. Box No. 3546 KARACHI. CABLE: TWO-IN-ONE
Repcom

LASERDOT

جنید شریر

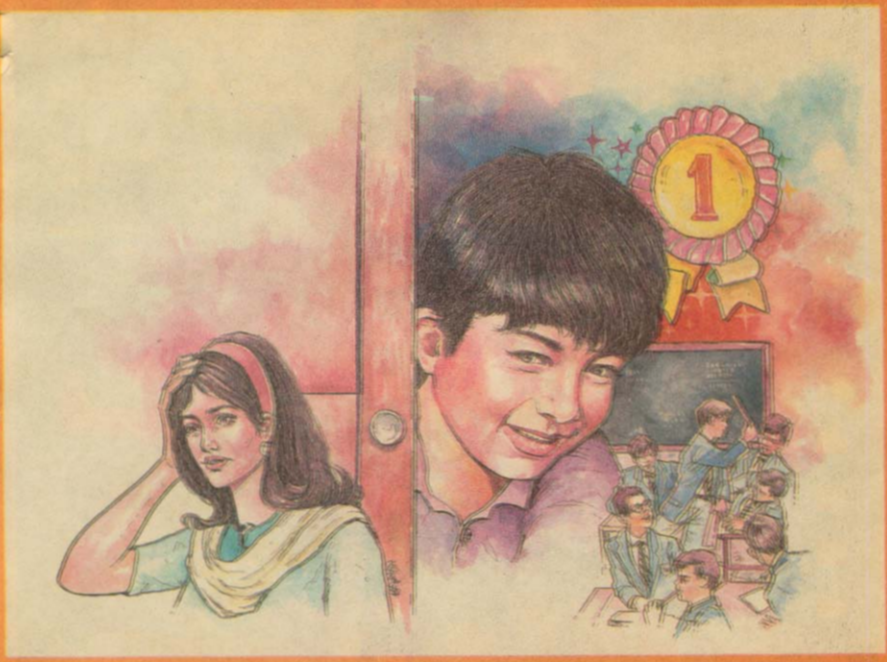

"ارے! یہ کون گرا؟" "ضرور یہ جنید شریر نے ہی ٹانگ اڑائی ہوگی!" "مس! میرے جومیٹری بکس میں مینڈک پڑا ہے۔" "ضرور یہ جنید شریر کی کارستانی ہوگی!! ٹھہرو میں ابھی اس کی خبر لیتی ہوں۔" مس شبنم کان سے پکڑ کر جنید کو اٹھاتیں اور سب کے سامنے مرغا بنا دیتیں۔ جنید مرغا بن کر بھی باز نہ آتا بلکہ آہستہ آہستہ "ککڑوں کوں" "ککڑوں کوں" کی صدا اٹھانے لگتا اور پوری کلاس ہنسنے لگتی جس پر مس شبنم سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتیں کہ "یہ تو لاعلاج ہے۔"

یوں تو اس کا نام "جنید کبیر" تھا لیکن اپنی شراتوں کی وجہ سے وہ "جنید شریر" کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ وہ کونسا بچہ تھا جو اس کی شرارتوں سے محفوظ تھا۔ کبھی کسی لڑکے کے پیچھے "میں پاگل ہوں مجھے مارو" کا اسٹیکر لگا دیتا، کبھی اسکول کے باغ سے پھل توڑنا، کبھی کسی کے نیچے سے

ابّو ایسے دفتر جاتے ہیں!

لرسی گھسیٹ لینا، تو کبھی مس کی دراز میں مری ہوئی چھپکلی رکھ دینا اور پھر آخری سیٹ پر بیٹھ کر خوب ہنسنا یہ سب اسکی شرارتیں تھیں۔ مس شبنم تو اس سے بے حد تنگ تھیں۔ ہر بچہ جنید کی شکایت کرتا۔ وہ اسے کبھی پیار سے کبھی ڈانٹ سے سمجھاتیں لیکن وہ تو معصوم صورت بنائے یوں کھڑا رہتا جیسے اسے کچھ پتہ ہی نہیں۔ بالکل ہی "بھولا" بن جاتا کہ کوئی یقین ہی نہ کرے کہ اسے کوئی شرارت آتی بھی ہے۔ لیکن شرارت اس کی آنکھوں سے ٹپکتی تھی۔ ہر وقت وہ نت نئے شرارتی منصوبوں میں کھویا رہتا۔ ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔ اس نے مس شبنم کے راستے میں کیلے کا چھلکا بچھا دیا۔ مس شبنم جو پھسلیں تو سارے بچے ہنسنے لگے۔ وہ بیچاری بھی کھسیانی ہو کر سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ مس شبنم نے تو میڈم سے بھی کہہ دیا تھا "یا تو مجھے کوئی اور کلاس دیں یا جنید کو کسی اور کلاس میں بھیجیں۔" ایک دن جب میڈم راؤنڈ پر نکلیں تو دیکھا کہ جنید میاں ہاتھ اٹھائے سیٹ پر کھڑے ہیں۔ میڈم نے مس شبنم سے پوچھا کہ "کیا وجہ ہے" تو جنید بول پڑا "میڈم! مس سے پوچھ لیں میں نے کوئی شرارت بھی نہیں کی۔ میں تو سو رہا تھا۔" جس پر میڈم سمیت پوری کلاس ہنس پڑی۔

ایک دن اسٹاف میٹنگ میں طے پایا کہ اسکول میں تقریری مقابلہ کرایا جائے۔ میڈم نے ٹیچرز کو بتایا کہ کل کے تقریری مقابلوں کے بعد ہم "بیسٹ اسٹوڈنٹ ایوارڈ" اس بچے کو دیں گے جو ہمیشہ تمیزدار اور سنجیدہ رہا ہو اور جس نے کبھی کسی مس کو تنگ نہ کیا ہو۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ مس غزالہ بولیں۔ "میڈم! پورے سال کا جائزہ لینا تو مشکل ہے۔ ایسا کیوں نہ کریں کہ کل کے فنکشن میں جو بچہ سب سے تمیزدار رہے گا اور کوئی شرارت نہیں کرے گا اسے یہ انعام دے دیا جائے۔" سب مسیں اس کی تائید کرنے لگیں۔ مس شبنم بولیں "لیکن بچوں کو اس کی خبر نہیں ہونی چاہئے۔ شکر ہے! جنید تو یہ انعام حاصل کر ہی نہیں سکتا۔ اس کی تو بوٹی بوٹی میں شرارت بسی

یہ ہے تیرنے کا صحیح طریقہ۔!

ہوئی ہے۔" مس شبنم کی یہ بات سن کر سب مسیں مسکرانے لگیں۔

اگلے دن فنکشن میں سب بچے زور و شور سے حصہ لے رہے تھے۔ کوئی تقریروں میں اپنے جوہر دکھا رہا تھا اور کوئی ملی نغموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا۔ سامعین بچے بھی دل کھول کر ان کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ تمام مسیں خاص طور پر بچوں کی نگرانی کر رہی تھیں تاکہ "بیسٹ اسٹوڈنٹ" چنا جاسکے۔ تقریباً سب ہی بچے خوش گپیوں، سرگوشیوں اور شرارتوں میں مصروف تھے۔ سنجیدہ بچے بھی آخر کب تک چپ بیٹھ سکتے تھے، وہ بھی کبھی کبھار کسی سے بات چیت کر ہی لیتے۔ لیکن! ایک جنید تھا!! شروع سے آخر تک فنکشن کے دوران پہلی رو میں انتہائی سنجیدہ بیٹھا رہا۔ نہ کسی سے کوئی بات کی نہ کوئی شرارت۔ اس کے سب ساتھی بھی حیران تھے اور مس شبنم تو بہت زیادہ حیران تھیں کہ آج کایا کس طرح پلٹ گئی۔ وہ بڑبڑائیں۔ "کتنا شریف بن کر بیٹھا ہوا ہے۔"

اتنے میں تقریری مقابلے کے ختم ہونے کا اعلان ہوا اور ساتھ ہی یہ اعلان بھی ہوا کہ پانچ منٹ بعد مقابلوں کے انعامات دیئے جائیں گے اور "بیسٹ اسٹوڈنٹ" کا اعلان بھی ہوگا۔

پانچ منٹ بعد ہی "بیسٹ اسٹوڈنٹ" کا اعلان ہوا "آج کے سنجیدہ ترین بچے ہیں! جنید کبیر۔" سب بچے حیران ہو ہو کر تالیاں بجا رہے تھے۔ ادھر اسٹیج پر یہ اعلان ہو رہا تھا، اور ادھر "جنید شریر" آخری قطار میں بیٹھے اپنے آگے بیٹھی، ایک لڑکی کی چٹیا کرسی سے باندھنے میں مصروف تھے ..... "بیسٹ اسٹوڈنٹ" کا انعام لینے کے لئے انہیں کچھ دیر کتنی مشکل سے اپنے آپ کو شرارت سے باز رکھنا پڑا تھا۔ اور کیوں نہ رکھتے کل میڈم کے دروازے کے پیچھے سے چھپ کر انہوں نے اسٹاف میٹنگ کی ساری کارروائی جو سن لی تھی !!

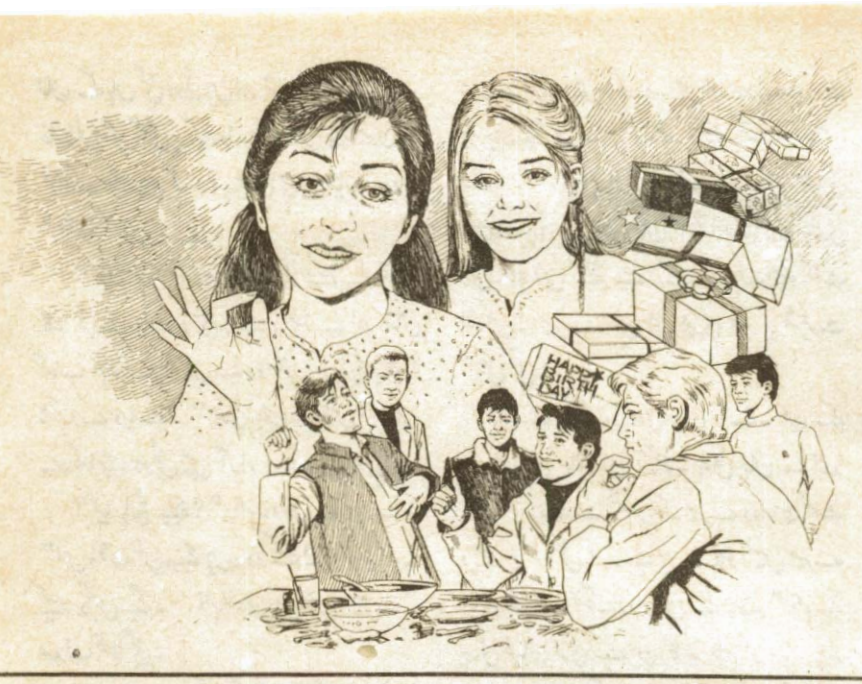

پیارے بھائی جان

سیدہ فاکہہ عرفان

"سنو فاکہہ اور صدف!" آج بھائی جان نے خلافِ معمول بڑے پیار سے پکارا۔ ہم لوگ حیران ہوئے اور شرافت سے ان کی بات سننے کے لئے تیار ہو گئے۔ "تمہیں پتہ ہے ناکہ آج میری سالگرہ ہے۔" بھائی جان نے پھر نرمی سے کہا۔ "جی ہاں مگر تحفہ تو ہم نے پہلے ہی خرید لیا ہے" صدف نے جلدی سے جواب دیا کیونکہ وہ ہر سال دھونس دے کر تحفہ وصول کرتے تھے۔ "پیاری بہنو! میرے دوستوں کا اصرار ہے کہ میں انہیں اس خوشی میں دعوت دوں۔" آج تو بھائی جان کی خوش اخلاقی عروج پر تھی۔ اس لئے مستقل پیار سے گفتگو فرما رہے تھے۔ "کس خوشی میں دعوت؟" میں نے پوچھا "بھئی میری سالگرہ کی خوشی میں۔" اب وہ قدرے جھنجھلائے۔

"تو دے دیں ناکس نے روکا ہے۔" میں نے یوں فراخدلی سے کہا جیسے وہ مجھ سے اجازت لے رہے ہوں۔ افوہ بے وقوف لڑکیو! یہ بات نہیں ہے اصل میں..... تمہیں پتہ ہے کہ امی صبح سے نانی

اماں کے ہاں گئی ہوئی ہیں اور شام تک لوٹیں گی۔ خانساماں بھی چھٹی پر گیا ہوا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ مجھے چند کھانے پینے کی چیزیں تیار کر دو۔"

"مثلاً!" میں نے پوچھا۔

"کیک اور سموسے تو میں بازار سے لے آؤں گا۔ فروٹ چاٹ دہی بڑے، پکوڑے اور شامی کباب تم لوگ بناؤ میں نے دوستوں کو پانچ بجے کا ٹائم دے دیا ہے۔" بھائی جان نے اس اطمینان سے کہا جیسے ہوٹل میں آرڈر دے رہے ہوں۔

"کیا پانچ بجے؟" ہم دونوں چلاّ پڑے۔

"اس وقت تین بجے ہیں، دو گھنٹے میں ہم یہ سب کیسے بنائیں گے۔ ہم انسان ہیں جن نہیں۔" صدف تلملا گئی۔

"سب یہ سب کچھ تم لوگوں کو کرنا ہے۔" اب بھائی جان کو یاد آگیا کہ وہ بڑے بھائی ہیں اس لئے آرڈر دے کر چلتے بنے۔ اور ہم برے برے منہ بنا کے کام میں جُت گئے۔ سوا پانچ تک ہم نے میز سجا دی۔ بھائی جان کے دوست آچکے تھے اور اب کھانے پینے کی چیزوں پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ کافی دیر بعد وہ کھاپی کر فارغ ہوئے جونہی میں اور صدف ڈائننگ روم میں داخل ہوئے میری نظر ڈشوں پر پڑی جو اس طرح صاف تھیں جیسے کبھی ان میں کچھ تھا ہی نہیں۔ ہمارا غصّے کے مارے برا حال ہو گیا اسی وقت بھائی جان آئے اور کہنے لگے "ارے بھئی صدف! یہ میرے گفٹ اٹھا کر میرے کمرے میں رکھ دو۔ میں اور میرے دوست باہر جا رہے ہیں۔ آدھے گھنٹے تک آجائیں گے۔" "جی اچھا!" صدف نے پوری سنجیدگی سے جواب دیا۔ بھائی جان کا ماتھا ٹھنکا مگر وہ جلدی میں تھے اس لئے چلے گئے۔ "صدف! چلو گفٹ اٹھائیں۔" میرے ذہن میں فوری طور پر شرارت آچکی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد بھائی جان آئے۔ ان کے دوست بھی ساتھ ہی آگئے۔ بھائی جان نے اندر آکر حسبِ عادت حکم دیا کہ میرے دوست گفٹ دیکھنے کی فرمائش کر رہے ہیں۔ چلو انہیں میرے ساتھ اٹھا کر ڈرائنگ روم میں لے چلو۔" ہم نے پوری فرمانبرداری سے ان کا یہ کام کر دیا۔ چند منٹ بعد ہی ڈرائنگ روم سے حیرت بھری چیخیں سنائی دیں۔ ہم نے وجہ پوچھی۔ بھائی جان خاموش رہے۔ البتہ ان کے دوست آصف بھائی نے جواب دیا۔ "ہم سب دوستوں نے ایک ہی دکان سے تحفے خریدے اور ایک دوسرے کو دکھائے بغیر دکان سے ہی پیک کروا کر لے آئے اب جو گفٹ پیک کھولے تو یہ ڈبے خالی ہیں۔" "کیا؟" ہم نے پھر پور حیرت کا مظاہرہ کیا۔ بھائی جان نے مشکوک سی نظروں سے ہمیں دیکھا۔ مگر ہم معصوم بن گئے۔ وہ اندر کی طرف چل پڑے۔ ہم بھی پیچھے پیچھے تھے۔ انہوں نے کہا "دیکھو میری پیاری بہنو! اگر تم اس سلسلے میں کچھ جانتی ہو تو بتا دو۔ میں

تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔" "ہمیں کیا پتہ؟" میں نے جلدی سے جواب دیا۔ "لگتا ہے آپ کے دوستوں نے آپ کو بے وقوف بنایا ہے۔ آخر ہمارے گفٹ بھی تو ساتھ ہی رکھے تھے۔ ان میں تو تحفے موجود ہیں۔" یہ بات بھائی جان کے دل کو لگی۔ وہ اپنے پیسوں کے نقصان پر رنجیدہ ہو گئے اور مرے مرے قدموں سے واپس چلے گئے۔ ہم لوگ بھی چپکے چپکے پیچھے گئے۔ ان کے دوست شرمندہ تھے۔ اور پھر ایک ایک کر کے واپس چلے گئے۔ بھائی جان بھی چپ چپ تھے۔ اور پھر وہ بھی باہر نکل گئے۔ ایک گھنٹے بعد واپس آئے جب تحفوں پر نظر پڑی تو غصہ آگیا۔ اور مجھے آواز دی۔ میں نے پوری تابعداری کا مظاہرہ کیا اور بھاگ کر ان کے پاس گئی۔ یہ سب ڈبے کوڑے میں پھینک دو۔"

"بھائی جان کیا واقعی پھینک دوں؟" میں نے شرارت سے پوچھا۔

"ہاں کیا میں ان کا اچار ڈالوں گا مگر میں اکیلی ان کو کیسے اٹھاؤں؟" میں نے عذر پیش کیا۔

"ہٹو کام چور! میں خود ہی پھینک آتا ہوں۔" انہوں نے ایک جھٹکے سے ڈبے اٹھائے۔ وہ انہیں قدرے بھاری لگے۔ مگر وہ بے دلی سے آگے بڑھے۔ ایک دم انہیں محسوس ہوا کہ ڈبے خالی نہیں ہیں۔ انہوں نے کھول کر دیکھا تو سارے تحفے موجود تھے۔ انہوں نے ہمیں ڈھونڈا۔ اس وقت تک امی واپس آچکی تھیں اور ہم ان کی پناہ

لے چکے تھے۔ بھائی جان ہمیں ڈھونڈتے ہوئے وہاں آپہنچے۔ مگر امی کو دیکھ کر فوری طور پر کچھ نہ کر سکے مگر امی سے ہماری شکایت جڑ دی۔ ہم امی کو پہلے ہی اپنی ساری شرارت سنا چکے تھے کہ کس طرح ان کی غیر موجودگی میں ہم نے تحفے نکال کر خالی ڈبے صفائی سے دوبارہ پیک کر دیئے تھے۔ اور دوستوں کے جانے کے بعد سارے تحفے واپس رکھ دیئے۔ چونکہ امی سب کچھ جانتی تھیں اس لئے بھائی جان کے سامنے ہمیں ہلکا سا ڈانٹا۔ بھائی جان کو تسلی نہ ہوئی کیونکہ ابو بھی ان کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے اور ہمیں کچھ نہیں کہہ رہے تھے۔ اس لئے انہوں نے غصے سے آنکھیں نکال کر پوچھا کہ یہ تم لوگوں نے کیا کیا؟ ہم نے یک زبان ہو کر کہا "شرارت!" اور بھائی جان بے چارے دانت پیسنے کے سوا کچھ نہ کر سکے۔

میاں جی کی جوتی

س۔م دانش

بچپن کی حسین یادیں زندگی کے ہر دور میں یاد رہتی ہیں، بھلانا بھی چاہو تو نہیں بھولتیں۔ دل خود بخود گنگنانے لگتا ہے، بچپن کے دن بھی کیا دن تھے، اڑتے پھرتے تتلی بن کے کبھی کوئی شرارت، کبھی کوئی حرکت ..... کھانے، کھیلنے کے دن ..... گھر میں ابو طرح طرح کی موسم کی چیزیں لے کر آتے، امی الگ نئے نئے پکوان پکا کر کھلاتیں، مگر برا ہو اس شرارت کا کہ جو مزہ باغوں میں درختوں پر چڑھ کر پھل توڑ کر کھانے میں آتا ہے، سکون، ادب اور آرام سے گھر میں بیٹھ کر کھانے میں کہاں ..... ذرا سی آہٹ ہوئی تو بندر کی طرح کود کر بھاگے کچھ دور جانے کے بعد پیچھے مڑ کر دیکھا ..... تو کوئی بھی نہ تھا تو اپنی بزدلی پر خود ہی خوب ہنستے بھی۔ کبھی کبھی گرمی کی دوپہر میں باہر نکل جاتے۔ خالی پرس میں ردّی کاغذ بھر کر اسے بیچ سڑک پر ڈال دیتے اور ایسی جگہ چھپ کر بیٹھ جاتے جہاں سے ہمیں تو سب کچھ نظر آسکے، مگر ہم کسی کو نظر نہ آئیں، نیک، اور اچھے لڑکے تو

پرس کو سڑک پر پڑا ہوا دیکھ کر چپ چاپ گزر جاتے۔ کوئی لالچی لڑکا اسے اٹھالیتا تو ہم اپنی خفیہ جگہ سے نکل کر فوراً سامنے آجاتے اور اس لڑکے سے کہتے، بھائی یہ پرس ہمارا ہے گر گیا تھا ہمیں دے دو، اگر وہ لڑکا خاموشی سے ہمیں پرس واپس کر دیتا تو ہم اسے نیک، ایماندار اور شریف گردانتے اور اگر وہ کہتا کہ نہیں یہ پرس مجھے سڑک پر پڑا ہوا ملا ہے اس کا مالک میں ہوں یا یہ کہتا کہ نہیں یہ پرس میرا ہے اور واپس کرنے پر آمادہ نہ ہوتا تو تکرار کے ہی دوران ایک، ایک کر کے دوسرے ساتھی اس کے گرد آکر جمع ہو جاتے، پھر فیصلہ ہوتا کہ اگر پرس تمہارا ہے تو بتاؤ اس کے اندر کیا کیا ہے، کیا نشانی ہے۔ پھر سب کے سامنے وہ پرس کھولا جاتا۔ اس میں سے صرف ردّی کاغذ ہی نکلتے کوئی خاص نشانی سامنے نہ آتی تو پھر اس لڑکے کا مذاق اڑایا جاتا۔ اسے جھوٹا، اور لالچی کہا جاتا اسی طرح کبھی کبھی یہ شرارت بھی کرتے کہ کسی گھڑے میں پانی بھر کر اس پر سفید کپڑا باندھ کر منہ بند کر دیتے کہ ظاہر ہو کہ اس میں چھاچھ یعنی دودھ سے مکھن نکالنے کے بعد جو دودھ بچتا ہے وہ ہے۔ پھر کسی مزدور سے کہتے کہ بھائی اسے فلاں جگہ لے جانا ہے۔ ایک آنہ، یا دو آنے اجرت طے ہوتی، گھڑا اس کے سر پر رکھوا دیا جاتا اور ایک لڑکا اس کے آگے، آگے چلنا شروع کر دیتا...... کسی خاص موڑ پر پہلے سے تیار ایک لڑکا غلیل سے نشانہ لے کر گھڑے پر غُلّا مارتا، گھڑا ٹوٹ جاتا اور وہ مزدور پانی میں نہا جاتا۔ ہم لوگ ہنستے ہوئے ادھر، ادھر بھاگ کر چھپ جاتے...... مگر ایک شرارت ہماری ایسی بھی ہے جس میں ہم خود ہی نشانہ بن گئے دوسرے لفظوں میں آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہم اپنے ہی تیر کا آپ نشانہ بن گئے اور پھر ہم نے کبھی شرارت کرنے سے توبہ کرلی۔ ہوا یوں کہ ان دنوں پنجاب سے ہماری پھوپی جان اپنے چھوٹے بڑے، درمیانے ہر سائز کے بچوں کے ساتھ بھائی سے ملنے کراچی آئی ہوئی تھیں۔ گھر میں خوب رونق تھی۔ گرمی کی طویل دوپہر میں ہمارے بڑے کمرے میں بند ہو کر روم کولر کی ٹھنڈی ٹھنڈی خوشبودار ہوا میں نیند کے مزے لیتے۔ اور ہم بچے شرارت میں کسی کے چہرے پر سیاہی لگا دیتے۔ رنگ وغیرہ سے نشان بنا دیتے۔ اور جب وہ سو کر اٹھتے تو انہیں دیکھ کر خوب ہنستے قہقہے لگاتے، ان بڑوں کو بھی جب تک خود اپنی حالت کا علم نہیں ہوتا ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسا کرتے، مگر انہوں نے کبھی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا، بلکہ بڑی خاموشی کے ساتھ اسی شرارت میں ایک نئے آئیڈیئے کا اضافہ کر کے میاں کی جوتی میاں جی کے سر والے محاورے کو ہم بچوں کو سمجھانے کی اسکیم بنا ڈالی۔ اس دن امی ابو، پھوپی جان، سب دوپہر کے کھانے پر خالہ جان کے یہاں مدعو تھے، گھر پہ ہم سارے بچے یعنی میں، عارف، نجمہ، عباب، اختر اور حمید بھائی جان اور

باجی کی نگرانی میں گھر پہ تھے، دوپہر کا کھانا کھلا کر باجی نے ہم سب ہم عمر بچوں کو کمرے میں دھکیل کر سوجانے کی تاکید کی۔ بھائی جان نے بھی بڑے سخت الفاظ میں ہمیں لیکچر دیا ..... خبر دار جو کسی کے بھی ہنسنے، بات کرنے کی آواز سنائی دی، پانچ بجے سے پہلے کوئی بچہ کمرے سے باہر نہیں نکلے گا ..... اور یوں مرتا، کیا نہ کرتا کے مصداق ہم کب تک خاموش رہتے، ہمیں نیند نے دبوچ لیا۔ اور پھر ہم سو گئے۔

شام کو ہم بیدار ہوئے، کمرہ کھلا ہوا تھا، باہر نکلے تو بھائی جان کیمرہ ہاتھ میں لئے باجی کا فوٹو کھینچنے کے لئے سائیڈ پوز بنوا رہے تھے۔ ہمیں باہر آتا دیکھ کر بڑی سنجیدگی سے بولے، "ارے ریحانہ! تمہارا فوٹو تو کھنچتا ہی رہے گا..... اپنے ان شریر ننھے منھے بھائی بہنوں کے کچھ فوٹو کھینچ لوں ..... اس دوران میری نظر نجمہ پر پڑی تو اس کے چہرے پر داڑھی مونچھیں بنی دیکھ کر بے ساختہ ہنسی آگئی۔ نجمہ نے ہنسی کی آواز سن کر میری طرف دیکھا تو میری سرخ ٹماٹر جیسی ناک دیکھ کر ہنسنے لگی۔ الغرض ذرا سی ہی دیر میں ہم ایک، دوسرے کا چہرہ دیکھ کر ہنس رہے تھے، ہمیں خود اپنے چہرے کی خبر نہ تھی کہ اس کی درگت کیا بنی ہوئی ہے۔ اور بھائی جان کے کیمرے کی فلش چمک چمک کر ہمارے مختلف پوز نیگیٹو پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کر رہی تھی۔ اور ہم بڑی خوشی خوشی بھائی جان کے کہنے کے مطابق اپنی تصویریں کھنچوا رہے تھے۔ مگر جلد ہی یہ راز بھی کھل گیا کہ اگر میں نجمہ کے چہرے پر داڑھی، مونچھیں بنی ہوئی دیکھ کر ہنس رہا تھا تو نجمہ کے ہنسنے کی وجہ میری لال ٹماٹر جیسی ناک تھی۔ اختر اگر عباب کے چہرے پہ بنے ہوئے نقش نگار دیکھ کر لوٹن کبوتر بن گیا تھا تو عباب اختر کے چہرے پر جنگلیوں کا سا رنگ روغن دیکھ کر ہنسی سے بے حال ہوئی جا رہی تھی۔ مگر جب ہمیں اصل صورتِ حال کا علم ہوا تو سب غسل خانے کی طرف بھاگے۔ میں اور میری پھوپی زاد بہن عباب جو دونوں ہی تقریباً ہم عمر تھے اس مذاق کو برداشت نہ کر سکے اور رونے لگے ..... مگر وہاں کون تھا جو ہمارے رونے کی پروا کرتا۔ بلکہ ہمارے رونے پر باجی اور بھائی جان کی ہنسی میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ حمید، نجمہ اور اختر جو ہم سے عمر میں بڑے بچے تھے انہوں نے تو جیسے تیسے اپنے چہرے صاف کر لئے۔ مگر ہم دونوں یعنی میں اور عباب دونوں روتے رہے ..... کبھی کبھی خود اپنی ہی رونے کی آواز بھی ہمیں بڑی عجیب سی لگتی اور لمحے بھر کو چونک کر ہمارے رونے کو بریک جاتے ..... مگر پھر رونے لگتے۔ باجی بڑے شاعرانہ انداز میں ہاتھ بڑھا بڑھا کر داد دے رہی تھیں، واہ، واہ سبحان اللہ..... کیا کلاسیکل انداز ہے رونے کا..... ونس مور..... مکرر مکرر اور ہمارا رونا ختم ہونے کے بجائے اور تیز ہو جاتا، بھائی جان بھی جلتی پر برابر تیل چھڑک رہے تھے۔ باجی ذرا دم لینے کو خاموش اختیار کرتیں تو وہ شروع ہو جاتے .....

بھئی واہ کیا بانسری سننے کو ملی ہے آج ..... مجھے پتہ ہی نہیں تھا کہ اتنا اچھا بانسری نواز فنکار ہمارے اپنی ہی گھر میں موجود ہے۔

جب باجی نے محسوس کیا کہ اب امی ابو پھوپی خالہ جان کے گھر سے واپس پہنچنے والے ہوں گے تو انہوں نے باری باری ہم دونوں کا منہ دھلوایا۔ لیکن طوطے کی چونچ کی طرح ہماری ناک پر جو گاڑھا رنگ پوتا گیا تھا وہ کئی دنوں تک اپنی شوخ رنگت کے چٹخارے لیتا رہا۔ کیونکہ اسے دیکھ کر بڑے ہنستے تھے اور مجھے چڑ کر رونا آجاتا تھا اور جیسے ہی ہم منہ بسورنا شروع کرتے ہر طرف سے ایک ہی آواز سنائی دینا شروع ہو جاتی ..... باادب باملاحظہ ہوشیار ..... سب لوگ نہایت توجہ سے سماعت فرمائیں ..... اب ہمارے پیارے چھوٹے بھائی سید محمد دانش اپنا پسندیدہ راگ، راگ اطفال سنا رہے ہیں ....." اور یہ سنتے ہی ہم رونا بھول کر مسکرانے لگتے۔ اور دوسرے افراد کے قہقہوں سے صحن، کمرہ، گھر جہاں بھی لوگ ہوتے گونج اٹھتا اور تو اور بھائی جان و باجی کی ملی بھگت سے ہونے والی یہ شرارت یہیں ختم نہیں ہوگئی، بلکہ انہیں جب کبھی اپنا کوئی کام کرانا ہوتا۔ ہم سے کہتے دانش ذرا یہ کام تو کر دو اور ہماری زبان سے انکار نکلا تو فوراً دھمکی ملتی ..... اچھا تو پھر نمائش کروں کارٹون والی تصویروں کی اور فوراً ان کا کام کرنے پر ہم آمادہ ہو جاتے۔ خصوصاً اس وقت جبکہ گھر میں ان کے دوست، سہیلیاں یا مہمان

عزیز و اقارب آئے ہوئے ہوتے۔ باجی بڑی کٹیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہتیں۔ "آیئے! آپ لوگوں کو بھائی جان کی فوٹو گرافی کی نئی تصویریں دکھاؤں تب میں یہ سوچ کر کہ کہیں ہماری مضحکہ خیز شکل دیکھ کر گھر آئے مہمان بھی قہقہے لگانے نہ لگیں تب ہم اپنا راگ اطفال کیسے سنانے سے باز رہ سکیں گے اور یوں ہم نے اس واقعہ کے بعد سے پھر کبھی کوئی شرارت ..... تو کیا دور دور ہمارے ذہن میں کسی شرارت کا آئیڈیا تک نہیں آیا۔

عمر فاروق

شادی اور شرارت

شرارت کرنے کا شوق تو مجھے بچپن سے ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ شرارت کا مادہ مجھ میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔

لاہور میں میرے چچا کی شادی تھی۔ ہم سب کزنز نے شادی سے ایک رات پہلے منصوبہ بنایا۔ اس منصوبے پر ہمیں ولیمے کے دن عمل کرنا تھا۔ میں ہی اس منصوبے کا اہم کردار تھا۔ یہ ہماری عادت ہے کہ ہم شادی پر کوئی نہ کوئی شرارت ضرور کرتے ہیں۔ رسم حنا اور رخصتی کے بعد ولیمے کے دن دلہن کو بیوٹی پارلر لے جایا جارہا تھا۔ ہماری بہنوں نے کہا "ہم دلہن کو میک اپ کے لئے لے جارہے ہیں۔ امی کو بتا دینا۔"

"اچھا!" میں نے کہا اور کمرے میں جہاں میرے کزنز انتظار کر رہے تھے، آگیا۔ سب سے

پہلے دروازے کو کنڈی لگائی اور شور مچانا شروع کر دیا۔ ہم نے بالکل یہ تاثر دیا جیسے اندر دلہن کا میک اپ کیا جارہا ہے۔ میں نے لال جوڑا پہنا، بال سنوارے، نقلی ناخنوں پر نیل پالش لگائی، سینڈل پہنے، لپ اسٹک لگائی، آئی شیڈو لگایا۔ غرض جو کچھ ہم سے ہو سکتا تھا کیا۔ آخر میں سر پر طریقے سے دوپٹہ ڈالا جس سے آدھا چہرہ ڈھک گیا۔ اور پرس پکڑ کر اپنی کزنز کے ساتھ باہر آگئے۔ اس وقت تک کافی مہمان آچکے تھے۔ لوگ آتے اور مجھے پیسے دیتے جاتے۔ فوٹو گرافی بھی خوب ہو رہی تھی۔ اسی اثنا میں میری ممانی جان آئیں اور مجھے پیسے دینے لگیں۔ جونہی انہوں نے پیسے دیئے میرے آستین سرک گئی اور میری کلائیوں کے بال نظر آنے لگے۔ انہوں نے فوراً میرے سر سے دوپٹہ کھینچ لیا۔ میں فوراً چھلانگ لگا کر اندر بھاگ گیا۔ کمرے میں جلدی جلدی اپنا حلیہ درست کیا۔

پھر جب اصل دلہن کو بیوٹی پالر سے لایا گیا تو ممانی جان کے علاوہ مختلف لوگ ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہے تھے کہ آیا وہ کہیں دوبارہ تو دھوکہ نہیں کھا رہے اور دلہن بیچاری اپنی جگہ حیران و پریشان تھی۔

یہ میری زندگی کی سب سے بڑی اور مشکل شرارت تھی۔ جو مجھے اور میرے کزنز کو ہمیشہ یاد رہے گی۔

لڑکھڑاتی عبرت

قدیم زمانے میں یونان میں ایک ریاست "اسپارٹ" ہوا کرتی تھی۔ وہاں ایک شخص کو سرکاری افسر کے طور پر رکھا گیا۔ اس شخص کی ڈیوٹی یہ تھی کہ وہ ہر روز بے انتہا شراب پی کر شہر کی گلی کوچوں میں نکل جاتا تھا۔ اور سارا دن دھکے کھاتا پھرتا تھا۔ تاکہ نوجوان اسے دیکھ کر عبرت حاصل کریں کہ شراب کتنی بری چیز ہے۔

انتخاب: حسین موریو — لاڑکانہ

اپنی بچت پر

اضافی

ماھانہ آمدنی

حاصل کیجئے

ماھانہ آمدنی سرٹیفکیٹ

NDFC

منافع

سب سے زیادہ اور

این ڈی ایف سی ماہانہ آمدنی سرٹیفکیٹ کے بانی اب زیادہ فوائد پیش کرتے ہیں۔

- این ڈی ایف سی ماہانہ آمدنی سرٹیفکیٹ کی نئی شرح آپ کے لئے سب سے زیادہ منافع بخش ہے۔
- ڈپازٹ کے پہلے ہی مہینے سے ماہانہ ادائیگی شروع ہو جاتی ہے جو گھر پر بھی وصول کی جا سکتی ہے۔
- ایم آئی سی کی مدت پانچ سال ہے۔ یہ مدت سے پہلے بھی کیش کئے جا سکتے ہیں۔

سرمایہ محفوظ تر

- طلبہ، بیوہ خواتین اور ریٹائرڈ حضرات کے لئے نہایت موزوں اسکیم۔
- این ڈی ایف سی قابل اعتماد اور آزمودہ ہے، جس میں آپ کا سرمایہ محفوظ ہے۔
- کم از کم ڈپازٹ دس ہزار روپے۔

سرمایہ پر ماہانہ منافع

آپ کا سرمایہ	ماہانہ منافع (تقریباً)
۵ لاکھ روپے	۵۸۳۳ روپے
ایک لاکھ روپے	۱۱۶۷ روپے
پچاس ہزار روپے	۵۸۳ روپے
پچیس ہزار روپے	۲۹۲ روپے
دس ہزار روپے	۱۱۶ روپے

ملکیت حکومت پاکستان

NDFC

نیشنل ڈیولپمنٹ فنانس کارپوریشن

منافع اور تحفظ سب سے زیادہ

برانچوں سے رجوع کیجئے،

زکوٰۃ اور ودھولڈنگ ٹیکس کا نفاذ قانون کے مطابق ہوگا

شرارتوں کے شہر میں

ضیاء الحسن ضیاء

بڑے حسیں تھے روز و شب شرارتوں کے شہر میں
ہمیں ملے شریر سب شرارتوں کے شہر میں

کہیں تھی چھیڑ چھاڑ اور کہیں لڑائی کا سماں
کہیں تھا قہقہوں کا شور، کہیں تھی مجلسِ فغاں
سکوں ملا کسی کو کب شرارتوں کے شہر میں

بڑے حسیں تھے روز و شب شرارتوں کے شہر میں
ہمیں ملے شریر سب شرارتوں کے شہر میں

کوئی پٹاخہ چھوڑ کر کسی جگہ دُبک گیا!
دھماکا جس گھڑی ہوا تو خود ہی چیخنے لگا
نرالے دیکھے سارے ڈھب شرارتوں کے شہر میں

بڑے حسیں تھے روز و شب شرارتوں کے شہر میں
ہمیں ملے شریر سب شرارتوں کے شہر میں

بہت سے لڑکے مدرسوں میں مُرغ تھے بنے ہوئے
کہ جس طرح سے پیڑ ہوں قطار میں لگے ہوئے
تھے پڑھنے والے با ادب شرارتوں کے شہر میں

بڑے حسیں تھے روز و شب شرارتوں کے شہر میں
ہمیں ملے شریر سب شرارتوں کے شہر میں

تھیں اُلٹی سیدھی حرکتیں، حماقتیں، شرارتیں
انہی میں سہمی سہمی دیکھیں جابجا شرافتیں
اماں میں رکھے سب کو رب شرارتوں کے شہر میں

بڑے حسیں تھے روز و شب شرارتوں کے شہر میں
ہمیں ملے شریر سب شرارتوں کے شہر میں

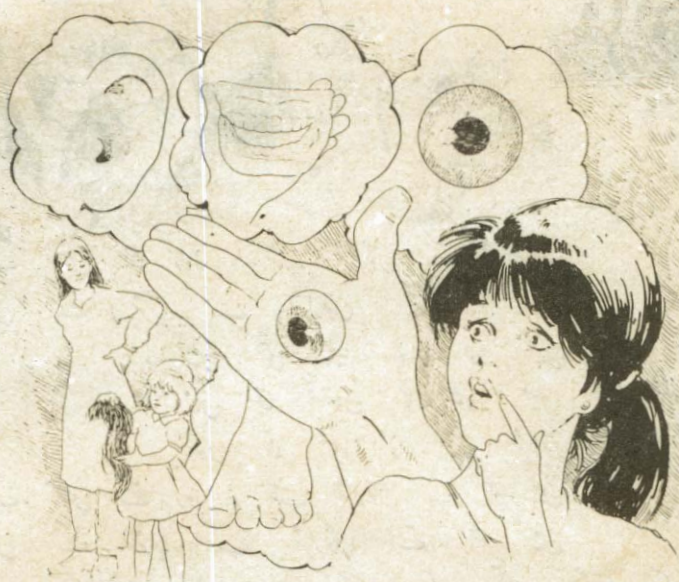

جو یوں ہوتا

سہیلہ فیاض

پچھلے دنوں ہمارے گھر کی کابینہ میں بحث مباحثے کا دور چلا تو ایک خیال یہ بھی پیش کیا گیا کہ اگر انسانی اعضا جسم سے الگ کئے جا سکتے تو کیا ہوتا؟ مجھے یہ خیال بہت دلچسپ لگا اور میں نے تصور کی آنکھ سے دیکھا۔

چھوٹی خالہ جان ادھر ادھر بولائی بولائی پھر رہی ہیں۔ آپو نے انہیں اس حال میں دیکھا تو پوچھا۔ ”ائے ہے، خالہ جان پتہ تو چلے آخر ہوا کیا ہے؟“

”ارے! میں سب سمجھتی ہوں۔ پہلے شرارت کی پھر ہمدردی کرنے آ گئیں۔ سچ سچ بتاؤ میری لمبی لمبی پلکیں کدھر چھپائی ہیں؟ غضب خدا کا دو منٹ کے لئے اتاریں کہ ذرا میک اپ کر لوں پھر لگاؤں گی اور تم نے چھپا دیں۔“

خالہ جانی نے آپو کی لمبی چٹیا کھینچتے ہوئے کہا۔ آپو کی چیخیں بھی سننے کے قابل تھیں۔

"اچھا اچھا چھوڑیں میں سب کچھ بتاتی ہوں۔ بس یہ وعدہ کریں کہ اب ماریں گی تو نہیں۔"

"چلو نہیں مارتی۔" خالہ جان نے رحم دلی کے سابقہ ریکارڈ توڑتے ہوئے کہا۔

پھر آپو نے بتایا کہ میری پیاری سہیلی آ گئی اور کہنے لگی اچھی بہن! مجھے جلدی سے پیاری سی پلکیں دے دو بھائی کے سسرال جانا ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی پلکیں کچھ سوٹ نہیں کریں گی اور آپ کو تو پتہ ہی ہے کہ میری پلکیں نہ صرف چھوٹی ہیں بلکہ سیدھی سپاٹ ہیں۔ (آپو نے افسردگی سے بتایا) اور خالہ جانی سرپیٹ کر رہ گئیں۔

ابھی کچھ دن پہلے میری چھوٹی سی کزن رافت سو کر اٹھی تو روتی روتی میرے پاس آئی، میں نے پوچھا۔ "کیا ہوا ہے؟"

کہنے لگی کہ "ایک تو ربیعہ جب بھی مذاق کرتی ہے بھونڈا ہی کرتی ہے۔ میں نے سوتے ہوئے اپنے کان اٹھا کر جیومیٹری بکس میں رکھ دیئے کہ سکون سے سو سکوں اور اس ربیعہ کی بچی نے دیکھ لیا۔ اب جب سو کے اٹھی ہوں تو اس کے یہ لمبے لمبے ہاتھی جیسے کان پڑے ہیں اور میرے غائب ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ ان میں میرے خوب صورت اور عزیز ترین ٹاپس بھی تھے۔"

بڑی بھابی کی مصیبت تو سب سے بڑی ثابت ہوئی۔ انکے بائیں بازو میں درد ہوا تو اٹھا کر فریزر میں رکھ آئیں۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد بازو لینے گئیں تو وہاں بازو کا نام و نشان نہ تھا۔ پورے گھر میں ڈھنڈیا مچی ہوئی تھی۔ بڑی بھابی نے تو ایک کہرام برپا کیا ہوا تھا۔ آخر عقدہ کھلا تو چھوٹی بھابی کی شامت آئی۔ انہوں نے بڑی بھابی کے موٹے تازے بازو کو بکرے کی ران سمجھ کر روسٹ کر دیا تھا۔ ہائے بیچاری بڑی بھابھی.....!!

ویسے اسعد کے ساتھ بھی خوب گزری۔ رات کو سوتے ہوئے اپنے نئے فیشن کے خوب صورت بال اتار کر بکس میں رکھ دیئے۔ صبح اٹھ کر جو دیکھا تو وہاں کسی اور کی دراز زلفیں پڑی ہیں۔ خوب دھاڑے، شور مچایا۔ وہ تو بعد میں پتہ چلا کہ ایپا جن کو اسعد کے بال بہت ہی زیادہ اس لئے پسند تھے کہ ان کے چہرے پر سوٹ کرتے تھے چپکے سے پہن کر تقریب میں چلی گئیں اور اسعد کے لئے لمبی لمبی زلفیں چھوڑ گئیں۔

یوں ہماری کچھ کزنز (جو زیادہ ہی خوب صورت واقع ہوئی ہیں) کے ساتھ خاصی مصیبت پیش آئی صبح سے شام تک ہر سہیلی چکر لگا رہی ہے اللہ! عافیہ مجھے یہ اپنے لمبے سرخ بال تو دے دو۔ آج اسکول میں پارٹی ہے اور یہ میرے کپڑوں پر میچ کرتے ہیں کوئی کہتی ہے ارے حمنٰی! پلیز مجھے اپنی یہ نازک سی ناک دے دو۔ ایک فنکشن اٹینڈ کرنا ہے۔

ہماری خالہ زاد ہمارے گھر آئی تو سیدھی تیر

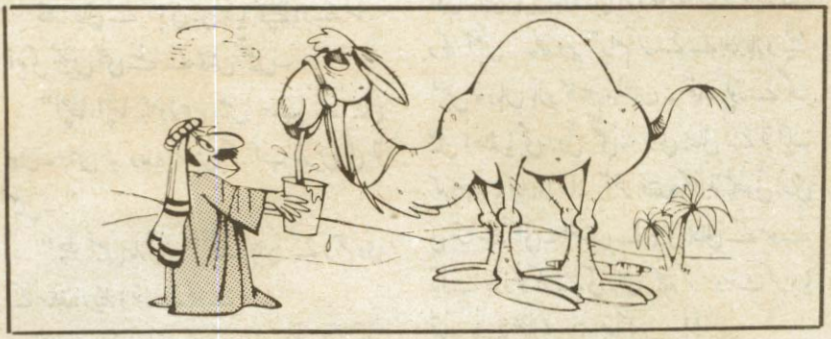

کی طرح دادی جان کے کمرے میں گھس گئی۔ ہمارے تجسس کے ہم بھی پیچھے پیچھے دادی جان کے کمرے میں جا پہنچے۔ دیکھا تو دادی جان کے سامنے دو زانو بیٹھی التجائیں کر رہی تھی۔ "پیاری دادی جان! میں نے ڈرامے میں بڑھیا کا کردار ادا کرنا ہے مجھے ایک دو دن کے لئے یہ جھریوں بھرے گال تو دے دیجئے۔"

ایک دن باجو صاحبہ ایک آنکھ سے آنسو بہا رہی تھیں میں نے حیرت سے دیکھا اور پوچھا کہ آپ کی دوسری آنکھ کہاں گئی تو جواب میں کہنے لگی۔ "بائیں آنکھ میں کھجلی ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ دھولوں۔ دھو ہی رہی تھی تو پھسل کر نالی میں جا پڑی۔ اب مل ہی نہیں رہی۔" اتنا کہہ کر باجو صاحبہ اکلوتی آنکھ سے پھر زور شور سے رونے لگیں۔

بس ساتھیو! میرے خیال میں تصوراتی دنیا کی اتنی ہی شرارتی کہانی کافی ہے۔ جس سے ہمیں بہت واضح سبق ملتا ہے کہ "اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔"

SIND CHOCOLATE WORKS
Plot No. 11, K-28(C), University Road, Karachi-74800, Pakistan.

THINNER

بندر بلی شیر اور بھالو
سب مجھ کو کہتے ہیں خالو

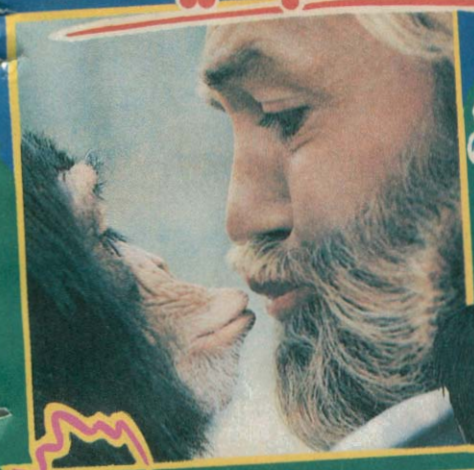

شریر جانوروں کا باوا آدم

محمد جاوید خالد

ذہانت اور آزادی ایک جگہ جمع ہو جائیں تو پھر وہ چیز ضرور ہوگی جسے "شرارت" کہا جاتا ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے تو اپنے علم اور ذہانت کی وجہ سے ہے۔ مگر ضروری نہیں کہ وہ شرارتوں میں بھی دوسری مخلوق سے برتر ہو چنانچہ آپ تصویروں میں "اشرف المخلوقات" کے ساتھ "دوسرے درجے کی مخلوق" کی اٹھکیلیاں دیکھ سکتے ہیں۔ جو "اشرف المخلوقات" پر سوار ہے یا سوار ہونے کے لئے تیار ہے۔ تصویر میں آپ اس شخص کو بھی دیکھ سکتے ہیں جو مضبوط جسم، طویل جسامت، گھنی مونچھیں، ڈاڑھی اور ہنستا مسکراتا چہرہ لئے ہے۔ اس خوش پوش اور خوش باش انسان کا نام ڈان ہیگرٹی ہے جو گرزلی آدم کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ امریکہ میں خاکستری ریچھ کو گرزلی کہا جاتا ہے۔ ڈان ہیگرٹی کا یہ لقب آئینہ دار ہے اس بات کا کہ اس میں جانوروں کے بچوں کی شرارتیں برداشت کرنے کی صلاحیت ہے۔ اس کی بیوی کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ "بھلا شیر ڈان کے سوا کسی کا حکم مان سکتے ہیں؟

خود ڈان ہیگرٹی کا کہنا ہے کہ جانوروں نے مجھے اداکار بنا دیا۔ ڈان جو بعد میں ایک زبردست قسم کا فلم ڈائریکٹر بنا، ۱۳ برس تک جانوروں کو تربیت دیتا رہا ہے یا یوں کہئے کہ ان کی شرارتوں کو برداشت کر کے ان کے اندر چھپی ہوئی غیر معمولی صلاحیتوں کو چمکانے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ اس کے سدھائے گئے جانوروں میں کم از کم ۳۰ شیر، ۵ چمپنیزی، ۲۰ بھیڑیے ۱۸ ریچھ اور ۱۳ لومڑیاں شامل ہیں۔ ٹیلی وژن پر اس کی باقاعدہ ایک سیریز چلتی رہی ہے جس کا نام تھا The life and times of Crizzly Adam اس سیریز کے ۳۹ شو ہوئے اور یہ دو سال تک چلتی رہی۔ اس فلم کی شوٹنگ کے لئے گرزلی نے موسم کے گرم و سرد کی پروا کئے بغیر پہاڑی علاقے کو اپنا مسکن بنائے رکھا۔

دوستو! کسی شاعر نے کہا تھا

ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو۔

ڈان ہیگرٹی نے یقیناً ایک منفرد کام انجام دیا ہے۔ اور وہ کام یہ ہے کہ اس نے جانوروں کی شرارتوں کو ایک خوبصورت رنگ دے کر ان کی وحشت کو قابو کر لیا۔

شریر لڑکوں کی قوالی

عبدالقادر

مزا امرود کا آتا ہے باغوں سے چُرانے میں
بڑی پھُرتی دکھاتے ہیں وہاں سے بھاگ جانے میں

ہے سر پر امتحاں اپنے، پڑھائی نامکمل ہے
گنوایا سال ہم نے کھیلنے، ہنسنے، ہنسانے میں

بھروسہ نقل پر ہے، امتحاں میں فیل کیوں ہوں گے
کوئی بازی نہ ہم سے لے سکا نمبر کمانے میں

کسی کی موت کے حیلے سے اکثر لیتے ہیں چھٹّی
نہیں نقصان ایسا سہل نسخہ آزمانے میں

یہی محسوس ہوتا ہے ہمیں وہ کاٹ کھائے گا
بڑا ہی لطف آتا ہے کسی کو منہ چڑانے میں

محلّے کی ہیں ساری مُرغیاں اب پیٹ میں اپنے
کوئی ماہر نہیں اپنی طرح مُرغی چرانے میں

لگے جب بیٹھنے کوئی تو کرسی کھینچ لیتے ہیں
ہنسی پھر خوب آتی ہے اس اِک دم گرانے میں
پٹاخے، پھلجھڑی بکری کی دم سے باندھ دیتے ہیں
تماشا خوب ہوتا ہے اسے نچانے میں
لگا کر ماسک چہرے پر، اندھیری رات میں اکثر
مُسرّت کس قدر ہوتی ہے لوگوں کو ڈرانے میں
کبھی اسکوٹروں کو روڈ پر زگ زیگ کرتے ہیں
کمال اکثر دکھایا ایک پہیے پر چلانے میں
کبھی چُھپتے ہیں شاخوں میں، کبھی ہم بھاگ جاتے ہیں
طبیعت شاد ہو جاتی ہے مالی کو ستانے میں
نکل جاتی ہے ٹائر سے ہوا سائیکل سواروں کی
مہارت ہے ہمیں بچپن سے یوں ہی پن چُبھانے میں
شرارت میں نہیں ثانی ہمارا اس زمانے میں
شکایت لوگ کرتے ہیں ہماری جا کے تھانے میں

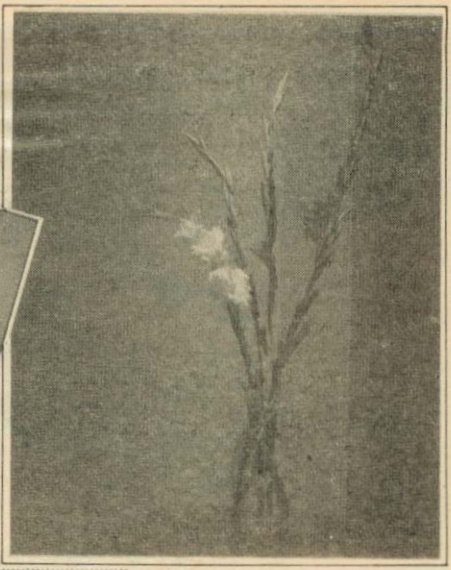

- دیدہ زیب شادی کارڈز
- بزنس وزیٹنگ کارڈز
- کیلنڈرز
- عید کارڈز
- پروفیشنل پرنٹنگ

ہر قسم کی اعلیٰ اور معیاری پرنٹنگ کے لیے

شاداب پرنٹرز

دھرم داس بلڈنگ (نزد ایس ایم لا کالج) ڈاکٹر ضیاء الدین احمد روڈ کراچی فون نمبر: ۲۱۳۸۴۱

مصنف کی شرارت کا سچا عبرت انگیز واقعہ

اے خدا مجھے معاف کردے

محمد یوسف گل

بچپن میں میرا شمار بھی ان ہی بچوں میں ہوتا تھا جن سے ہر کوئی بیزار رہتا ہے۔ لیکن میرے ساتھ ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ جس کے بعد آج تک میں نے کوئی شرارت نہیں کی۔

ہوا یوں کہ ایک دن ماسٹر صاحب مجھ سے کسی بات پر سخت ناراض ہو گئے اور مجھے مرغا بنا کر اتنا مارا کہ میری کمر پر نشان پڑ گئے۔ اس وقت تو میں نے اس بات کو اتنا محسوس نہ کیا۔ لیکن چھٹی کے وقت تمام لڑکوں نے میرا اتنا مذاق اڑایا کہ میں نے دل میں عہد کیا کہ میں ایک نہ ایک دن ضرور ماسٹر صاحب سے اس بے عزتی کا بدلہ لوں گا۔ اور پھر میں اسی دن سے موقع کی تلاش میں رہنے لگا۔

مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کیونکہ جمعہ کے دن دوپہر کے وقت میں ایسے ہی ذرا کھیتوں کی طرف گھومنے نکلا تو کرمو کے کھیت سے گزرتے ہوئے مجھے ماسٹر صاحب کرمو کے چھپر کے نیچے سوئے ہوئے نظر آئے۔ چھپر کے ایک ستون کے ساتھ کرمو کا مضبوط جسم والا خوفناک بیل بندھا ہوا تھا۔اس بیل کی سارے گاؤں میں شہرت تھی کہ وہ ذرا سی بات پر مچل کر ایسی تباہی مچا دیتا ہے کہ خدا کی پناہ!جو چیز بھی سامنے آتی ہے اسے زیر و زبر کر کے رکھ دیتا ہے اور طاقتور اتنا ہے کہ مضبوط سے مضبوط رسے اور زنجیر توڑ کر بھاگ جاتا ہے اور سوائے کرمو کے کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ مجھے اپنی بے عزّتی کا بدلہ چکانے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی موقع نظر نہ آیا۔ میں دوڑ کر گھر گیا۔ اور ایک رسی اور بکری کے گلے میں باندھنے والی گھنٹی لی اور نہایت خاموشی کے ساتھ آکر سوئے ہوئے بیل کے گلے میں باندھ دی۔ رسی کا ایک سرا بیل کی دُم سے مضبوطی کے ساتھ اس طرح باندھا کہ بیل کو محسوس نہ ہو اور رسی کا دوسرا سرا پھندا بنا کر ماسٹر صاحب کے پاؤں میں اس طرح پھنسایا کہ جتنا کھنچتا پھندا اتنا ہی کس جاتا۔ جب میں نے اپنا کام مکمل کر لیا تو کچھ فاصلے پر موجود ایک جھاڑی کے پیچھے چھپ کر ادھر ادھر کا جائزہ لیا۔ جون کا مہینہ تھا ہر طرف سورج آگ برسا رہا تھا اور بالکل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پوری طرح اطمینان کر لینے کے بعد میں نے غُلیل سنبھال کر بیل کے گلے میں بندھی گھنٹی کا نشانہ لے کر پتھر چھوڑ دیا مگر وہ خالی چلا گیا۔ دوسرا پتھر میں نے خوب تاک کر مارا جو کہ سیدھا گھنٹی کو لگا اور گھنٹی بج اٹھی۔ بیل ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ بیل کے چلنے سے گھنٹی اور زور سے بجی پھر کیا تھا بیل تو مچل گیا اور ٹکریں مار مار کر ستون سے خود کو چھڑانے لگا اور اتنے زور سے جھٹکا مارا کہ پورا چھپر ماسٹر جی کے اوپر آگرا جس سے بیل اور زیادہ خوفزدہ ہو گیا اور ادھر ادھر دوڑنے لگا جب میں نے یہ منظر دیکھا تو بد حواس ہو کر بھاگا۔ یہ دیکھے بغیر کہ میں کس طرف جا رہا ہوں۔ پیچھے سے بیل کے دوڑنے اور ماسٹر صاحب کے چیخوں کی آوازیں آتی رہیں مگر میں نے مڑ کر نہیں دیکھا اور گاؤں سے بہت دور پہاڑوں میں آکر دم لیا۔ اتنے میں مجھے سامنے سے ماموں جمشید اونٹ پر سوار آتے دکھائی دیئے۔ میں بالکل ایسا بن گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ انہوں نے قریب آکر پوچھا "کیوں میاں یوسف! یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"بس ذرا ایسے ہی شکار کرنے کو آیا تھا۔" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"اچھا بیٹا! اپنا خیال رکھنا اور ہاں شازیہ بھی یہیں کہیں بکریاں چرا رہی ہے۔ بیٹا ذرا اس کا بھی دھیان رکھنا کیونکہ وہ ان جگہوں سے نا واقف ہے۔"

آپ فکر ہی نہ کریں ماموں میں نے انہیں اطمینان دلایا۔

"جیتے رہو بیٹا۔" ماموں جمشید دعائیں دیتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

ان کے جانے کے بعد میں نے سوچا اب مجھے کیا کرنا چاہئے لیکن جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو یونہی بے مقصد پہاڑوں پر گھومتا ہوا ایک بہت ہی اونچی چوٹی پر چڑھ کر شازیہ کی تلاش میں نظریں ادھر ادھر دوڑائیں کہ دیکھوں وہ کہاں بکریاں چرا رہی ہے۔ اچانک میری نظر ایک بہت ہی خوبصورت پرندے پر پڑی جو ایک پتھر پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے فوراً تاک کر غلہ چھوڑا جو سیدھا اس کے سر پر جا لگا اور وہ گر کر تڑپنے لگا۔ میں جیسے ہی اس کی طرف لپکا میرا پاؤں پھسلا اور میں چٹان میں موجود ایک بہت بڑے شگاف میں جا گرا جو چٹان کے درمیان سے ٹوٹ جانے کی وجہ سے بن گیا تھا۔ خوش قسمتی سے دونوں طرف کی چٹانی دیواروں کے درمیان بہت نیچے جا کر ایک بڑا سا پتھر پھنسا ہوا تھا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ میں اسی پتھر پر جا گرا اور میرے بائیں ہاتھ کی کہنی پتھر سے اس زور سے ٹکرائی کہ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ سر بھی کسی چیز سے اتنے زور سے ٹکرایا کہ یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی پھٹ جائے گا۔ اور اتنی سخت چوٹیں آئی تھیں کہ جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا اکثر جگہوں سے خون بھی بہہ رہا تھا لیکن اس حالت میں بھی میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ جس نے مجھے گمنام موت مرنے سے بچا لیا۔ کیونکہ اگر میں اس پتھر پہ نہ گرتا تو یقیناً میری لاش بھی نہ ملتی حواس بحال ہوئے تو میں نے باہر نکلنا چاہا مگر یہاں سے تو باہر نکلنے کا کوئی راستہ ہی نہ تھا کیونکہ دیواریں بالکل سیدھی اور سپاٹ تھیں اور کہیں بھی کوئی ایسی چیز نہیں تھی کہ سہارا لے کے باہر نکلا جاتا۔ لیکن پھر بھی اگر میں کوشش کرتا تو کسی نہ کسی طرح ضرور نکل جاتا۔ لیکن اس خیال سے کہ کہیں ہاتھ پھسل گیا تو یہ ضروری نہیں کہ میں پھر بھی اس پتھر پر آگروں۔ اس لئے یہی بہتر سمجھا کہ کوئی ادھر سے گزرے گا تو میں آواز دے کر اسے متوجہ کروں گا۔

اسی طرح انتظار کرتے ہوئے پانچ گھنٹے گزر گئے۔ لیکن ابھی تک یہاں سے کسی کا گزر نہیں ہوا تھا اب تھوڑا تھوڑا مجھے خوف بھی محسوس ہونے لگا تھا۔ لیکن پھر بھی مجھے یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی میری مدد کو ضرور آئے گا۔ اتنے میں کہیں دور سے گھنٹیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ کوئی چرواہا اپنے ریوڑ کے ساتھ گزر رہا ہے۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے کہ یہ شازیہ کا ریوڑ ہی ہو۔ کیوں کہ ماموں نے بتایا کہ وہ یہیں کہیں بکریاں چرا رہی ہے۔ اس لئے میں نے زور سے زور سے چیخنا شروع کر دیا کہ وہ میری آواز کی طرف متوجہ ہو جائے۔ مگر چند لمحوں بعد یوں محسوس ہوا کہ جیسے گھنٹیوں کی آوازیں دور ہوتی جا رہی ہیں۔ میں نے اور زیادہ قوت سے چلانا شروع کر دیا۔ اور مدد کے لئے پکارتا رہا مگر سب بے سود

رہا اور آہستہ آہستہ گھنٹیوں کی آوزیں آنی ختم ہو گئیں اور میں مایوس ہو کر بیٹھ گیا اسی وقت مجھے پانی کی بھی طلب ہونے لگی تھی کیونکہ ایک تو میں بہت بھاگا تھا اور دوسرا چیخ چیخ کر میں نے اپنا گلا سُکھا ڈالا تھا۔

آہستہ آہستہ ہر طرف اندھیرا چھانے لگا تھا مجھے دل ہی دل میں خوف بھی محسوس ہونے لگا کہ اگر کوئی مدد کو نہ آیا تو مجھے رات یہیں گزارنی پڑے گی اور خدانخواستہ کوئی درندہ اندر گھس آیا تو اس سے آگے مجھے سوچنے کی ہمت نہ پڑی۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ مجھے یوں لگا جیسے کوئی مجھے پکار رہا ہو۔ میں نے آواز پر غور کیا تو وہ میرے دوست مرتضٰی کی آواز تھی اور اس کے علاوہ بھی میرے بہت سے دوستوں کی آوازیں آرہی تھیں جو مجھے ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ شاید انہیں میری بارے میں جمشید ماموں نے بتا دیا تھا۔ میرے جسم میں خوشی کی لہر سی دوڑ گئی، اس سے پہلے کہ میں دوست کو آواز دیتا۔ اچانک میری نظر دو چمکتی ہوئی آنکھوں پر پڑیں جو حرکت کرتی ہوئی میری طرف آرہی تھیں۔ چند لمحوں بعد ان چمکتی آنکھوں کے پیچھے ایک خوفناک سانپ بر آمد ہوا جسے دیکھ کر مجھ پر تو بالکل سکتہ سا طاری ہو گیا۔ سانس اوپر کی اوپر ہی رہ گئی۔ ڈر کے مارے مجھ سے حرکت تک نہیں ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے مجھے کسی چیز سے باندھ کر رکھ دیا ہو اور سانپ قریب سے قریب آتا جا رہا تھا پھر میں جس پتھر پر بیٹھا ہوا تھا اس پر کنڈلی مار کر بالکل میرے قریب بیٹھ گیا۔ شاید ابھی تک اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ عین اسی وقت میرا ایک دوست مجھے ڈھونڈتا ہوا شگاف کے منہ تک آگیا اور مجھے پکارنے لگا۔ مجھے بڑے عجیب حالات کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ اگر میں دوست کو آواز دیتا تو سانپ کو میری موجودگی کی خبر ہو جاتی جس کا انجام بہت برا ہوتا اور اگر میں خاموش رہتا تو میرا دوست چلا جاتا۔ بڑی عجیب کشمکش تھی آخر عافیت اسی میں سمجھی کہ سانپ کے جانے کا انتظار کیا جائے۔ میں بالکل بے حس و حرکت ہو کر بیٹھ گیا۔ مجھے سانپ سے جتنا ڈر محسوس ہو رہا تھا۔ اس سے کہیں زیادہ غصہ آرہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ کہیں کوئی بڑا سا پتھر مل جائے جو اس کے سر پر دے ماروں مگر میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا غلیل بھی کہیں گر گئی تھی چند لمحوں بعد سانپ خود بخود رینگتا ہوا باہر نکل گیا۔ پھر میں نے دوست کو بہت آوازیں دیں مگر شاید وہ واپس چلا گیا تھا۔ اس وقت مجھے اپنی حالت پر بہت رونا آرہا تھا۔ بھوک اور پیاس نے برا حال کر دیا تھا۔ گلے میں کانٹے سے چبھ رہے تھے۔ اگر ذرا سی آہٹ ہوتی یا دور سے جب گیدڑوں کی آوازیں آتیں تو یوں لگتا جیسے ابھی کوئی بھوت یا چڑیل آکر مجھے کھا جائے گی اور میں اس تصور سے ہی کانپ اٹھتا۔ وہ رات میں نے کس طرح گزاری، بیان نہیں کر سکتا۔ ساری رات رو رو کر خدا سے معافیاں مانگیں اور آئندہ کسی بھی انسان یا

جانور کو نہ ستانے کا وعدہ کرتا رہا۔ پوری رات خوف کے مارے نیند نہیں آئی۔ صبح جب کہیں دور سے اذان فجر کی آواز سنائی دی تو اس وقت جو میری حالت تھی، اس کا وہی لوگ اندازہ کر سکتے ہیں جو کبھی ان حالات سے دو چار ہوئے ہوں۔ آنکھیں سوج کر سرخ ہو رہی تھیں۔ اور بھوک اور پیاس سے یہ حال ہو رہا تھا کہ جب گاؤں والے مجھے آوازیں دیتے ہوئے شگاف کے کنارے تک آگئے تھے تو مجھ میں اتنی سکت نہیں تھی کہ میں ان کی بات کا جواب دے سکتا وہ تو اچھا ہوا کہ انہیں شگاف کے باہر میری غلیل پڑی ہوئی مل گئی۔ اس کو دیکھ کر انہوں نے اندازہ کیا کہ میں شگاف کے اندر گرا ہوں ورنہ مجھے یقین تھا کہ وہ اندر جھانکے بغیر ہی چلے جاتے اور میں آج یہاں نہ ہوتا۔

ایک آدمی کو رسے سے باندھ کر اندر لٹکایا گیا جس نے مجھے بڑی مشکل سے باہر نکالا اور میں باہر نکلتے ہی بے ہوش ہو گیا اور پھر دو ہفتے تک بستر پر پڑا رہا۔ اور ہاں ماسٹر صاحب کو اللہ نے بچا لیا اور انہیں اتنی سخت چوٹیں نہیں آئی تھیں کیونکہ وہ پھندا جلد ہی کھل گیا تھا۔ آج تک کسی کو معلوم نہیں ہو سکا کہ کرمو کا چھپر گرانے اور ماسٹر جی کو زخمی کرنے والا شیطان کون تھا۔ لیکن اب میں سوچتا ہوں کہ انسان خواہ کتنا ہی لوگوں سے چھپ کر کسی کو تکلیف پہنچائے۔ خدا سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا اور وہ ضرور اسے اس کے کئے کی سزا دیتا ہے۔

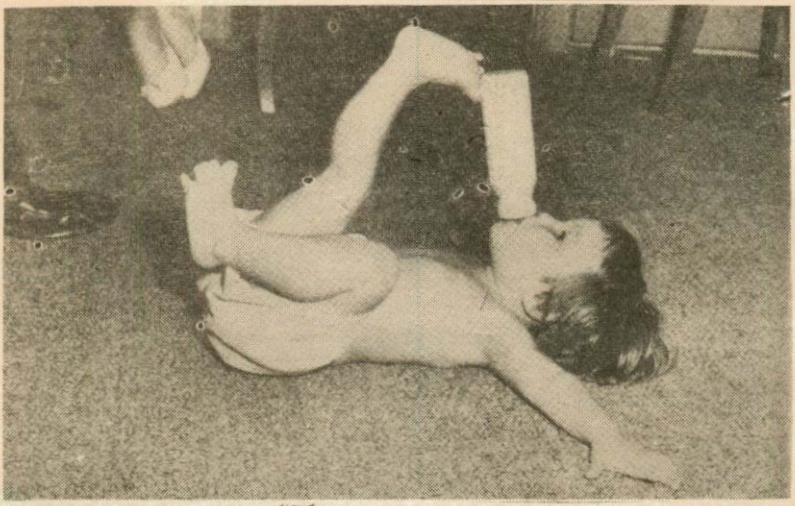

واہ دودھ پینے کا مزہ آگیا

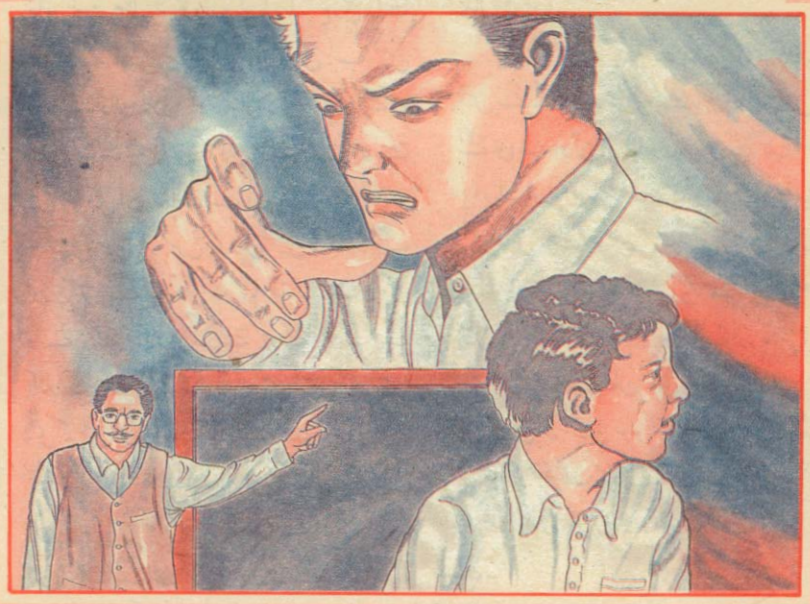

پہاڑی بکرا

شرارتی لڑکوں کے لئے۔ شریف لڑکے بھی اسے پڑھ سکتے ہیں

سجاد حسین

وہ سردیوں کی ایک یخ بستہ صبح تھی۔ میں اپنی کلاس روم میں بیٹھا سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔ تقریباً سب لڑکے زندہ سلامت کلاس میں آچکے تھے۔ کلاس ٹیچر کے قدموں نے ابھی تک کلاس کے دروازے کی دہلیز کو نہیں چوما تھا۔ میرے ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چہرے کو کاٹ رہی تھی۔ گھر کا گرم بستر بار بار یاد آرہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کاش میں اس وقت گھر کے گرم بستر میں ہوتا۔ اتنے میں کلاس کے دروازے کی دہلیز پر کلاس ٹیچر کے بجائے ایک لڑکا نمودار ہوا۔ وہ درمیانے قد کا ایک خوبصورت سا لڑکا تھا جس کے چہرے پر خفیف مسکراہٹ تھی۔ اس کے نئے اسکول بیگ سے میں فوراً سمجھ گیا کہ وہ ہمارا نیا ہم جماعت ہے۔ وہ آرام سے اپنی کرسی پر براجمان ہو گیا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد ہمارے کلاس ٹیچر سر اسرار ہمارے کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے حاضری لینے کے بعد نئے کلاس فیلو کا سرسری تعارف کرایا۔ انہوں نے کہا کہ اس کا نام طاہر شاہ ہے اور آج سے یہ آپ کا نیا ہم جماعت ہے۔ اس کے بعد وہ پڑھانے میں مشغول ہو گئے۔ یہ میری پرانی عادت ہے کہ میں

جب بھی کسی نئے لڑکے کو دیکھتا ہوں، اس میں نقائص نکالنا شروع کر دیتا ہوں اور غالباً یہی میری شرارتوں کی جڑ ہے۔ جب بھی میں نے شرارتوں کی شاخیں کاٹیں۔ اس جڑ کی وجہ سے پھر نئی شاخیں نکل آئیں۔ بظاہر تو مجھے طاہر میں کوئی نقص نظر نہیں آیا لیکن غور سے دیکھنے کے بعد اس کے ایک نقص کی وجہ سے میں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اس کی آنکھیں ٹیڑھی تھیں۔ کچھ دیر میں اسے ایسے دیکھتا رہا جیسے وہ آسمان سے اترا ہو۔ میرے ذہن میں شرارت کی کھچڑی پک رہی تھی۔ پھر فوراً میرے ذہن میں طاہر کے لئے ایک خوبصورت شرارتی نام نے دستک دی اور میرا جی باغ باغ ہو گیا۔ اس کا نام ہو گا آنکھ ٹیڑھا۔ آٹے کا پیڑا۔ آہاہاہا..... میں دل ہی دل میں ہنسا۔ جب پیریڈ ختم ہوا اور سر کلاس سے تشریف لے گئے تو میں اپنی کرسی سے اٹھا میرے چہرے پر شرارتی مسکراہٹ نمایاں تھی۔ میں نے طاہر کو یوں مخاطب کیا۔ "او آنکھ کے ٹیڑھے آٹے کے پیڑے کہاں سے آ ٹپکے"۔ یہ سن کر پہلے سب لڑکے حیرت کے بت بنے رہے پھر اچانک قہقہوں اور سیٹیوں کا وہ طوفان اٹھا کہ اللہ کی پناہ۔ خیر خدا خدا کر کے جب قہقہوں اور سیٹیوں کا غل غپاڑہ تھما تو طاہر اپنی کرسی سے اٹھا اور مجھے کہا۔ "اور پہاڑی بکرے! تمہارے سر سے سینگ کہاں غائب ہو گئے؟" میری حیرت کی انتہا نہیں رہی۔ آج ہی آیا ہے اور اس کو میرے بگڑے ہوئے نام کا پتا چل گیا۔ مگر کیسے؟ میرے ذہن میں سوال گونجا۔ پھر ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ وہ جس لڑکے کے ساتھ بیٹھا تھا وہ ہماری کلاس کی شرارت اسمبلی کا اپوزیشن لیڈر تھا۔ اور ویسے بھی اپوزیشن لیڈر کا کام صاحبِ اقتدار کی ٹانگیں کھینچنا اور اس پر کیچڑ اچھالنا ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا اس میں کوئی قصور نہیں تھا۔ اس کا نام جاوید خان تھا مگر وہ چھکڑے کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس کا نام چھکڑا میں نے رکھا تھا۔ مگر اس نے بھی میرا نام پہاڑی بکرا رکھ کر مجھ سے بدلہ لیا تھا۔ پہاڑی بکرے کے نام سے مجھے بہت چڑ تھی۔ جو کوئی مجھے اس نام سے پکارتا تو میں آگ بگولا ہو جاتا۔ مجھے طاہر سے زیادہ جاوید پر غصہ آیا کیونکہ اس نے وقت سے پہلے میرا بگڑا ہوا نام طاہر کو بتا دیا تھا۔ میں نے طاہر کو نظر انداز کر کے جاوید سے کہا "او چھکڑے کے بچے! میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔" یہ کہہ کر میں اس پر ایسے جھپٹا جیسے شیر اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔ مگر اس سے پہلے کہ میں یہ غلطی کرتا ساری کلاس کھڑی ہو گئی۔ میں نے بجلی کی تیزی سے پیچھے مڑ کر دیکھا تو سر عبدالقیوم دم سادھے کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھ میں موٹا مولا بخش دیکھ مرے اوسان خطا ہو گئے۔ "ادھر آؤ میرے پاس۔" سر کی کرخت آواز آئی جس میں غصے کا اظہار تھا۔ میری خوف سے تھرتھراتی ہوئی ٹانگیں سر کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ جونہی میں سر کے پاس پہنچا سر کا موٹا مولا بخش اوپر کی طرف اٹھا اس کے بعد مولا بخش نے میرا وہ حشر کیا جو بیان سے باہر ہے۔ میرے دل

میں طاہر اور خاص کر جاوید کے لئے نفرت کا لاوا ابل رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ ابھی اٹھوں اور طاہر اور جاوید کے دانت کھٹے کر دوں مگر میں نے جوش سے نہیں ہوش سے کام لیا۔ جب چھٹی کی گھنٹی تو بجی میں نے اپنا بیگ سنبھالا اور باہر نکل آیا۔ طاہر اور جاوید ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ میں ان کے پیچھے پیچھے شرارتی موڈ میں خراماں خراماں چل رہا تھا۔ اچانک مجھے ایک شرارت سوجھی۔ میں طاہر کو مخاطب کر کے بولا "او آنکھ کے ٹیڑھے آٹے کے پیڑے چھکڑے میں بیٹھ کر کدھر جاوے۔" طاہر نے مجھے دیکھا اور پھر بولا "دراصل ہم پہاڑی بکرے کا شکار کرنے جنگل جا رہے ہیں۔" پہاڑی بکرے کا نام سن کر میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ میں نے اور کچھ کرنے کے بجائے گھر جانے میں عافیت سمجھی۔ اگلی صبح جب میں کلاس میں داخل ہوا تو بلیک بورڈ کو دیکھ کر میں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ بلیک بورڈ پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ "پہاڑی بکرے کو مجھ سے نہ ٹکرانا..... اس کی سینگوں سے بال بال بچا نا۔" میرے غصے کی انتہا نہ رہی۔ میں ظالمانہ لہجے میں بولا "کس نے لکھا ہے یہ؟" سب کو سانپ سونگھ گیا۔ کلاس کے تقریباً سب لڑکے مجھ سے ڈرتے تھے کیونکہ میں جسامت کے لحاظ سے سب سے مضبوط اور طاقتور تھا۔ میں نے ایک لڑکے کو زور دار تھپڑ مارا۔ تڑاخ کی آواز آئی "تم نے لکھا ہے یہ۔" میں چیخ کر بولا "نن نہیں میں تو ابھی آیا ہو۔" وہ ڈرے ہوئے لہجے میں بولا "تو پھر کس نے لکھا ہے یہ؟" میں ایک دفعہ پھر پوری قوت سے چیخا۔

"میں نے لکھا ہے یہ۔" پیچھے سے نرم لہجے میں آواز آئی۔"

میں نے مڑ کر دیکھا تو سراسرار چہرے پر ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کھڑے تھے۔

"سر آپ!" میں حیرت بھری آواز میں بولا۔

"ہاں میں میں نے یہ سب کچھ کیا ہے صرف تمہیں سبق سکھانے کے لئے مجھے معلوم تھا کہ تم کلاس کے سب سے شرارتی لڑکے ہو۔ تمہاری شکایتیں آئے دن میرے پاس آتی رہتی تھیں۔ میں صبر کرتا رہا کہ شاید تم ٹھیک ہو جاؤ مگر تم روز بروز بگڑتے چلے گئے۔ چلو ایک دو دفعہ شرارت کر دی اس کی تو کوئی بات نہیں مگر ہر وقت شرارتیں کرنا، نام بگاڑنا یہ کوئی اچھی بات تو نہیں۔ میں نے آج صبح تمہیں آزمانے کے لئے بلیک بورڈ پر یہ فقرہ لکھا اور میں نے دیکھا کہ تم کو کتنا غصہ آیا تھا۔ ذرا سوچو جب تم اور لڑکوں کو تنگ کرتے تھے، ان کے نام بگاڑتے تھے، ان کا مذاق اڑاتے تھے اور ان کے آگے پیچھے ہوتے تھے تو ان پر کیا گزرتی تھی وہ کیسے برداشت کرتے تھے۔ تمہارا کچھ دنوں میں یہ حال ہو گیا ان کا تو معمول تھا۔ وہ ہر روز اس قسم کے فقرے سنتے تھے۔ کبھی تم نے اس پہلو پر سوچا کبھی غور کیا۔" سر کی باتوں نے میرے پتھر جیسے دل کو موم کر دیا۔ میرا سر ندامت سے جھک گیا۔

شرمندگی مجھے بار بار ڈس رہی تھی۔ پھر میں نے سر اٹھایا اور کہا "سر! میں آئندہ شرارتیں نہیں کروں گا، میں کسی کو تنگ نہیں کروں گا، میں کسی کا نام نہیں بگاڑوں گا اور میں کسی کا مذاق نہیں اڑاؤں گا۔"

"شاباش مجھے تم سے یہی امید تھی۔"

سر اسرار کی مسکراہٹ گہری ہوتی چلی گئی۔

"لیکن سر ایک بات پر میں حیران ہوں۔" میں حیران کن لہجے میں بولا۔

"کونسی بات؟" سر اسرار بھی حیرت بھرے لہجے میں بولے۔

"وہ یہ کہ جس انداز سے آپ نے بورڈ پر یہ خوبصورت فقرہ لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ بھی بچپن میں کافی بلکہ کافی سے زیادہ شرارتی تھے۔" میں نے جونہی یہ کہا، سر سمیت ساری کلاس نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس پڑی۔

لینے کے پڑ گئے دینے

تسکین زیدی

عزیز اور احمد ڈرائنگ روم میں بیٹھے کیرم کھیلنے میں مگن تھے کہ کسی آواز نے انہیں چونکا دیا۔

"احمد بھیا! اپنا کارڈ لے جاؤ۔"

"اچھا ڈاکیہ انکل! میں ابھی آیا۔" — احمد جلدی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"لائیے انکل..... کیسا کارڈ ہے؟"

"شاید کسی شادی کا دعوت نامہ ہے۔" پوسٹ مین نے کارڈ کا گلابی رنگ دیکھ کر اندازے سے کہا۔

احمد نے کارڈ بغور دیکھا۔ پھر وہ اسے لے کر اندر جانے لگا۔

"دیکھو یار! میں یہ کارڈ امی کو دکھا آؤں تم یوں ہی بیٹھے رہنا، گوٹیں نہ بدل لینا۔"

"اچھا جاؤ جلدی آنا مجھے بھی گھر جانے میں دیر ہو رہی ہے۔" عزیز سنجیدگی سے بولا اور احمد کے جاتے ہی اس نے گوٹیں بدل لیں۔ تھوڑی دیر بعد احمد واپس آیا تو چہرے پر رونق نظر آرہی تھی۔

"بہت خوش نظر آرہے ہو بچو! ایسی کیا بات ہے؟"

"خوشی کی بات یہ ہے کہ کل ہم تم رات کو ایک شادی کی دعوت میں شریک ہوں گے اور تم میرے ساتھ مرغ بریانی اور کھیر کھاؤ گے۔"

"میں تو نہیں جاؤں گا؟ یہ تو تمہارا کارڈ ہے؟"

"چپ! ہر وقت بحث نہیں کرتے۔ ڈیڈی

شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ ممی کا حکم ہے کہ تم ان کی جگہ جا کر شادی میں شرکت کرو۔ اب چُوں چرا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم کل سات بجے تک آ جانا خوب تفریح رہے گی۔"

"اگر آنٹی کا حکم ہے تو میں ضرور تمہارے ساتھ چلوں گا۔" عزیز نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "ارے! تم نے گوٹیں بدل لیں۔"

احمد نے صورتحال بھانپ لی۔ "تمہیں وہم ہوا ہے۔" عزیز نے بڑی معصومیت سے کہا لیکن احمد نے ہاتھ مار کر ساری گوٹیں بکھیر دیں۔ احمد اور عزیز دونوں میں اچھی دوستی تھی۔ دونوں دوست شرارتی بھی تھے اور ان کے ذہنوں میں نت نئے شرارتوں کے آئیڈیئے دوڑتے پھرتے تھے۔

دوسرے دن شام چھ بجے عزیز تیار ہو کر آ گیا۔ احمد ابھی کپڑوں پر استری ہی کر رہا تھا۔ "تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے...... مجھے دیکھو! وقت کا کتنا پابند ہوں پہلے ہی تیار ہو کر آ گیا ہوں۔" عزیز نے رعب جماتے ہوئے کہا۔ "لو! میں بھی چند منٹوں میں تیار ہو کر آتا ہوں۔" احمد نے کپڑوں کو تہہ کرتے ہوئے کہا۔ پھر بن سنور کر دونوں دوست شادی ہال میں پہنچے تو پتہ چلا کہ بارات نہیں آئی ہے۔

"ہم لوگ کچھ زیادہ ہی جلدی نہیں پہنچ گئے......!!" عزیز نے کہا تو احمد نے ہاں میں ہاں ملائی۔ انہوں نے ہال کے منتظم سے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ بارات کے آنے میں ابھی پورے دو گھنٹے ہیں۔

"دو گھنٹے ہم لوگ کس طرح گزاریں گے؟"

"تمہیں بھوک لگ رہی ہے کیا؟" احمد نے پوچھا۔

"نہیں بھئی! کھانا تو میں گھر سے تھوڑا بہت کھا کر آیا تھا...... مجھے معلوم ہے دعوتوں میں کھانا ہمیشہ دیر سے ہی شروع ہوتا ہے۔" عزیز نے کہا۔

"میں نے بھی تھوڑا بہت کھا لیا تھا مجھے کچھ کچھ بھوک لگ رہی ہے پر......" احمد کی یہ بات سن کر عزیز بولا۔ "اس خالی ہال میں بیٹھ کر کیا کریں گے آؤ! باہر چلتے ہیں۔ وقت گزاری کے لئے ایک شرارت میرے ذہن میں آئی ہے۔"

"کیسی شرارت؟" احمد نے پوچھا۔

"وہی...... شرارت نمبر نو!"

"اوہ! گڈ آئیڈیا...... اب تو مجھے باقاعدہ بھوک لگنے لگی ہے!!" احمد خوشی سے چلایا۔

دونوں دوست ہال سے باہر نکل گئے اور ٹہلتے ٹہلتے دوسرے شادی ہالوں کا جائزہ لینے لگے۔ ایک ہال میں کھانا شروع ہو چکا تھا۔ وہ دونوں اسی ہال میں چلے گئے اور کھانوں پر ہاتھ صاف کرنے لگے کچھ لوگ دولہا میاں کے پاس کھڑے ہاتھ ملا رہے تھے اور "بتن میاں! مُبارک ہو...... شادی مُبارک ہو" جیسے الفاظ دہرا رہے تھے۔ بتن میاں بانسری کی طرح دُبلے پتلے تھے۔

"آؤ! ہم بھی بتن میاں کو شادی کی مبارک

دے دیں۔" عزیز نے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد منہ پونچھتے ہوئے کہا پھر احمد اور وہ ببن میاں کے پاس پہنچ گئے۔

"ببن بھائی! شادی مبارک ہو....." عزیز نے نہایت گرم جوشی سے ببن میاں سے اس طرح ہاتھ ملایا جیسے وہ ببن میاں کا کوئی قریبی عزیز ہو۔

"بھئی! کھانے کا تو جواب نہیں۔ اپنی شادی کا کھانا آپ نے بے حد لذیز بنوایا ہے۔" "بھئی! مزا آگیا ہے۔" احمد نے بھی مکھن لگایا۔

"شادی کا کھانا؟" ببن میاں یہ سن کر چونکے پھر احمد اور عزیز کے چہروں پر ناچتی ہوئی شرارت دیکھ کر جیسے سب کچھ سمجھ گئے۔ "آپ لوگوں نے کھیر کھائی؟"

"نہیں ببن میاں! دل نہیں چاہ رہا۔" عزیز نے شوخی سے کہا۔

"ارے! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ بغیر کھیر کھائے چلے جائیں....."

ببن میاں نے ادھر ادھر دیکھا پھر آواز لگائی۔

"شبن بھائی! ذرا ادھر تو آنا۔" ان کی آواز سن کر ایک موٹا سا کالا کلوٹا آدمی ان کے پاس چلا آیا۔ اسے دیکھ کر کوئی کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ ببن میاں کا بھائی ہو گا۔

"بھئی! یہ ہمارے قریبی عزیز ہیں۔ آپ انہیں دس نمبر والی کھیر تو کھلا دیں۔" ببن میاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو یہ دس نمبری ہیں۔" کالے کلوٹے آدمی نے مسکراتے ہوئے اپنے پیلے پیلے دانت باہر نکال دیئے۔

"چلئے! دس نمبر کی کھیر آپ کا انتظار کر رہی ہے۔"

شبن میاں نے انکساری سے کہا

وہ شبن میاں کے ساتھ کچھ ہی دور چلے ہوں گے کہ عزیز نے اچانک کہا۔ "شبن بھائی! ببن بھائی آپ کو آواز دے رہے ہیں جائیں پہلے ان کی بات تو سن لیجئے۔"

"تم لوگ یہیں ٹھہرو میں ابھی آیا۔" شبن میاں کرخت لہجے میں کہہ کر ببن میاں کی طرف لپک گئے تو عزیز نے جلدی سے احمد کا ہاتھ پکڑا اور اس کے کان میں بولا۔

"انہوں نے ہمیں پہچان لیا ہے۔ اس سے پہلے کہ خاص کھیر کھانے کو ملے ..... بھاگ چلو یہاں سے.....!!"

دونوں شریر دوست بڑی تیزی سے ہال سے باہر نکلے۔ پیچھے سے شبن میاں کی تیز آواز سنائی دی۔ "ارے دس نمبریو! دس نمبر کی کھیر تو کھاتے جاؤ۔"

عزیز نے بھاگتے بھاگتے مڑ کر شبن میاں کی طرف دیکھا اور ہنستے ہوئے زور سے کہا۔

"وہ ببن میاں عرف بانسری کو کھلا دیجئے۔ وہ زیادہ حقدار ہیں ..... کھیر کھا کر آپ کی طرح موٹے ہو جائیں گے!!"

سالہا سال سے مقبول
آپ کی اپنی ٹپال چائے

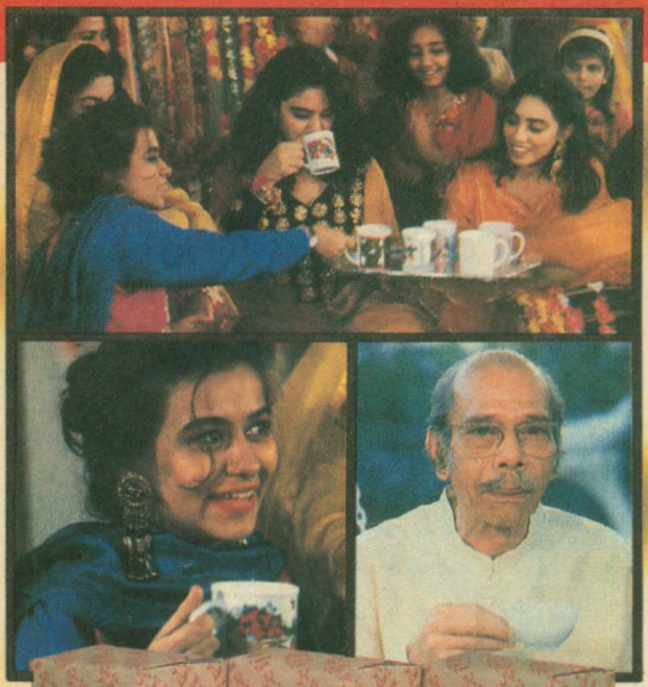

یہی ہے بس، ایک مزے کی پیالی

مینا بازار

نذیر انبالوی

اسکول کی پرنسپل جونہی اپنے آفس پہنچیں، فون کی گھنٹی بجی۔ پرنسپل صاحبہ ریسیور اٹھا کر بولیں۔

"میں پرنسپل نگہت بول رہی ہوں۔"

دوسری طرف سے جواب ملا۔ "میں نے آپ کو ایک ضروری اطلاع دینے کے لئے فون کیا ہے۔"

"کہو! ضروری اطلاع کیا ہے؟" پرنسپل جھٹ بولیں۔

تھوڑی دیر بعد آواز آئی۔ "مس! آج آپ کے اسکول میں مینا بازار ہے نا۔"

"ہاں ہے مگر تمہیں اس سے کیا مطلب؟" — پرنسپل ذرا تیز لہجے میں بولیں۔

"وہ دراصل بات یہ ہے کہ آپ مینا بازار کا پروگرام ملتوی کر دیں ایسا کرنے سے کئی معصوم بچوں کی جانیں بچائی جا سکتی ہیں۔"

یہ سن کر پرنسپل نے کہا۔ "کیا مطلب ہے تمہارا — مینا بازار کا بچوں کی جانوں سے کیا تعلق — تم ذرا کھل کر بات کرو — اصل معاملہ کیا ہے؟"

"اگر آپ نے مینا بازار کا پروگرام ملتوی نہ کیا تو کئی بچے بم کے دھماکے سے مارے جائیں گے۔"

"بم کا دھماکہ — کیا اسکول میں بم رکھا گیا ہے — تمہیں یہ سب کچھ کس نے بتایا ہے؟"

"میں نے دو مشکوک آدمیوں کو آپس میں باتیں کرتے ہوئے سنا تھا وہ کہہ رہے تھے کہ آج دن کے گیارہ بجے اسٹار اسکول میں بم کا دھماکہ ہو گا اور ہر بچے کی موت پر انہیں بیس ہزار روپے ملیں گے۔ آپ ہی بتایئے کیا انسانی جان کی قیمت صرف بیس ہزار روپے ہے۔ آپ آج کا پروگرام ملتوی کر دیں۔"

پرنسپل صاحبہ اس ہمدرد سے مزید معلومات حاصل کرنا چاہتی تھیں مگر اس نے فون بند کر دیا تھا۔ اس فون کے آنے پر پرنسپل صاحبہ کی عجیب حالت تھی۔ انہوں نے مینا بازار کی خوب تیاریاں کر رکھی تھیں اور ایک وزیر کو مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو کیا تھا۔ پرنسپل صاحبہ نے فوراً مقامی پولیس اسٹیشن کو بم کی اطلاع دی اور ساتھ ہی اسکول کے تمام عملہ کو حکم دیا کہ وہ عمارت سے باہر چلا جائے۔ چند لمحے بعد ہی سب لوگ اسکول کی عمارت کے باہر کھڑے تھے۔ تھوڑی دیر میں انسپکٹر حیدر چند سپاہیوں اور بم ڈسپوزل عملہ کے ساتھ وہاں پہنچ چکے تھے۔ انسپکٹر حیدر نے مس نگہت سے پوچھا۔

"آپ کو کس نے بتایا ہے کہ کہ اسکول کی عمارت میں بم رکھا گیا ہے؟"

پرنسپل صاحبہ نے اس کے جواب میں تھوڑی دیر قبل آنے والے فون کے بارے میں تفصیل سے بتایا تو انسپکٹر حیدر بولے۔

"ہو سکتا ہے کہ کسی بچے نے محض شرارت کی ہو۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ فون پر اس طرح کی اطلاع دے کر دوسروں کو پریشان کیا جاتا ہے۔"

پرنسپل صاحبہ بولیں "میرا خیال ہے یہ بات درست ہے کہ اسکول میں بچوں کو ہلاک کرنے کے لئے بم نصب کیا گیا ہے۔ آپ اپنے عملہ کے ساتھ اچھی طرح اسکول کی تلاشی لے لیں۔"

بم ڈسپوزل کے عملہ نے اسکول کی عمارت کے چپہ چپہ کی تلاشی لی مگر انہیں کسی جگہ بھی بم نہ ملا۔ انسپکٹر حیدر نے کہا۔

"مس نگہت! آپ اطمینان رکھیں اسکول میں بم نہیں ہے — آپ کے ساتھ شرارت ہوئی ہے۔"

وہ انہی باتوں میں مصروف تھے کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ پرنسپل صاحبہ نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے آواز آئی۔

"کیا بم ڈسپوزل کا عملہ اسکول پہنچ چکا ہے — ابھی تھوڑی دیر میں بم بھی مل جائے گا۔"

"بکواس بند کرو تمہیں ایسی بے ہودہ شرارت کرتے ہوئے شرم نہیں آئی ۔۔۔ تمہیں علم ہے تمہاری یہ شرارت تمہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے لے جا سکتی ہے" ۔۔۔ پرنسپل غرائیں۔

"میری اطلاع درست ہے۔ آپ بم ڈسپوزل ٹیم سے پوچھئے کہ انہوں نے پانی کی ٹنکی کی تلاشی لی ہے یا نہیں" ۔۔۔ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ بم تلاش کرنے والی ٹیم نے اسکول کی چھت پر بنی ہوئی پانی والی ٹنکی کی تلاشی نہیں لی تھی۔ فوراً یہ لوگ چھت پر پہنچے اور ٹنکی کا ڈھکن اٹھا کر بم تلاش کرنے لگے مگر بم وہاں ہوتا تو ملتا۔

غرض اسی طرح خاصا وقت ضائع ہو گیا تھا۔ گیارہ بجے کے قریب مہمان خصوصی بھی اسکول پہنچ چکے تھے۔ انہیں جب تمام صورتِ حال کا علم ہوا تو انہوں نے پرنسپل صاحبہ سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"میں ایسی صورت میں مینا بازار میں شرکت نہیں کر سکتا۔"

پرنسپل صاحبہ بولیں "ملک صاحب! آپ اطمینان رکھئے ..... بم والی خبر محض شرارت ہے۔"

مہمان خصوصی نے کہا "محترمہ! مجھے افسوس ہے کہ میں یہاں زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکتا۔"

پرنسپل صاحبہ نے ملک صاحب کے جانے کے بعد فیصلہ کیا کہ مینا بازار ملتوی کر دیا جائے۔ انہیں رہ رہ کر اس نامعلوم بچے پر غصہ آ رہا تھا جس کی شرارت کے باعث ان کا اچھا بھلا پروگرام خراب ہو گیا تھا۔

سب کو رخصت کرنے کے بعد وہ خود بھی واپس جانے کے بارے میں سوچ رہی تھیں کہ فون کی گھنٹی پھر بجی۔ حسبِ سابقہ اسی بچے کا فون تھا جس نے بم کی اطلاع دی تھی۔ اس کی آواز سن کر پرنسپل تلخ لہجے میں بولیں۔

"تم نے صبح سے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے مجھے تمہارا سراغ مل گیا تو تمہیں سخت سزا دوں گی تمہاری شرارت سے ہمارا مینا بازار ملتوی ہو گیا ہے۔"

یہ سن کر بچہ جھٹ بولا۔ "کیا واقعی آپ نے مینا بازار ملتوی کر دیا ہے۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے اس کا مطلب ہے میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں۔"

"کیسا مقصد ۔۔۔ کیسی کامیابی" ۔۔۔ پرنسپل صاحبہ نے حیرت کا اظہار کیا۔

بچے نے جواب دیا "مس! میں آپ کے اسکول کا طالب علم ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ میرا ایک دوست بہت غریب ہے جب آپ نے مینا بازار لگانے کا اعلان کیا تو وہ اداس سا ہو گیا تھا میں نے اس سے اداسی کی وجہ پوچھی تو وہ بولا میں مینا بازار میں شرکت نہیں کر سکوں گا کیونکہ نہ تو میرے پاس کپڑے ہیں اور نہ ہی پیسے۔ میں نے یہ جان کر اپنے دوست کی مدد کرنا چاہی مگر وہ خود دار ہے اس لئے میری مدد قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ تب میں نے فیصلہ کیا کہ میں ہر حال میں مینا

بازار ملتوی کراؤں گا۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں مس۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجئے گا۔"

پرنسپل صاحبہ بولیں "مجھے خوشی ہے کہ تم نے اپنے دوست کے لئے یہ شرارت کی مگر تم نے نیک کام کرنے کے لئے بھی غلط راستہ اپنایا ہے اگر تم اس شرارت کی بجائے مجھ سے براہِ راست بات کرتے تو میں اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکال سکتی تھی۔"

بچہ بولا "مس میں آئندہ اچھے کاموں کے لئے اچھا راستہ ہی استعمال کروں گا۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا نام بتائے بغیر فوراً فون بند کر دیا اور پرنسپل صاحبہ حیرت سے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریسیور کو تکتی رہ گئیں۔

ہمیں بھی بتائیے آج کے تازہ خبر کیا ہے؟

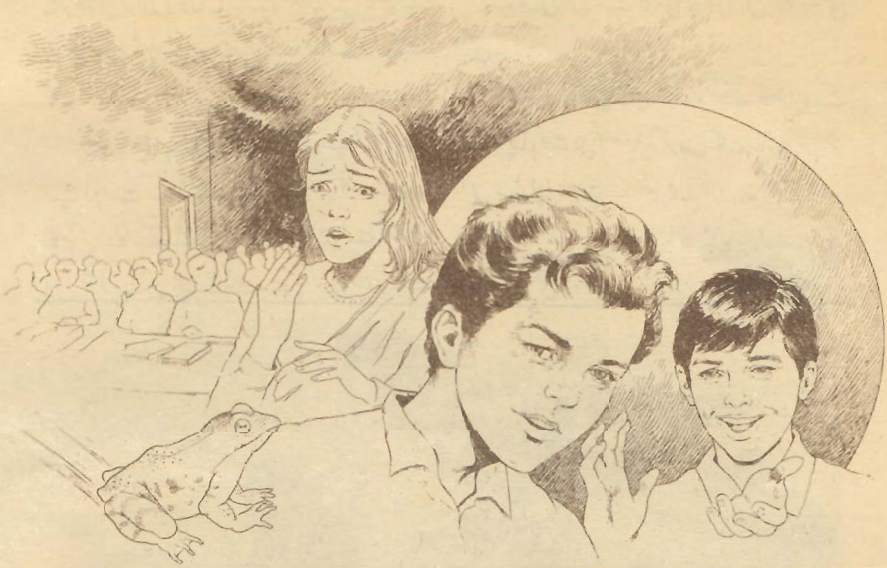

ٹوبہ ٹوبہ

حافظ محمد سلیم

ذیشان آج اداس بیٹھا تھا۔ اسے آج کوئی شرارت نہیں سوجھ رہی تھی۔ شرارت تو اس کا من پسند مشغلہ تھا۔ جب تک وہ کوئی شرارت نہ کر لیتا اداس اور بے چین رہتا۔ اچانک وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ اس کے ذہن میں ایک انوکھی قسم کی شرارت آئی تھی۔ پھر وہ جلدی سے اپنے دوست زاہد کی طرف چل پڑا۔ کیونکہ اس کے بغیر اس کی ہر شرارت نامکمل تھی۔ دونوں مل کر ہی شرارتیں کرتے تھے۔ زاہد، ذیشان کو گھر سے باہر دروازے پر ہی مل گیا۔

"ہیلو ذیشان! کیسے آنا ہوا؟"

ذیشان کو دیکھ کر زاہد خوشی سے بولا۔

"بس یار! ایک زبردست قسم کی شرارت سوجھی ہے ایمان سے مزہ آجائے گا۔" ذیشان نے آنے کا مقصد بتایا۔

"اچھا! مجھے بھی بتاؤ کیسی شرارت ہے؟"

زاہد نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"بتاتا ہوں! بتاتا ہوں! ذرا کان تو ادھر کرو۔"

پھر ذیشان نے ساری شرارت زاہد کے کان میں کہہ دی۔

"واہ! یار! واہ بڑی اعلیٰ قسم کی شرارت ہے۔ شرارت سوچنے میں تمہارا بھی جواب نہیں ہے۔"

زاہد نے کہا۔

"اچھا! تو پھر تم تیار ہونا؟"

ذیشان نے زاہد سے پوچھا۔

"کیوں نہیں! میں بھلا پیچھے رہنے والا ہوں۔"

زاہد نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو پھر کل اسکول میں ملیں گے، شرارت کے ساتھ ہاہاہا!!"

ذیشان نے قہقہہ لگایا اور گھر کی طرف چل پڑا۔

اگلے دن اسکول میں دونوں دوست بڑے خوش دکھائی دے رہے تھے۔ ان کو آدھی چھٹی کے وقت کا انتظار تھا۔ کیونکہ ان کو اسی وقت اپنی شرارت پر عمل کرنا تھا۔ اللہ اللہ کر کے تفریح کا وقت آیا۔ سارے لڑکے اسکول کے میدان میں چلے گئے۔ ان میں ذیشان اور زاہد بھی تھے۔ مگر وہ تھوڑی دیر بعد واپس کلاس روم میں آگئے۔

اور جلدی جلدی تمام لڑکوں کی چیزیں بدلنے لگے۔ مزمل کا قلم حامد کے بستے میں تو حامد کی کتاب دانیال کے بستے میں۔ انہوں نے اپنی کتابیں بھی ایک دوسرے کے ساتھ تبدیل کر لیں تاکہ کوئی ان پر شک نہ کرے اچانک ذیشان بولا۔

"یہ تم نے چپ چپ کیا لگا رکھی ہے۔"

"یار! چیونگم چبا رہا ہوں۔"

زاہد نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"یار! اس کو کہیں ٹھکانے لگاؤ کہیں کوئی اس کی چپ چپ نہ سن لے ایسا کرو کہ اسے مدثر کے ڈیسک پر لگا دو جب وہ اس پر بیٹھے گا تو دیکھنا کتنا مزہ آئے گا۔"

ذیشان نے دورانِ شرارت ایک اور شرارت بتا دی۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔"

زاہد نے ذیشان کی بات مانتے ہوئے چیونگم مدثر کے ڈیسک پر چپکا دی۔ اس کام سے فارغ ہو کر ذیشان اور زاہد دوبارہ کھیل کے میدان میں پہنچ گئے۔ آدھی چھٹی کے بعد مس فوزیہ اپنا پیریڈ لینے آئیں اور سب لڑکوں کو کتابیں نکالنے کے لئے کہا۔ جب لڑکے اپنے بستوں سے کتابیں نکالنے لگے تو سب پریشان ہو گئے، کسی کی کاپی غائب تھی تو کسی کی کتاب، کسی کا قلم کسی کے بستے میں تھا اور کسی کی کتاب کسی کے بستے میں۔

زاہد اور ذیشان بھی بظاہر پریشان لگ رہے تھے۔ مگر وہ دل ہی دل میں بہت خوش ہو رہے تھے سب سے پہلے مزمل اٹھا اور بولا۔

ایک شرارتی بچے کا انٹرویو

محمد افضل ساگر مچھوی

آنکھ مچولی کے شرارت نمبر کے لئے میں نے ایک شرارتی بچے کا انٹرویو لیا۔ لیکن یہ انٹرویو ادھورا رہا۔

ہوا یوں کہ میں نے شرارتی بچے سے فون پر ملاقات کا وقت طے کیا۔ اور پھر وقت مقررہ پر اس کے گھر گیا۔

سامنے کرسی پر شرارتی بچہ بیٹھا تھا۔ دوسری کرسی خالی تھی۔ اور اس پر ایک سفید سی چادر بچھی ہوئی تھی۔ "افضل صاحب! آیئے بیٹھئے۔" شرارتی بچے نے جب مجھے صاحب کہا تو میری گردن ذرا سی اکڑ گئی۔ اور میں اسی پوز میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ "کڑ کڑ کڑ" یہ کیا۔ جیسے ہی میں بیٹھا مجھے یوں محسوس ہوا کہ چادر کے نیچے کوئی چیز تھی جو میرے بیٹھنے پر ٹوٹ گئی۔ میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ جونہی میں نے کرسی پر سے چادر اٹھائی نیچے دو انڈے ٹوٹے ہوئے پڑے تھے۔

"آپ اپنے ہی انڈے توڑتے ہیں۔" اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا۔ قہقہوں کی آواز آئی۔ دیکھا کہ دروازے پر کئی شرارتی بچے کھڑے تھے اور مجھے وہاں سے بھاگتے ہی بنی۔

تھے۔

"اچھا تو یہ سب کارنامے ذیشان اور زاہد کے ہیں۔"

مس فوزیہ نے ان کو زیادہ خوش ہوتے دیکھ کر پہچان لیا۔ اب وہ آگے بول نہ سکے۔

"کھڑے ہو جاؤ تم دونوں، آج تمہاری سزا یہ ہے کہ تم دونوں اسکول کے لان کی تمام کیاریوں کو نرم کرو گے چلو..... اور کیاریاں نرم کرو۔" مس فوزیہ نے غصے سے ان کو سزا دیتے ہوئے حکم دیا۔ اور دونوں خاموشی سے لان کی طرف چل پڑے

"ہاہاہا مزہ آگیا۔"

ذیشان نے کلاس روم سے باہر نکلتے ہی قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"مس دیکھیں! کسی نے میرا قلم اٹھا لیا ہے۔"

"مس میری بھی کتاب غائب ہے۔"

یہ دانیال کی آواز تھی۔

مس میرے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ حامد کی آواز آئی "اوہو! یہ کس کی شرارت ہے؟ مدثر تم بتاؤ یہ حرکت کس نے کی ہے؟" مس فوزیہ نے جھنجھلا کر مدثر سے پوچھا کیونکہ وہ کلاس مانیٹر تھا۔ مدثر نے اٹھنے کی کوشش کی مگر وہ اٹھ نہ سکا۔

ہاں یار! مزا تو بڑا آیا۔ بے چارے مدثر کی تو قمیض پھٹ گئی۔ اور اب اس سزا کا کیا کرنا چاہئے؟"

زاہد نے ذیشان سے پوچھا۔

کیونکہ چیونگم اس کے کپڑوں سے چپک گئی تھی۔ اس نے اٹھنے کے لئے زیادہ زور لگایا تو اس کی قمیض پھٹ گئی۔ جسے دیکھ کر پوری کلاس قہقہے لگانے لگی ان میں ذیشان اور زاہد کے قہقہے سب سے بلند

"دیکھا جائے گا سزا کو بھی۔"

ذیشان کو جیسے سزا کی کوئی پروا نہ تھی۔ پھر وہ لان میں کیاریوں کو نرم کرنے کی بجائے آرام سے لیٹ گئے۔

ٹر..... ٹر..... ٹر..... ٹر

"آہا! کتنی پیاری موسیقی ہے۔"

زاہد نے مینڈک کی آواز سن کر مسکراتے ہوئے کہا۔

اچھا! پھر کیوں نہ ساری کلاس کو یہ موسیقی سنائی جائے۔

ذیشان کو ابھی تک شرارتیں ہی سوجھ رہی تھیں

"اچھا! تو پھر پکڑو اس کو۔"

زاہد نے کہا اور دونوں مینڈک پکڑ کر پلاسٹک کے لفافے میں بند کر کے پاس رکھ لئے۔ تھوڑی دیر بعد مس ادھر آئیں تو غصّے سے بولیں۔

"نالائقو! تم دونوں نے ابھی تک کوئی کیاری نرم نہیں کی چلو بھاگو کلاس میں تم تو کسی کام کے نہیں۔ نکمّے کہیں کے۔" اور دونوں خاموشی سے سر جھکائے مینڈک والی تھیلی پکڑ کر کلاس میں آ گئے۔

اب آخری پیریڈ باقی تھا۔ جب زاہد نے دیکھا کہ مس نسیم پیریڈ لینے کے لئے دروازے تک پہنچ چکی ہیں تو اس نے مینڈک آزاد کر دیا۔ پہلے تو مینڈکوں نے چکر لگا کر پوری کلاس کا معائنہ کیا۔ اور پھر اچھل اچھل کر ڈیسکوں پر چڑھنے لگے۔ لڑکوں

میں بھگدڑ مچ گئی ایک مینڈک ہوتا ہوتا مس کی کرسی تک پہنچ گیا۔ یہ مس اتفاقاً مینڈک سے بہت ڈرتی تھیں۔ جب انہوں نے مینڈک کو پاس دیکھا تو ڈر کے مارے ان کی چیخ نکل گئی اور دھڑام سے کرسی پر گر پڑیں۔ اور مینڈک میاں دوبارہ کلاس میں اپنے کرتب دکھانے لگے۔ آخر بڑی مشکل سے باہر کا رستہ لیا۔ چھٹی میں چند لمحے باقی تھے۔ جب مس نسیم کے ہوش ٹھکانے آئے تو غصّے سے بولیں:

"یہ کس لڑکے کی شرارت....."

ابھی مس نے اتنا جملہ ہی کہا تھا کہ چھٹی کی گھنٹی بج گئی۔ اور سب لڑکے شور مچاتے کلاس روم سے باہر جانے لگے۔ ذیشان اور زاہد بڑے خوش نظر آ رہے تھے۔ کیونکہ آج ان کی شرارتیں سو فیصد کامیاب رہی تھیں۔ اور وہ پٹائی سے بھی بچ گئے تھے۔

پلاسٹک کے شاپنگ بیگ

خوبصورت بھی اور باسہولت بھی

انہیں بار بار استعمال کیجئے

گھر کا سودا سلف لانے کے لیے

قیمتی کپڑوں اور سامان کی پیکنگ کے لیے

اور استعمال شدہ بیگ

کچرا اور کوڑا ڈسپوز آف کرنے کے لیے

نوٹ

استعمال شدہ بیگ بچوں کی پہنچ سے دُور رکھیے، یہ خطرناک بھی ہوسکتے ہیں اور آلودگی کا سبب بھی!
انہیں مناسب طریقے سے (جلاکر) ضائع کر دیجئے

مَنجانب

جملہ اقسام کی چھپی ہوئی تھیلیاں اور شاپنگ بیگ تیار کرنے والا معروف ادارہ

جیلانی انڈسٹریل کارپوریشن (پرائیویٹ) لمیٹڈ

F-312 سائٹ کراچی فون نمبر 295689-2561089 فیکس 2561044

شرارت کا بدلہ

محمد فاروق منیر

گھر میں ایک شرارتی ٹولہ بن چکا تھا۔ جس کا سرغنہ میرا چھوٹا بھائی احسن تھا اور اس کے سرگرم رکن میرے دو کزن وقار اور ساجد تھے جو ہمارے گھر میں گرمیوں کی چھٹیاں گزار رہے تھے۔ اب ان کا کام تھا نت نئی شرارتیں کرنا اور ہمارا کام تھا انہیں شرارتوں سے روکنا۔ لگے ہاتھوں ایک شرارت انہوں نے میرے ساتھ بھی کر دی۔

میں فریج میں سے پانی نکال کر پی رہا تھا کہ اچانک احسن نے میرے کان میں کچھ کہنا چاہا۔ میں گھبرا کر اس خیال سے پیچھے ہو گیا کہ کہیں وہ میرے کان میں زور سے "ککڑوں کوں" نہ کہہ دے۔ میں نے اس سے پوچھا "کیوں میاں شیطان! کیا ارادے ہیں؟!!

"فاروق بھیا..... بات دراصل یہ ہے کہ ساجد کو راستے میں گرا ہوا سو کا نوٹ ملا ہے۔" احسن نے راز دارانہ انداز میں کہا "اچھا..... تو اب تم شرارتوں کے ساتھ ساتھ گپیں بھی ہانکنے لگے ہو۔" میں نے حیرت سے جواب دیا۔

"نہیں بھیا جی! یہ گپ نہیں ہے۔ یہ دیکھیں۔" ساجد نے سو کا لال نوٹ فضا میں لہرایا۔ اس کے ساتھ وقار بھی تھا۔ یہ دونوں اچانک دروازے سے نمودار ہوئے تھے۔

"نہیں ساجد..... اس طرح نہیں۔ میں اسے اپنے ہاتھوں میں لے کر دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"جی نہیں!! آپ اسے واپس نہیں کریں گے۔"

"اب ایسی بھی کیا بے اعتباری۔" میں نے کہا۔

"وقار بولا۔ "جو آپ چاہتے ہیں وہ نہیں ہو سکتا۔"

"اچھا ایک بات تو بتاؤ۔ تم نے اس نوٹ کے مالک کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔"

میں نے ان سے پوچھا۔

"کئی لوگوں سے پوچھا تھا مگر کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ لہٰذا اب یہ نوٹ ہمارا ہے اور ہم اس سے کچھ کھانے پینے جارہے ہیں۔" انہوں نے گویا اعلان کیا اور باہر کی طرف چل پڑے۔

"ارے..... ارے..... میری بات تو سنو۔"

لیکن وہ میری آواز کو سنی ان سنی کر کے گھر سے باہر نکل گئے۔ میں سارے معاملے کی حقیقت جاننا چاہتا تھا چنانچہ میں بھی ان کے پیچھے گیا۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر دوڑ لگادی۔ اب تو میرے سسپنس میں اور اضافہ ہو چکا تھا چنانچہ میں بھی ان کے پیچھے دوڑا لیکن وہ ایک گلی میں مڑ کر یوں غائب ہو گئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ میں ان کی تلاش میں ادھر ادھر گھومتا ہوا گھر واپس آیا تو وہ تینوں مجھے گھر میں داخل ہوتے دکھائی دیئے۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بھاگ کر ساجد کو دبوچ لیا کیونکہ نوٹ اسی کی جیب میں تھا۔ احسن اور وقار مجھ سے چمٹ گئے تاکہ میں جیب سے نوٹ نہ نکال سکوں لیکن میں نے انہیں پچھاڑ کر نوٹ باہر نکال ہی لیا اس کے ساتھ ہی مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

کیونکہ وہ سو کا لال نوٹ نقلی تھا۔ میں نے ایک خونخوار نظر ان پر ڈالی اور پوچھا "تم نے یہ ڈرامہ کیوں کیا؟

"آپ ہمیں تنگ جو کرتے تھے۔" انہوں نے پٹ سے جواب دیا۔

"ارے واہ..... گویا شرارتوں سے روکنا تمہیں تنگ کرنا ہو گیا۔ ٹھہر جاؤ شیطانو! ابھی مزہ چکھاتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں انہیں پکڑنے کے لئے آگے بڑھا لیکن وہ تینوں دائیں بائیں سے نکل گئے اور میں لکیر پیٹتا ہی رہ گیا۔

کوئی بات نہیں بچو! میں بھی تمہیں تمہارے ہی انداز میں جواب دوں گا۔ میں نے پکا ارادہ کر لیا۔

اگلے ہی روز میں دروازے کے پیچھے چھپا ہوا تھا اور وہ تینوں کمرے میں بیٹھے لوڈو کھیل رہے تھے۔ ادھر میں نے اپنا کام کیا اور ادھر ان میں بھگدڑ مچ گئی۔ وہ چلاتے ہوئے دروازے کی طرف بھاگے اور آ کے مجھ سے ٹکرا گئے۔ "خیریت تو ہے۔ تم لوگ اس قدر بوکھلائے ہوئے کیوں ہو۔" ان میں سے پوچھا۔

"وہ..... وہ..... فاروق بھیا..... ہم لوڈو کھیل رہے تھے کہ اچانک چھت پر سے ایک چھپ..... چھپ..... چھپکلی سیدھی میرے سر کے اوپر آ کر گری۔ میں نے گھبرا کر اسے اچھال دیا اور چھپکلی ساجد اور احسن پہ جا گری، ان دونوں کی بھی جان نکل گئی۔" وقار نے سانس درست کرتے ہوئے کہا اور اس کے بعد تینوں یہ جا..... اور وہ جا.....

دراصل وہ تینوں چھپکلی سے بہت ڈرتے تھے۔ میں ہنستا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور چھت سے گرنے والا چھپکلی کو ہاتھوں میں اٹھالیا۔ ربڑ کی بنی ہوئی چھپکلی پہلی نظر میں بالکل اصلی معلوم ہو رہی تھی۔

میں شرارت نہیں کرتا

شیخ محمد عاکف حمید

نام تو اس کا سلیمان تھا۔ لیکن اس کی شرارتوں کی وجہ سے ہم سب اسے شرارت مآب کہتے تھے۔ محفل کتنی ہی سنجیدہ کیوں نہ ہوتی لیکن وہ چپکا نہیں بیٹھ سکتا تھا ہر وقت ایسی حرکتیں کرتا کہ بے اختیار ہنسی آجاتی۔

سلیمان ہمارے پڑوس والی آنٹی کا چھوٹا بیٹا تھا وہ مجھے ماما کہا کرتا تھا۔ یہ لوگ ہمارے پڑوس میں رہتے تھے۔ ایک ہی دیوار تھی اور اس میں بھی کھڑکی لگی ہوئی تھی۔

ایک دن شرارت مآب کھڑکی کے ذریعے دیوار پر چڑھ گیا اور چیخنے لگا "ماما! دیکھو میں آپ سے بھی بڑا ہو گیا ہوں۔" میں جو امتحان کی تیاری میں مشغول تھا اس بے وقت کے شور سے غصے میں آگیا اور تیزی سے باہر آنگن میں آیا۔ "کمو کیا بات ہے؟" میں نے زور سے کہا لیکن الفاظ حلق میں پھنس کر رہ گئے۔ یہ دیکھ کر میں خوف زدہ ہو گیا کہ سلیمان پتلی سی دیوار پر اس طرح کھڑا ہے کہ ذرا سا بھی توازن بگڑا..... تو وہ نیچے آگرے گا۔ شور سن کر اس کی امی گھبرا گئیں اور چیخ کو بولیں "بیٹا! جلدی سے نیچے اترو ورنہ گر جاؤ گے۔" لیکن سلیمان مسکراتے ہوئے بولا۔ "امی! میں اس وقت اتروں گا جب آپ لوگ مجھے سب سے بڑا مان لیں گے۔" اس کی امی تیزی سے بولیں "ہاں بیٹا ہاں! تم سب سے بڑے ہو چلو جلدی سے نیچے اترو" لیکن وہ شوخی سے بولا "باقی سب لوگ بھی مانیں تب اتروں گا۔" اس کا اشارہ میری طرف تھا۔ مجھے بھی کہنا پڑا۔ لیکن میں اس خطرناک

شرارت پر دل ہی دل میں ڈر رہا تھا۔

دوسرے دن وہ میرے پاس آیا اور صوفے پر بڑے رعب سے بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ماما! بدولت کو جلدی سے شربت کا گلاس پیش کیا جائے۔"

"کیا بکواس ہے؟" میں نے کہا۔

"بکواس نہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ کل ہی مجھے اپنا بڑا مان چکے ہیں۔" میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "وہ تو تم نے شرارت سے ایسا کہلوایا تھا۔"

"کیا کہا ..... شرارت؟" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "میں شرارت نہیں کرتا۔" اور میں اسے گھورنے لگا۔

ایک دفعہ میرا ایک دوست دوبئی سے آیا ہوا تھا۔ شرارت مآب اس کے ساتھ لاہور سیر کو گئے۔ ایک دکان پر میرے دوست نے کچھ سودا خریدا سودا خریدتے خریدتے اس نے شرارت مآب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا!

"بھئی یہ سوئیٹر اونی معلوم ہوتا ہے مگر اس پر لیبل "سوتی" کا لگا ہوا ہے ایسا کیوں ہے؟"

شرارت مآب نے جماہی لیتے ہوئے جواب دیا۔ "بھائی جان! ہے تو یہ خالص اونی مگر آپ جانتے ہیں ہمارے ملک میں کس قدر کپڑا کھانے والے کیڑے ہیں۔ انہیں دھوکا دینے کے لئے دکاندار نے "سوتی" کا لیبل لگا رکھا ہے۔" میرا دوست مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

کچھ دن سے سلیمان چُپ چُپ تھا۔

ایک دن میں جوتوں پر پالش کر رہا تھا۔ سلیمان آتے ہی بولا "ایک بات سنیں۔"

"ہاں کہو!"

"ہم لوگ یہاں سے جا رہے ہیں ابو کا لاہور تبادلہ ہو گیا ہے۔" اس نے ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

ان کے جانے کا ہم سب کو افسوس تھا۔

اسٹیشن پر وہ مجھ سے گلے لگ کر رویا۔ پھر اپنے بیگ سے ایک پیکٹ نکال کر دیتے ہوئے بولا۔

"ماما جانی! مجھے معاف کر دیجئے گا، میں نے آپ کو بہت تنگ کیا ہے۔ یہ میری طرف سے تحفہ ہے۔" ہم انہیں اسٹیشن چھوڑ کر گھر آئے تو سب چاہتے تھے کہ جلد معلوم ہو کہ پیکٹ میں کیا ہے۔ میں نے پیکٹ کھولا تو اس کے نیچے ایک اور پیکٹ تھا۔ اسے کھولا تو بھی ایک پیکٹ اور تھا۔ اس طرح بہت سے پیکٹ نکلتے رہے یہاں تک کہ ہم تنگ آ گئے۔ آخری پیکٹ میں منا سا ایک مڑا تڑا پرچہ تھا۔ میں نے غصّے سے اسے پھینک دیا۔ بھائی جان نے اٹھالیا اور پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا۔

پیارے ماما جان! مجھے معاف کر دیں اور ناراض نہ ہوں۔ میں نے آج تک جتنی حرکتیں کیں۔ ان سے کسی کو نقصان نہیں پہنچا۔ اس لئے میں یہی کہوں گا۔ کہ ..... "میں شرارت نہیں کرتا۔"

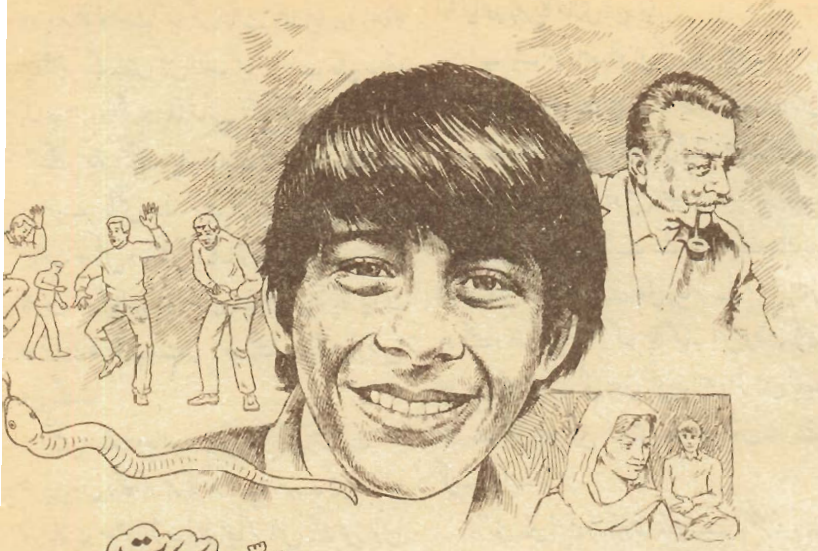

ابو جی کے کمالات

حمیرا ناز سرور

مجھے اپنے ابو سے بے حد پیار ہے۔ میرے ابو ہیں بھی بہت اچھے... ہمیشہ ہنسنے ہنسانے والے شرارتی سے..... جی ہاں جناب! ہمارے ابو شرارتی تھے..... بلکہ اب بھی ہیں اور جب وہ ہمیں اپنے بچپن کے واقعات سناتے ہیں نا! تو ہمارا ہنس ہنس کر برا حال ہو جاتا ہے۔

میرے ابو جان کا نام محمد سرور مرزا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ انہوں نے باقاعدگی سے نماز کس طرح شروع کی۔ دراصل میرے ابو جان اپنی خالہ کے گھر جہلم چھٹیاں گزارنے گئے ہوئے تھے۔ابو جان کے جو خالو تھے نا! وہ ریٹائرڈ میجر تھے اور بہت سخت قسم کے آدمی تھے۔ ایک دفعہ ہوا یوں کہ..... لیکن آپ یہ قصہ ابو ہی کی زبانی سنئے۔

رات کا وقت تھا۔میں بہت بور ہو رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں ایک ربڑ کا سانپ تھا۔ ہمارے خالو کی کوٹھی مرکزی سڑک کے کنارے تھی۔ مجھے شرارت جو سوجھی تو میں گیٹ کے پاس سانپ میں دھاگا باندھ کے کھڑا ہو گیا۔ اتفاق سے تھوڑی ہی دیر بعد سڑک پر سے تین چار انگریز گزرے۔ میں نے سانپ پہلے سڑک پر رکھ دیا تھا۔ جیسے ہی وہ انگریز قریب آئے میں نے دھاگے کو آہستہ آہستہ ہلانا شروع کر دیا بس سانپ ادھر ادھر رینگنے لگا۔ انگریز ڈر گئے اور ادھر ادھر ہو گئے۔ لیکن وہ جدھر جاتے میں سانپ کو ادھر سرکا دیتا۔ اچانک ایک انگریز کے پاؤں کے نیچے آ کر دھاگا ٹوٹ گیا.....

وہ دھاگا تو ٹوٹ گیا مگر سانپ والا بچا ہوا دھاگا پروفیسر کے پاؤں میں اٹک گیا..... اب حال یہ تھا کہ جدھر وہ انگریز جاتا سانپ پیچھے پیچھے..... وہ چیختا "مجھے بچاؤ، مجھے بچاؤ" اتنے میں اس کے ایک دوسرے ساتھی نے ہمت کر کے اپنی ایڑی سے سانپ کو کچل دیا لیکن دیکھا تو سانپ کچلنے کے بعد پھر ویسا ہو گیا اب جو انہوں نے غور کیا تو پتہ چلا کہ وہ تو ربڑ کا سانپ ہے..... وہ غصے سے قوس و قزح بن گئے۔

میں نے سوچا اب میری تو آ گئی شامت..... سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا اور اپنے کمرے میں آ گیا اور کچھ نہ سوجھا تو جانماز بچھا کر اس کے اوپر یوں بیٹھ گیا جیسے باوضو ہو کر نماز پڑھ رہا ہوں میں دعا مانگتا رہا۔

"یا اللہ بچانا۔"

چونکہ میں وہاں پہلے ہی شرارتی مشہور تھا۔ جب شور پڑا کہ حرکت کس کی ہے تو محلے والوں نے کہا کہ "ضرور یہ حرکت سرور کی ہے۔" چنانچہ انگریز شکایت لے کر میجر انکل کے پاس پہنچ گئے۔ انکل انہیں لے کر میرے کمرے میں داخل ہوئے اسی وقت میں نے سلام پھیرا۔ انکل یہ دیکھ کر الٹا ان پر برسے۔

"میرا بھانجا تو نماز پڑھ رہا ہے..... وہ یہ حرکت کیونکر کر سکتا ہے۔"

وہ لوگ شرمندہ ہو کر چلے گئے۔

بس پھر میں نے وضو کیا نماز پڑھی اللہ کا شکر ادا کیا اور پھر پکا نمازی بن گیا۔

اب ایک اور واقعہ ابو ہی کی زبانی سنئے۔

میرا ایک دوست پیر بنا ہوا تھا۔ ایک دن میں اس سے ملنے اس کی دکان پر گیا۔ علیک سلیک کے بعد باتیں شروع ہوئیں تھوڑی دیر بعد لوگ اس کے پاس تعویذ گنڈے کے لئے آنے لگے۔ اچانک اس کا بیٹا گھر سے کوئی پیغام لے کر آیا اور وہ مجھے دکان پر بٹھا کر گھر چلا گیا۔ اس وقت مجھے زوروں کی بھوک لگی ہوئی تھی۔ اسی اثنا میں ایک عورت آئی وہ سمجھی کہ میں ہی پیر ہوں۔ کہنے لگی۔

"پیر جی! میرا خاوند مجھ سے جھگڑتا رہتا ہے..... کہتا ہے کام میں دل نہیں لگتا تعویذ کرا لاؤ۔ آپ کا بڑا نام سنا ہے جی۔ مجھے کوئی تعویذ دے دیں نا جی۔"

مجھے ایک شرارت سوجھی میں بولا۔ "پہلے دو کلو آم لے کر آؤ لیکن آم ذرا بڑے بڑے ہوں۔"

وہ بے چاری جانے کہاں سے بڑے بڑے آم ڈھونڈ کر لائی۔ میں نے جی بھر کے کھائے اور پیٹ کی آگ بجھائی۔ وہ بولی۔

"اب تو کوئی تعویذ کر دیں پیر جی۔"

میں نے ایک پرچی لے کر اس پر کچھ لکھا اور اسے دے دیا اور بولا۔ "یہ پرچی اپنے شوہر کو کو دے کر کہنا کہ اسے سرہانے رکھ کر سو جائے۔ اور ہاں پرچی کھول کر نہ دیکھنا ورنہ تعویذ ضائع ہو

جائے گا ـــ دو دن بعد مجھے یہ تعویذ واپس کر جانا۔"

وہ چلی گئی کچھ دیر بعد میرا دوست آ گیا۔ میں نے اسے سارا واقعہ بتایا اس نے کہا "پرچی میں کیا لکھا تھا؟"

میں نے کہا۔ "جب وہ تعویذ واپس لائے گی نا تب دیکھنا۔"

خیر میں واپس آ گیا اور دو دن بعد پھر گیا دوست کی دکان پر۔ کچھ دیر بعد وہ عورت آئی اور مجھے تعویذ دیتے ہوئے بولی۔

"بڑا شکریہ جی! وہ اب بالکل ٹھیک ہو گیا ہے لڑنا بھی نہیں وہ شکریہ کہہ رہا تھا جی۔"

میں نے پوچھا۔ "تعویذ کھول کر تو نہیں دیکھا تھا نا!"

وہ بولی۔ "نہیں جی ..... اچھا جی اب میں چلتی ہوں۔"

وہ چلی گئی تو میرے دوست نے مجھ سے پرچی لے لی اور جب اس نے پرچی کو کھول کر پڑھا تو ہنس ہنس کر اس کا برا حال ہو گیا کیونکہ پرچی پہ لکھا تھا۔

"جو شخص بیوی سے لڑتا ہے وہ الو کا پٹھا ہے۔"

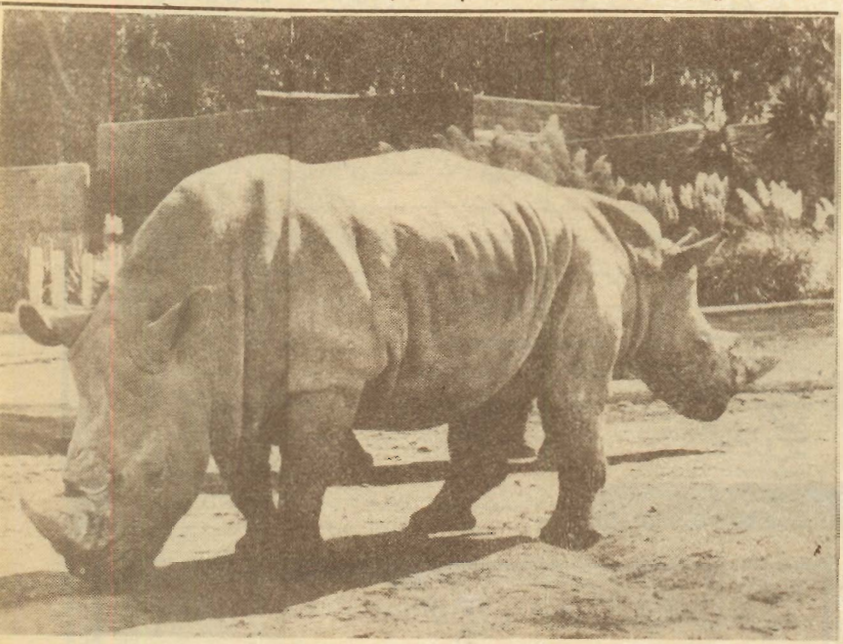

فوٹو گرافر کی شرارت

ان سے تعاون کیجیے ان پر اعتماد کیجیے

وطنِ عزیز کے قریے قریے
اور نگر نگر
ہر ماہ باقاعدگی سے
آنکھ مچولی
پہنچانے کے لیے ہم نے
ان اداروں
کو اپنا باقاعدہ
ایجنٹ
مقرر کیا
ہے

ادارہ	شہر	فون
محمد حسین برادرز	کراچی	۷۷۲۴۱۲۶
سلطان نیوز ایجنسی	لاھور	۵۸۲۴۹
ملک تاج محمد	راولپنڈی	۵۵۴۳۲
مہران نیوز ایجنسی	حیدرآباد	۲۰۱۲۸
افضل نیوز ایجنسی	پشاور	۶۲۵۱۵
اے ایس حامد نیوز سروس	مُلتان	۴۳۳۱۰
فیاض بک ڈپو	فیصل آباد	۲۷۴۰۶
ایم ایم ٹریڈرز	کوئٹہ	۷۵۰۰۲
اسلم نیوز ایجنسی	گوجرانوالہ	
سلمان برادرز	نوابشاہ	۲۴۱۴
سعید بک اسٹال	گجرات	۳۶۳۹
پاکستان اسٹینڈرڈ بک اسٹال	سرگودھا	۶۲۹۵۱
طاہر نیوز ایجنسی	جہلم	
کیپٹل نیوز ایجنسی	بہاولپور	۲۹۵۷
چوہدری امانت علی اینڈ سنز	رحیم یار خان	۷۲۶۲۶
مسلم بک ڈپو	سرائے عالمگیر	
رحمت بک اسٹال	اوکاڑہ	
رہبر نیوز ایجنسی	منڈی مدرسہ ضلع بہاول نگر	
ملک اینڈ سنز	سیالکوٹ	۸۷۹۸۹
سلطانی نیوز ایجنسی	چکوال	
مولا بخش نیوز ایجنسی	مہران مرکز سکھر	
خالد بک اسٹال	گجرات	۳۷۳۱
اسلامی نیوز ایجنسی	وہاڑی	۲۸۸۹

آنکھ مچولی
خریدنے کے لیے
اپنی تجاویز اور مشورں کیلیے

ان ناموں پر اعتماد کیجیے

خط وکتابت کے لیے ماہنامہ آنکھ مچولی، اے-پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

بلّی نے دیے بچّے
اللہ میاں سچّے

میمی نہایت معصوم سی بھولی بھالی بچّی تھی۔ سب ہی اسے پیار کرتے تھے۔ پچھلی سے پچھلی سالگرہ پہ انکل نے اسے تحفے میں ایک خوب صورت بلّی دی۔ میمی کو تو ایسی خوشی ہوئی جیسے اسے جنّت مل گئی ہو۔ موسمِ بہار آیا تو بلّی نے تین چھوٹے چھوٹے پیارے پیارے سے بچّے دیے۔ اب تو گھر میں اور بھی رونق ہوگئی۔ ایک دن کیا ہوا۔ بلّی اپنے بچّوں کے ساتھ باہر نکل گئی۔ میمی اس وقت کسی کام میں مصروف تھی۔ باہر کسی خونخوار کتّے نے حملہ کر دیا۔ بلّی اپنے بچّوں کی حفاظت کیلئے کتّے کے سامنے پہاڑ بن گئی۔ بچّے جان بچانے کیلئے بھاگے تو کھُلے ہوئے مین ہول میں گر گئے۔ جب شور مچا تو میمی باہر کی طرف بھاگی۔ محلّے کے لڑکوں نے پتھر مار کر کتّے کو بھگایا۔ میمی نے بلّی کے بچّوں کو مین ہول سے نکالا تو وہ گٹر کے گندے پانی میں شرابور تھے۔ میمی نے باتھ روم میں لے جا کر انہیں خوب اچھی طرح نہلایا دھلایا اور پھر بلّی کے بچّوں کو سوکھنے کے لیے الگنی پہ ٹانگ دیا۔ میمی نے ایسا کسی شرارت کی وجہ سے نہیں کیا۔ اصل میں بعض باتیں جو بھولپن میں کی جاتی ہیں وہ دیکھنے والوں کو شرارت محسوس ہوتی ہیں۔ تو بھئی شرارت کی ایک قسم ایسی بھی ہوتی ہے!

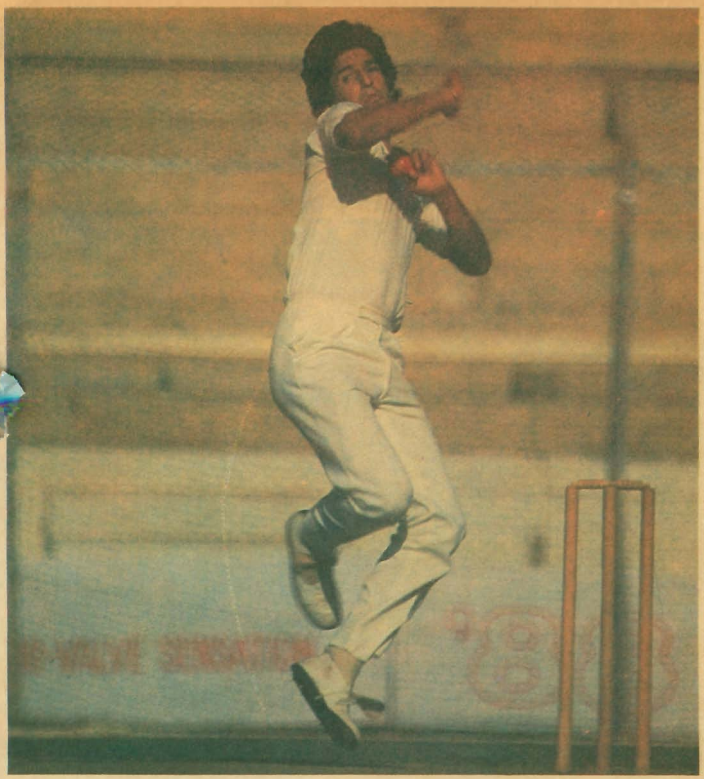

مہارت کی بلندی۔ پی آئی اے کی جستجو
اب فضائی حدود سے بڑھ کر

ہماری خوب سے خوب تر کی جستجو ہماری فضائی کارکردگی کے شعبوں سے لے کر کھیلوں کی دنیا تک وسیع ہے۔ ہم کھلاڑیوں کو تربیت دیکر ان کو عالمی چیمپین بننے میں مدد کرتے ہیں۔ اندرون ملک ہم ایسے ٹورنامنٹ کا انعقاد کرتے ہیں جہاں وہ اپنی مہارت کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہیں اور دنیا بھر میں ہر اس مقام تک پہنچاتے ہیں جہاں کھیلوں کے مقابلے منعقد ہو رہے ہوں۔

PIA
پاکستان انٹرنیشنل
باکمال لوگ۔ لاجواب پرواز

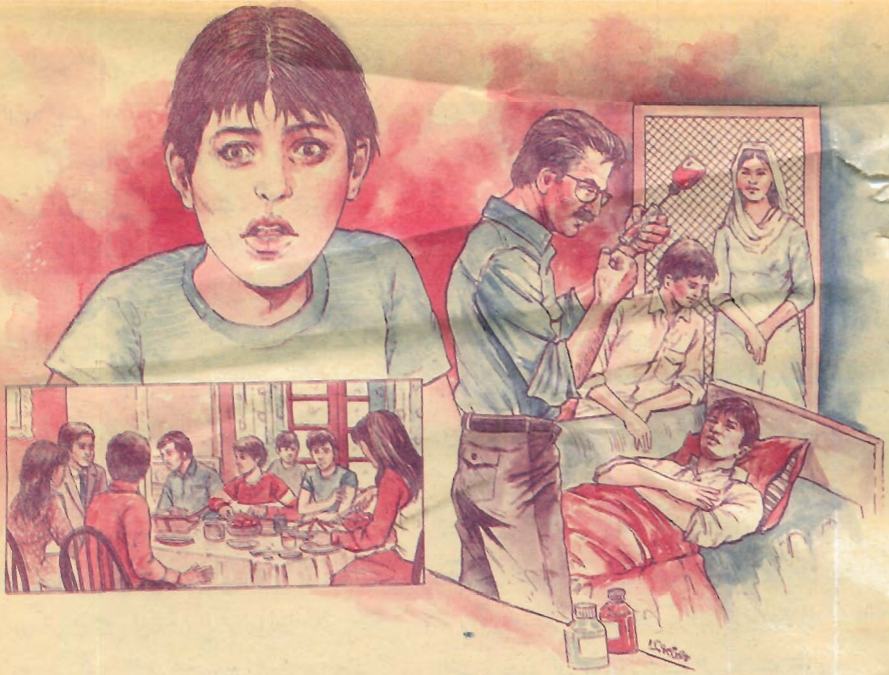

شرارت مہنگی پڑی

اطہر رضا اجنبی

آج صبح سے ہی گھر میں شور مچا ہوا تھا۔ قصہ یہ تھا کہ آج شام پانچ بجے حیدر آباد سے آفتاب ماموں اور غزل ممانی ہمارے ہاں پندرہ دن کے لئے آرہے تھے۔ ساتھ میں نانا جان اور نانی امی بھی تھیں۔ ماموں کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اور انہیں کراچی آنے کی دعوت ہماری امی اور ابا جان نے دی تھی اور آج وہ سب یہاں پہنچ رہے تھے۔ امی نے کل رات کو ہی حکم صادر فرما دیا تھا کہ ماموں کے آنے سے پہلے پہلے پورے گھر کی صفائی ہو جانا چاہئے۔ صفائی اور وہ بھی پورے گھر کی، یہ سن کر تو ہم سب بہن بھائیوں کے ہوش اڑ گئے تھے۔ ویسے بھی ہم سب "کام چوروں کے ٹولے" کے نام سے مشہور تھے۔ اب امی نے یہ حکم سنا دیا تھا کہ صبح جلدی اٹھ کر گھر کی صفائی ہوگی۔ صبح جلدی اٹھنا اور وہ بھی جنوری کے ٹھٹھرتے مہینے میں۔ ہمارے لئے ناممکن تھا۔ آخر

ار ایک منصوبہ بنایا اور صبح اس پر عمل کرنے کا
ادہ کیا۔

صبح جب امی نے ہم لوگوں کو اٹھایا تو پہلے تو ہم
ب اوں ہوں کرتے رہے۔ مگر جب منہ پر
ھنڈا پانی پڑا تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ اب منصوبے پر
مل در آمد کرنے کا وقت تھا۔ ہم نے ذوالقرنین
و اشارہ کیا اور وہ چیخنا شروع ہو گیا۔ ''ہائے امی
میرا پیٹ..... ہائے ہائے ہائے۔ بہت سخت مروڑ
ہو رہا ہے۔'' ذوالقرنین کے ساتھ ہی ثقلین بھی
شروع ہو گئے۔ ''اوئی اللہ! میری آنکھ۔ پھوٹ
ئی امی پھوٹ گئی۔ پتا نہیں کس نے کاٹ لیا۔''
ب ہماری باری تھی۔ ہم ایک دم بستر سے اٹھے
ور کمرے میں ناچنا شروع کر دیا اور ساتھ ساتھ
چلانے لگے۔ ''ہائے میرا پیر، ہائے میرا پیر۔''
ہمارے ساتھ ہی پری وش اور فن پارہ نے سردی
سے کانپنا شروع کر دیا۔ اچانک ہماری نظر امی کے
ہاتھ میں موجود وائپر پر پڑی تو ایک پل میں ہی
سب کے درد اور مروڑ پر لگا کر اڑ گئے۔ اب تو کوئی
چارہ نہ تھا۔ ہمارا منصوبہ فیل ہو گیا تھا۔ امی نے
حکم دیا کہ جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کرو
ور کام شروع کر دو۔ اب بیسن پر پہنچ کر ہم
سب لڑنے لگے کہ پہلے میں منہ دھوؤں گا پہلے
میں منہ دھوؤں گی مگر امی کے وائپر کا خیال آتے
ہی ہم سب شرافت کی جون میں آ گئے۔

ناشتہ کرنے کے بعد ہم سب اپنے اپنے
کاموں میں لگ گئے۔ ذوالقرنین اور ثقلین
سیڑھی پر چڑھے چھتیں صاف کر رہے تھے۔ پری
وش اور فن پارہ چھوٹی تھیں لہٰذا ان کے ذمے
کرسیاں وغیرہ صاف کرنے کا کام تھا۔ ہم کیاری
میں پودوں کی کانٹ چھانٹ میں لگے ہوئے تھے۔
رہ گئیں ہما باجی تو وہ ''پونچھا'' لگانے پر مامور
تھیں۔ ہم سب بھنائے ہوئے تھے۔ یہ بات بتانا تو
ہم بھول ہی گئے کہ ہما باجی، امی ابو کی لاڈلی تھیں
اور پورے گھر میں سب سے زیادہ ان ہی پر توجہ
دی جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ہم سب چھوٹے
بہن بھائی اپنا الگ گروپ بنا چکے تھے اور ہما باجی
الگ تھیں۔ ہما باجی کی وجہ سے اکثر ہم سب پر
جوتوں کی مہریں لگتی رہتی تھیں۔ وہ ہماری مخبری
کر دیتیں اور پھر ہم سب ہوتے اور امی ابا جان کی
ڈانٹ ڈپٹ۔ اور ہما باجی بڑے مزے سے ہمارا
تماشہ دیکھتیں۔ آج بھی ہما باجی نے اپنا داؤ چلا ہی
دیا۔ پانچ دس منٹ بعد ہی کمر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔
اور کراہنے لگیں۔ امی نے جو ہما باجی کی یہ حالت
دیکھی تو بھاگم بھاگ آئیں۔ انہیں بستر پر لٹایا اور
خاطر مدارات کرنے لگیں۔ فوراً ہم سے دودھ
منگوایا اور گرم کر کے ہما باجی کو پلا دیا۔ پھر آرڈر
ہوا کہ گھر میں پونچھا اطہر لگائے گا۔ ہم نے جو یہ
سنا تو سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ہم نے احتجاج کیا کہ یہ تو
لڑکیوں کا کام ہے۔ اگر ہما باجی نہیں کر رہی ہیں تو
امی آپ ہی کر لیجئے۔ یہ سننا تھا کہ امی آگ بگولہ
ہو گئیں اور ہمیں نافرمان، ناہنجار اور ناخلف کے
خطابات سے نوازنے لگیں۔ ہمارا احتجاج مسترد ہو

چکا تھا۔ اسی لئے اس سے پیشتر کہ ہمارا پوچھا لگتا ہم نے بالٹی سنبھالی اور زمین رگڑنا شروع کر دی۔

چار بجے تک تقریباً تمام کام مکمل ہو چکے تھے۔ ہم سب ہاتھ منہ دھو چکے تھے۔ امی، ابا جان اور ہما باجی اسٹیشن جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ہما باجی کو دیکھ دیکھ کر ہمیں غصہ آرہا تھا اور انتقام کا جذبہ ہمارے دل میں جوش ابھار رہا تھا۔ مگر کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ ماموں کے آنے تک ہم ترکیبیں سوچتے رہے مگر شاید ہمارے دماغ میں بھس بھرا ہوا تھا جس کا احساس ہمیں آج خود ہو رہا تھا کیونکہ کوئی ترکیب یا شرارت ذہن میں نہیں آرہی تھی کہ ہما باجی سے بدلہ لے سکیں۔ تقریباً چھ بجے ماموں غزل ممانی، نانی اور نانا جان گھر پہنچے۔ سب سے مل کر ہم اپنے دکھ درد بھول گئے اور باتوں میں مصروف ہو گئے۔ غزل ممانی کے لئے بالکل نیا ماحول تھا لہٰذا وہ ہم لوگوں سے اور ہم لوگ ان سے کھنچے کھنچے سے رہے۔

باتوں کے دوران ہی کئی بار چائے وغیرہ کا دور چلا۔ کراچی کے مختلف علاقوں کی سیر کے منصوبے بنے اور ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ کھانے کا وقت ہونے والا تھا۔ امی نے بہت مزے مزے کے کھانے بنائے تھے جن کی خوشبوئیں بھوک کو بڑھا رہی تھیں۔ ہم پانی لینے اٹھے۔ اتفاق سے باورچی خانہ خالی تھا۔ شامی کباب، مرغ پلاؤ، اور کوفتے دیکھ کر تو ہمارے منہ میں پانی بھر آیا۔ ایک طرف ڈونگے میں بھنے ہوئے ٹماٹروں کی چٹنی رکھی تھی۔ چٹنی ماموں جان کو بہت پسند تھی اور امی نے خاص کر ان کے لئے بنائی تھی۔ اچانک ہمیں یاد آیا کہ یہ چٹنی تو ہما باجی کو بھی بہت پسند ہے۔ بس پھر کیا تھا ہم نے منصوبہ بنایا کہ چٹنی خود کھا لیتے ہیں اور اگر امی نے پوچھا تو نام ہما باجی کا لگا دیں گے۔ اس طرح ہم اپنا بدلہ لے لیں گے۔ یہ سوچ کر ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، چٹنی منٹوں میں ہضم کر لی اور ایسے بن گئے جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

کھانے کے وقت وہی ہوا جو ہم نے سوچا تھا میز پر چٹنی نہ دیکھ کر امی نے چھوٹتے ہی ہما باجی کو جھاڑ پلا دی۔ ہما باجی سب کے سامنے اپنی بے عزتی برداشت نہ کر سکیں اور ان کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر ہم دل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے اور اپنی کی تعریف آپ کر رہے تھے کہ کس آسانی سے ہم نے ہما باجی سے انتقام لیا ہے۔

اگلی صبح جب ہم سو کر اٹھے تو حلق میں کانٹے سے چبھتے ہوئے محسوس ہوئے۔ ناشتہ کرنے میں بھی تکلیف ہو رہی تھی۔ کوئی چیز حلق سے نیچے نہیں اتر رہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا۔ ہمیں ڈر لگ رہا تھا کہ اب تو ہمارا پول کھل جائیگا۔ کیونکہ ہمیں معلوم تھا کہ یہ تکلیف رات کو کھائی ہوئی ٹماٹروں کی چٹنی سے ہو رہی ہے جو شاید کچے تھے۔ ڈاکٹر کے ہاں وہی ہوا

جس کا ڈر تھا۔ ڈاکٹر کے پوچھنے پر ہمیں بتانا پڑا کہ رات کو کیا کھایا تھا۔ اس نے چند دوائیں لکھ کر دیں اور ساتھ ہی ہمیں ایک انجکشن بازو میں ٹھکوانا پڑا۔

گھر آکر جب امی کو ابا جان نے ساری بات بتائی تو امی تو شروع ہو گئیں۔ سامنے ماموں جان اور ممانی کھڑی تھیں اور ہماری آنکھ اٹھانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس شرارت کی ہمیں یہ سزا ملی کہ جتنے دن نانی، نانا جان، ماموں اور ممانی رہیں خوب مزے مزے کی چیزیں گھر میں لائی گئیں اور پکنکیں منائی گئیں۔ جبکہ ہم اپنے بستر پر پڑے بدمزا کیپسول نگلتے رہے۔

میں ہوں بھوکا، نہ بدنیت
میں پیے لوں گا دودھ ذرا سا

نہ گھورو یوں اچھے "کیٹ"
پر تم کھالو پورا "ریٹ"

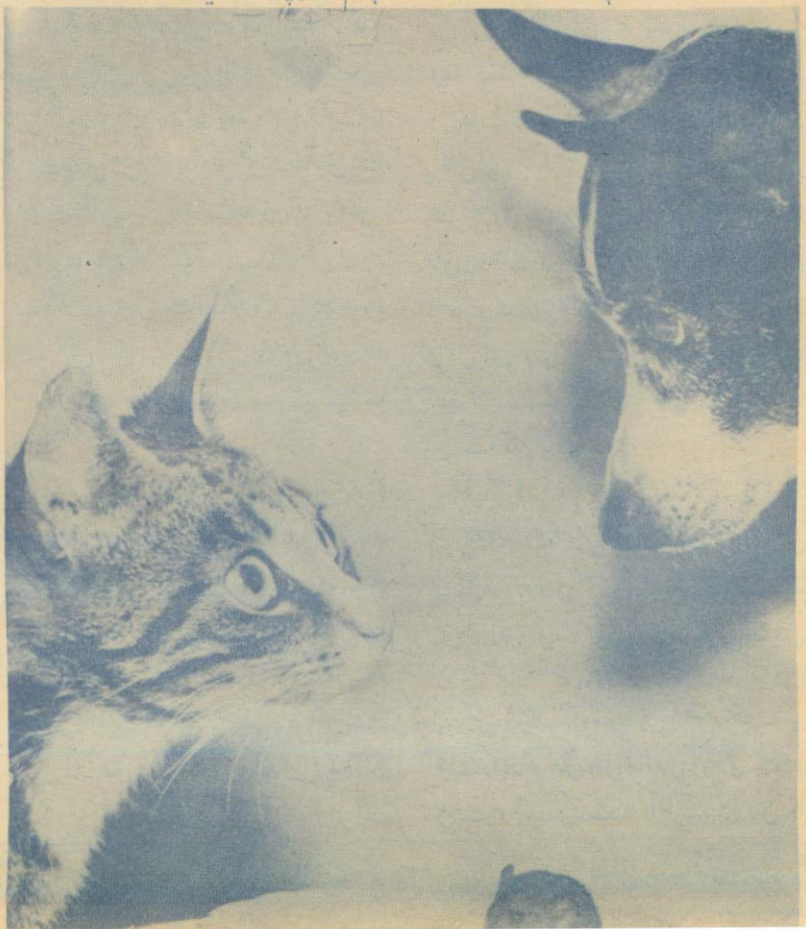

کھل نہ جائے میرا پول

نعیم مشتاق نومحی

کسی کو یہ معلوم نہیں ہے تو ہے چیز بڑی انمول
کُو کُو پھنستی ہے مشکل میں جاتی ہے پھر تیرے کول
کہنا مشکل کر دیتا ہے کہہ کے الٹے سیدھے بول
مت یوں تنگ کیا کر اس کو، ٹھیک نہیں یہ ٹال مٹول
میں کیا جانوں، کیا پہچانوں اپنی باتیں تو خود تول
پورا راز سمجھ جائے گا غور سے سارے شعر ٹٹول
گدھا کہوں یا احمق تجھ کو اپنے منہ سے خود ہی بول
ہوں میں تیرا سچا ساتھی مجھ سے اپنا راز بھی کھول

اس نظم میں ایک نہایت اہم راز پوشیدہ ہے۔ اگر اس راز کو آپ پانا چاہتے ہیں تو نظم کا ہر شعر غور سے پڑھئے اور اگر ناکام ہو جائیں تو صفحہ ۱۳۲ پر دیکھئے۔

اشرف کی شوخی

شانُ الحق حقی

یہ واقعہ جو ہم آپ کو سنا رہے ہیں بالکل فرضی نہیں، سچا ہی ہے۔ اس بچے کا نام بھی اشرف ہی تھا۔ بس ہم اسے اپنے طور سے سنا رہے ہیں اور آپ کی دلچسپی کے لئے تھوڑا سا نمک مرچ لگا دیا ہے۔

اشرف بڑا ذہین لڑکا تھا اور بہت شوخ بھی۔ اسے لوگوں کے ساتھ مذاق کرنے میں مزا آتا تھا۔ خاص طور پر بھائی بہنوں کو بیوقوف بناتا۔ تاش کے شعبدے دکھا کر اچنبھے میں ڈالتا۔ مگر ایسی کوئی بات نہیں کرتا تھا جس سے کسی کو تکلیف پہنچے۔

ایک دن اس نے صبح اٹھ کر کہا کہ ہمیں خواب میں بشارت ہوئی ہے کہ چھت کی منڈیر پر بچھونا کر کے سو۔ بھائی بہن سن کر چونک پڑے۔ کچھ رشتے کے بہن بھائی بھی آئے ہوئے تھے۔ سب نے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ نیچے لڑھک جاؤ گے۔" "اس نے کہا تھا یہ بات بس ہمارے آپس میں رہے۔" پھر بھی چھوٹی بہن سن کر پریشان ہوئی اور اس نے اماں سے جالگایا کہ اشرف بھائی آج رات چھت کی منڈیر پر بچھونا بچھا کر سوئیں گے۔ اماں نے سنا تو مسکرائیں۔ پھر منع کیا کہ ایسی حرکت مت کرنا۔ اشرف نے کہا۔ "خواب میں ہدایت ہوئی ہے۔ ہم اسے کیونکر ٹال سکتے ہیں۔"

دن بھر اس نے بھائی بہنوں سے اپنی خدمت کرائی۔ سب بچے منتظر رہے کہ شام ہو تو اشرف کو اپنا کہا پورا کرتا ہوا دیکھیں۔ خدا خدا کر کے سونے کا وقت آیا۔ اشرف نے دری چادر اور منے بھائی کی تکیئی رکھ کر سلوٹیں درست کیں۔ بچوں کے منہ حیرت سے کھلے ہوئے تھے۔ بچھونا کرنے کے بعد اشرف نے کہا "دیکھو بھئی! ہم نے منڈیر پر بچھونا کر دیا نا؟" سب نے کہا "ہاں!" وہ بولا "اچھا تو اب ہم سوتے ہیں۔" یہ کہہ کے چلا اور اپنے پلنگ پر آ کے لیٹ گیا۔

بچے کھسیانے سے ہوئے۔ مگر پھر سب کھل کھلا کر ہنس پڑے کہ لو بھئی اشرف نے اپنا کہنا پورا کر دیا۔ اور اس کی جان بھی بچ گئی۔

میری جو شامت آئی

شگفتہ شمیم

"اللہ باجی! یہ ٹنکو ہی ہے۔" ہم والہانہ انداز میں اپنی چچا زاد شاہدہ باجی کے پانچ سالہ گول مٹول بیٹے کی طرف بڑھے جو ہمارے تیور بھانپتے ہی جلدی سے اپنی امی کے پیچھے چھپ گئے۔

"ہاں۔" شاہدہ باجی بولیں۔ "بیٹے! پھپھو کو سلام کرو۔"

ٹنکو نے ذرا سا گردن نکال کر ہماری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر شرمیلی شرمیلی سے مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ ہماری زبان میں کھجلی ہونے لگی۔ ہم نے زور سے "تا" کہا اور ٹنکو دوبارہ امی کے پیچھے۔

"بڑا شرمیلا ہے۔" شاہدہ باجی پیار سے بولیں۔

"ائے بہو شریف کہونا...... خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں اتنا نیک بیٹا دیا ہے۔ ورنہ آج کل کے بچے........... توبہ توبہ! فتنہ ہوتے ہیں...... فتنہ۔" اماں جان پان منہ میں ڈال کر یوں تیز تیز چبانے لگیں جیسے ساری دنیا کے گندے اور بد تمیز بچے ان کے پان کی گلوری میں لپٹے ہوئے ہوں۔

"فکر مت کریں باجی! ٹنکو ابھی تھوڑی دیر میں مجھ سے گھل مل جائے گا۔" ہم نے ٹنکو کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا۔

شاہدہ باجی کو اپنے شوہر کے دوست کے بیٹے کی

حیدر آباد جانا تھا۔ وہ وہاں کے موسم اور حالات سے پریشان تھیں اس لئے انہوں نے ٹنکو کو ہمارے سپرد کیا اور خود حیدر آباد سدھار گئیں۔ ادھر ٹنکو کی آمد سے ہم اتنے خوش تھے جیسے ہمارے ہاتھ ہفت اقلیم آگئی ہو۔ ہم نے ٹنکو کے ساتھ کھیلنے، ان سے باتیں کرنے اور کہانیاں کہنے کے بہت سے پروگرام بنالئے اور محلے کے بچوں کو اپنے گھر آنے سے منع کر دیا حالانکہ پہلے ان ہی بچوں کو ہم خوشامد کر کر کے کھیلنے کے لئے بلاتے تھے۔ بھلا ٹنکو جیسے خوب صورت اور گورے گورے سے بچے کی موجودگی میں ان کی کیا ضرورت۔ ہمیں ٹنکو کی صاف اور شفاف رنگت کے آگے محلے کے بچے میلے میلے سے لگنے لگے۔

"آہا! اب کتنا مزہ آئے گا۔" ہم ٹنکو سے باتیں کرتے رہے اور خوش ہوتے رہے۔ اس بات سے بے خبر کہ تقدیر دور کھڑی ہماری حالت پر مسکرا رہی ہے۔

تھوڑی دیر بعد ہم کسی کام سے کھانے کے کمرے میں گئے تو ہماری نظر میز پر رکھے ہوئے اخبار پر پڑی۔ "یہ ہفتہ کیسا رہے گا" والا کالم سامنے نظر آرہا تھا۔ ہم نے اخبار اٹھالیا لکھا تھا۔

"اگلے چند دن پریشانیوں میں گزریں گے۔ رشتہ داروں سے دور رہئے۔" ہمارے ستارے کہہ رہے تھے۔

ہے۔ ہر بات الٹی کہتے ہیں۔" ہم نے اخبار کو تروڑ مروڑ کر دور پھینک دیا اچانک ہی اماں جان کی چیخ کی آواز آئی اور ہم اپنی جگہ سے اچھل پڑے۔

"کک کیا ہوا؟" ہم واپس پلٹے تو دیکھا اماں جان باتھ روم کے دروازے پر دونوں ہاتھ سینے پر رکھے خوف زدہ سی کھڑی ہیں۔ ہم نے جلدی سے قریب پہنچ کر ان کی پھٹی پھٹی آنکھوں کے تعاقب میں اندر جھانکا اور اس کے ساتھ ہی حیرت کا شدید جھٹکا ہمارے پورے جسم میں دوڑتا چلا گیا۔ ہم اپنی بصارت پر یقین کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور اندر ٹنکو واشنگ مشین میں رکھے ہوئے کپڑے کے ڈھیر پر بیٹھے گول گول گھوم رہے تھے۔ ان کے منہ سے خوشی کے ایسے قہقہے نکل رہے تھے جیسے فن لینڈ کے کسی جھولے کے مزے لے رہے ہوں۔ تھوڑی دیر بعد ہمارے حواس ٹھکانے آئے تو ہم نے سوئچ بند کر کے کھینچ کر انہیں نیچے اتارا۔ ٹنکو صاحب مچل مچل کر رونے لگے۔

"میں جھولے پر بیٹھوں گا۔"

"اب انہیں جھولے اور واشنگ مشین کا فرق کیسے سمجھائیں۔" ہم پریشان ہوگئے۔ اس وقت ہم پر ایک بے حد اہم راز بھی افشا ہوا۔ ٹنکو کی صاف و شفاف رنگت کا راز۔

ٹنکو کی آمد کی خوشی پہلے دن ہی دم توڑ گئی اور وہ بھی شاید ہمیں تنگ کرنے کا سوچ کر ہی آئے تھے۔ ہم ناشتے میں انہیں انڈا دیتے تو مکھن کی

لگتے۔ سبزیوں سے انہیں شدید نفرت تھی۔ مرغی کا گوشت اتنی رغبت سے کھاتے جیسے ابا کا پولٹری فارم ہو۔ کبھی باورچی خانے میں گھسے مرچ مصالحوں کے ڈبوں پر ریسرچ کر رہے ہوتے تو کبھی پھولوں پودوں کے درمیان گھسے ان کے ایک ایک حصے کے بارے میں جاننے کے خواہش مند نظر آتے۔

ہمیں اپنے پودوں سے بے حد لگاؤ ہے۔ ٹنکو ہمارے لگاؤ کو محسوس کر کے حسد کا شکار ہو گئے اور بیلے کی بے شمار کلیوں کو اپنے ہاتھوں سے مسل مسل کر ان کا چورا بنا ڈالا۔

ایک دن ہم شام کے وقت اپنے پودوں کی کاٹا چھانٹی میں مصروف تھے۔ ٹنکو ہمارے بچپن کی تین پہیوں والی کھٹارہ سائیکل پر بیٹھے یوں گھوم رہے تھے جیسے سائیکل کے موجد خود ہی ہوں۔ ہر بار وہ زوں کی تیز آواز نکالتے ہوئے ہمارے قریب سے گزرتے اور ہم خوف سے اچھل پڑتے۔

"ٹنکو ..... بھئی دور ہٹ کر سائیکل چلاؤ۔" ہم نے انہیں ہلکی سے سرزنش کی۔ ہمارے ہاتھوں میں گلاب کے پودے کا گملا تھا جس پر پہلی بار ایک ننھی سی کلی پھوٹی تھی۔ ہم سوچ رہے تھے کہ پودے کو کون سی ایسی جگہ پر رکھیں جہاں اسے خوب دھوپ اور ہوا ملے کہ ہمیں ٹنکو صاحب سائیکل کے پیڈل پر پیر مارتے ہوئے تیزی کے ساتھ قریب آتے دکھائی دیئے۔

اوسان خطا ہونے لگے۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ کچھ دیر بعد جب اندھیرا چھٹا تو دیکھا کہ ہم تو بچ گئے مگر ہمارا عزیز از جان پودا قدموں میں پڑا زندگی کے آخری سانس لے رہا تھا۔

"ٹنکو کے بچے ..... یہ کیا کیا؟" ہم زور سے چیخے۔ ٹنکو بھائیں بھائیں کرتے ہوئے اماں جان کی طرف دوڑے جو گملا ٹوٹنے کی آواز سن کر باہر آ رہی تھیں۔ اماں جان نے ٹنکو کو لپٹاتے ہوئے گھور کر ہماری جانب دیکھا۔

"یہ ..... یہ۔" ہم نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"پھپھو نے مارا۔ اوں، اوں، پھپھو نے مارا۔"

"ہائیں!" ہم نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

"ائے بیٹی شرم کرو..... کیا اسی لئے تم نے اس بچے کو سنبھالنے کی ذمہ داری لی تھی کہ اسے یوں ستاؤ۔" اماں ہمیں بہت ساری صلواتیں سناتی ہوئی ٹنکو کو گود میں اٹھا کر چل دیں اور ہم آنکھوں میں آنسو لئے کھڑے رہ گئے۔ ہمیں اپنے پودے کی ناگہانی موت سے زیادہ اماں جان کی بے مروتی کا دکھ تھا۔

ہائے یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا.....

ٹنکو ہماری اماں جان کو ہی ہم سے دور کرنے کی سازش میں مصروف تھے۔

ٹنکو کو اگر پڑھائی میں مصروف رکھا جائے تو ان کی شرارت کم ہو سکتی ہے چنانچہ ہم ٹنکو کی تمام غلطیوں کو معاف کرتے ہوئے بڑے شوق سے انہیں پڑھانے بیٹھے کہ شرارتی عموماً ذہین ہوتے ہیں۔

"چلو ون سے لے کر ٹین تک گنتی لکھو۔" ہم نے کہا۔

"کہاں لکھوں؟" بڑی معصومیت سے پوچھا گیا۔

"یہاں کاپی پر لکھو۔"

"کاپی پر کہاں لکھوں؟"

"یہ چوکور خانے بنے ہوئے ہیں..... یہاں لکھو۔" ہم تھوڑا سا جھنجھلائے۔

"خانے کیا ہوتا ہے؟"

"اف!" ہم نے دل میں انگریزی میڈیم اسکولوں کو کوسا۔

"یہاں اسکوائر میں لکھو۔"

"کیا لکھوں؟"

"تمہارا دماغ ہے یا بھوسے کا ڈبہ۔" ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔

ٹنکو نے اپنی دماغ کی شان میں گستاخی کرنے پر بے یقینی سے ہماری طرف دیکھا اور دھڑ دھڑ کرتے ہوئے پلنگ سے اتر کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ ہونٹ لٹک گئے۔ حلق سے عجیب و غریب قسم کی آواز نکلنا شروع ہو گئیں۔ ہم نے گھبرا کر اس سے پہلے کے وہ بھائیں بھائیں کی مخصوص آواز نکالتے ہم نے لپک کر انہیں گود میں اٹھا لیا۔

"اچھا..... اچھا چپ ہو جاؤ۔" ہم انہیں چمکارنے لگے۔ "اچھا مت رو..... ارے چپ ہو جاؤ..... میرے سونا..... میرے چاندی۔" گھبراہٹ میں ہمارے منہ سے الٹے سیدھے القابات نکل رہے تھے۔

ہم نے ٹنکو کی شرارتوں سے بچنے کا آخری حل یہ نکالا کہ ان سے دور دور رہنے لگے۔ مگر ہم جتنا ان سے کتراتے وہ اتنا ہی ہمارے پیچھے لگتے۔ ہم لان میں ٹہلنے جاتے تو وہ ہمارے ساتھ ساتھ کمر پر ہاتھ باندھے چلتے رہتے۔ باورچی خانے میں کام کر رہے ہوتے تو چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ سجائے ہمارا ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتے۔ مگر یہ ہم ہی جانتے تھے کہ ان کی دوستی کے پیچھے کیسی دشمنی چھپی ہوئی ہے۔ ایک بار انہوں نے اسی دوستانہ انداز میں ہماری جان لینے کی کوشش کی تھی۔

اس دن پہلی بار ہم اماں کی ڈانٹ کھائے بغیر باورچی خانے میں گھسے روٹی پکا رہے تھے کہ نہ جانے کب ٹنکو وہاں چلے آئے۔ ہم نے پلٹ کر دیکھا ٹنکو بڑی سی چھری کو دونوں ہاتھوں میں بلند کئے کھڑے تھے۔ ہم انہیں ڈانٹنا ہی چاہتے تھے کہ وہ ایک زور دار چیخ مار کر ہماری طرف دوڑے۔

"تھنڈر، تھنڈر، تھنڈر کیٹس۔ یا ہو۔"

"اماں!" ہمارے حلق سے بمشکل گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی۔ اماں حواس باختہ سی باورچی خانے میں داخل ہوتی دکھائی دیں۔ ہمیں صحیح و سالم پا کر انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے ہماری طرف دیکھا ہم نے ٹنکو کی طرف اشارہ کرنا چاہا جو ایک طرف کھڑے زور زور سے ہنس رہے تھے۔

"ٹنکو مجھے..... ٹنکو مجھے۔" ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہیں کیونکہ ہماری نظر ان کے خالی ہاتھوں پر پڑ چکی تھی۔

"ٹنکو تمہیں تنگ کر رہا ہے۔ یہی کہنا ہے نا تمہیں!" اماں غصے سے بولیں۔ ہم نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ اماں ٹنکو کا ہاتھ تھام کر چلی گئیں اور ہم سوچ میں پڑ گئے کہ ٹنکو سے کیسے پیچھا چھڑایا جائے۔

شاہدہ باجی کی واپسی میں پورا ایک دن باقی تھا۔ ہم سراپا انتظار بنے ان کی آمد کی گھڑیاں گننے لگے۔ خوف زدہ ایسے تھے کہ ذرا ذرا سی آہٹ پر دل اچھل کر حلق میں آ جاتا تھا۔ آخری دن ہم نے ٹنکو سے دور کمرے میں بند ہو کر گزارا۔ خدا خدا کر کے شاہدہ باجی آئیں اور ہم نے سکون کا ہی نہیں بلکہ خوشی کا سانس لیا۔ ہم شاہدہ باجی پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے کہ ان کے لاڈلے بیٹے سے ڈر گئے ہیں۔ کیونکہ ہمیں اپنی عزت عزیز تھی اور ویسے بھی ٹنکو سے پیچھا چھوٹنے والا تھا۔

"لگتا ہے تم دونوں نے خوب انجوائے کیا۔" شاہدہ باجی ٹنکو کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں جو چہرے پر پہلے دن والی شرمیلی مسکراہٹ سجائے کھڑے تھے۔

"جی....." ہم نے مسکرانے کی کوشش میں ہونٹ کچھ زیادہ ہی پھیلا لئے۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

"ائے ہے! بچہ واپس جانے کا سن کر کیسا اداس ہو گیا ہے؟" اماں جان بولیں۔

"کیا کروں اماں! اسکول کھلے ہوتے ہیں نا..... ورنہ میں اسے کچھ دن اور چھوڑ دیتی۔" ہم ٹنکو کے اسکول کو ڈھیر ساری دعائیں دینے لگے۔

"کوئی بات نہیں..... ٹنکو کے اسکول کی دو مہینے کی چھٹیاں ہوں گی تو میں اسے یہیں بھیج دوں گی۔"

"جی....." ہم گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔

"ہاں ہاں..... یقین نہیں آ رہا کیا۔ وہ کچھ اور سمجھ کر ہنسیں۔ "تم فکر مت کرو میں ٹنکو کو پورے دو مہینے کے لئے یہاں چھوڑ دوں گی۔"

"دو مہینے....." ہم جتنی تیزی سے اٹھے تھے اتنی ہی تیزی سے واپس صوفے پر ڈھیر ہو گئے۔ بے ہوش ہونے سے قبل جو آخری منظر ہماری نگاہوں میں تھا۔ وہ ٹنکو کا خوب صورت چہرہ اور چہرے پر پھیلی ہوئی شرمیلی مسکراہٹ تھی۔

ایکشن جونیئر برش کی خریداری پر

ہر ماہ بچوں کے لئے ہزاروں

انعامات

جونیئر ٹوتھ برش خریدتے ہوئے دکاندار سے ایک کوئیز کوپن ضرور حاصل کیجئے۔
کوپن میں درج اپنے وطن کے بارے میں ۵ سوالوں کے صحیح جوابات دیجئے اور ہر ماہ ہزاروں کی تعداد میں خوبصورت تحفے جیت لیجئے۔
جوابات کا کوپن آپ ہمیں پوسٹ کر دیں، یا اپنے پسندیدہ تحفے پر نشان لگا کر اپنے قریبی دکاندار کے پاس جمع کرائیں۔
"پہلے آیئے پہلے پایئے" کی بنیاد پر ہر ماہ موصول ہونے والے پہلے دو ہزار جوابات پر آپ کی اپنی پسند کے

قیمتی انعامات، آپ کے دروازے پر!

یونیورسل برش ویئر (پرائیویٹ) لمیٹڈ

ESTD. 1947
UNIVERSAL
REGD. TRADE MARK

ادیبوں کی شرارتیں

شیخ عبدالحمید عابد

بچے کو تو اپنے بچپن کا احساس نہیں ہوتا مگر جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا ہے۔ اس کا بچپن ایک سنہرا خواب بن کر اس کے حافظے سے چمٹ کر رہ جاتا ہے۔ اسے اپنے بچپن کی شرارتیں اور حماقتیں یاد آتی ہیں اور اس کا جی چاہتا ہے کہ دوبارہ اپنے بچپن کی وادی میں لوٹ جائے۔

آیئے چند ممتاز شخصیات سے دریافت کریں کہ وہ بچپن میں کس قسم کی شرارتیں کیا کرتے تھے۔

عطاء الحق قاسمی

عطاء الحق قاسمی مشہور کالم نگار اور ڈرامہ نگار ہیں۔ کہتے ہیں" مجھے اپنے بچپن کے زمانے کی ایک شرارت یاد ہے جس کا خمیازہ ہم سب کو بھگتنا پڑا تھا۔

ایک دن میرے دوست اور میں وزیر آباد سے دو کلو میٹر کے فاصلے پر کرم آباد میں مولانا ظفر علی خاں کے مزار پر واقع درخت سے بیر توڑنے جا رہے تھے۔ جب ہم شہر سے دور نکل آئے تو ہم میں سے کسی ایک بچے نے یہ تجویز پیش کی کہ اب جو لاری ہمارے قریب سے گزرے گی اس پر ہم پتھر پھینکیں گے۔

چنانچہ ہم ایک جگہ پر سڑک کے کنارے کھڑے ہو گئے۔ ہم نے ہاتھوں میں پتھر پکڑ لئے اور کسی بس کے گزرنے کا انتظار کرنے لگے۔ اتنے میں دور سے ایک مسافر بس قریب آتی نظر آئی جب وہ ہمارے قریب سے گزری تو ہم چاروں دوستوں نے بیک وقت اس پر پتھروں کی بارش کر

دی۔ ہمارا خیال تھا کہ ڈرائیور ہماری اس حرکت کا نوٹس نہیں لے گا اور اپنا سفر جاری رکھے گا۔ مگر اس نے تھوڑی دور جا کر بریک لگا دی اور جب بس رکی تو اس میں سے ڈرائیور اور تمام مسافر نکل کر

ہمیں پکڑنے کے لئے ہماری طرف دوڑے۔ چنانچہ ہم نے بھی دوڑ لگا دی۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے ہمیں آن دبوچا اور میرے سوا تمام بچوں کی اچھی خاصی پٹائی کی۔ میں اس طرح بچ گیا کہ جب یہ مسافر ہماری طرف آئے تو ان میں سے ایک مسافر نے سب سے پہلے مجھے بازو سے پکڑ کر کہا کہ تم مولانا بہاء الحق کے لڑکے ہو میں ان سے تمہاری شکایت کروں گا۔ سو اگر چہ میں یہاں پٹائی سے بچ گیا۔ لیکن جو پٹائی اباجی نے کی وہ میرے دوسرے دوستوں کی مجموعی پٹائی کے برابر تھی۔"

مستنصر حسین تارڑ

مشہور ادیب اور بچوں کے چاچا جی بچپن کی شرارتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں" میں نے میٹرک مسلم ماڈل ہائی اسکول لاہور سے کیا۔ ماسٹر نادر خان ہمیں شام کو مفت ٹیوشن پڑھاتے تھے ایک دفعہ سردیوں کے دن تھے۔ ماسٹر نادر خاں نے رات کو تمام کلاس کو ٹیوشن کے لئے بلایا۔ میں نے ماسٹر صاحب سے کہا کہ سردی زیادہ ہے اس لئے کمبل ساتھ لے آؤں؟ انہوں نے کہا "کمبل چھوڑ لحاف لے آنا۔" میں سب سے بڑا لحاف لے آیا۔ کمرے کے ایک کونے میں لحاف اوڑھ کر بیٹھ گیا۔

ماسٹر نادر خاں کمرے میں آئے۔ میری طرف غور سے دیکھا۔ وہ کہہ بھی کچھ نہیں سکتے تھے کیونکہ انہوں نے خود ہی لحاف لانے کی اجازت دی تھی سردی زیادہ ہونے کی وجہ سے تمام لڑکے آہستہ آہستہ میرے لحاف میں آدبکے۔ نادر خاں بہت پریشان ہوئے۔ انہوں نے تختۂ سیاہ پر الجبرے کا سوال لکھا اور مجھے حل کرنے کو کہا انہیں پتا تھا کہ میں الجبرے سے بہت خوف کھاتا ہوں۔ میرے لئے الجبرا ایسا ہی ہے جیسے یہ چینی زبان ہو۔ جب میں سوال حل کرنے جا رہا تھا تو میں نے اپنے ساتھی لڑکوں سے کہا کہ تم بتی گل کر دینا۔ چنانچہ اندھیرا ہونے کی وجہ سے کمرے میں ہڑبونگ مچ گئی۔ ہم سب کھسک گئے۔ اگلے دن ہیڈ ماسٹر صاحب نے ہم سب کو قطار میں کھڑا کر کے دس دس بید لگائے جن کا درد آج بھی محسوس کرتا ہوں۔"

اختر حسین جعفری

اختر حسین جعفری اردو کے نامور شاعر ہیں۔ ۱۵ اگست ۱۹۳۲ء کو ہوشیار پور کے ایک قصبہ میں پیدا ہوئے۔ بچپن کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں" میں بچپن میں شرارتیں نہیں کیا کرتا تھا مگر شرارتی بچوں کا دوست ضرور تھا۔ شرارتی بچے مجھے اچھے لگتے

تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار ہم اسکول جا رہے تھے تو میرے ساتھی نے ایک موٹے آدمی کے پیٹ میں چٹکی لے لی۔ وہ ہندو دکاندار تھا۔ اس نے ہم دونوں کو اپنی دکان پر بٹھالیا اور ہمیں جسمانی اذیت دی۔ جسمانی اذیت کے باوجود اس شرارت کی خوشی بڑھاپے میں ابھی تک محسوس کرتا ہوں۔"

احمد ندیم قاسمی

احمد ندیم قاسمی بلند پایہ ادیب اور شاعر ہیں انہوں نے بچوں کے لئے بھی بہت مزیدار کہانیاں لکھی ہیں۔ اپنے بچپن کی شرارتوں کے بارے میں کہتے ہیں..... میرا بچپن سراسر شرارتوں سے عبارت ہے۔ میں پڑھائی میں بھی خاصا تیز اور شرارت میں بھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں نے بچوں کے لئے جو نظمیں لکھی ہیں ان میں بچوں کی شرارت کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ بے شمار شرارتوں میں سے ایک شرارت یہ ہے کہ مکئی کے بھٹوں کے "بالوں" سے مہندی رنگ کی داڑھی اور مونچھیں بنا کر لگالیں سر پر بڑا سا پگڑ باندھ لیا۔ قمیض کے نیچے بہت سے کپڑے ٹھونس لئے جس سے میری "توند" ابھر کر کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ پھر میں نے ہاتھ میں عصا لیا۔ اور اپنے خاندان کی حویلی کے ایک ایک گھر میں جھانکا اور خواتین کی چیخیں نکلوا دیں۔ حویلی میں بہت سخت پردہ تھا سو ایک اجنبی معمر "مرد" کو اپنے سامنے دیکھ کر خواتین کا خوفزدہ ہو جانا لازمی تھا۔

اب اپنی اس شرارت کو یاد کرتا ہوں تو بے اختیار ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ جاتی ہے۔

اقبال ارشد

اقبال ارشد ۲۲ اکتوبر ۱۹۴۱ء کو انبالہ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ۱۹۵۵ء میں بچوں کے لئے شاعری شروع کی۔ بچوں کے لئے کہانیوں اور شاعری کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

کہتے ہیں بچے تو شوخ و شریر ہی اچھے لگتے ہیں۔ مٹی کے مادھو چپ چاپ خلا میں گھورتے ہوئے اور چوبیس گھنٹے پڑھاکو بچے مجھے ایک آنکھ نہیں

آم اور جامن توڑنا، پلک جھپکتے میں درخت پر چڑھ جانا، نقل اتارنا..... منہ چڑانا، بغیر ٹکٹ کے فٹ بال کا میچ دیکھنا، تیز دوڑنا، نہر میں ڈبکی لگا کر خاصی دیر تک سطح پر نہ آنا۔ اسکول کا کام کرتے دکھائی نہ دینا لیکن امتحان میں پہلی، دوسری یا تیسری پوزیشن حاصل کر کے سب کو حیران کر دینا، اسکول کے سامنے آلو چنے والے کی روزانہ دو چار کچوریاں غائب کر دینا میری چند شرارتیں تھیں۔

ایک روز ہمیں ایک زیر تربیت استاد پڑھانے بھاتے۔ میں اپنے بچپن میں کچھ زیادہ ہی شریر تھا۔ مگر میری شرارتیں دلچسپ اور قہقہہ آور ہوا کرتی تھیں۔ کیا مجال کہ کسی کے ماتھے پر شکن آجائے۔ میں ہمیشہ نئی بات سوچتا۔ لانگے خاں کے باغ سے آئے۔ وہ ہکلاتے تھے اور ستم ظریفی یہ کہ کچھ تتلاتے بھی تھے۔ بس یہیں سے شرارت کا آغاز ہوا۔ وہ دو ہفتے تک پڑھاتے رہے اور میں دو ہفتے تک ان کے پریڈ میں ہکلاتا اور تتلاتا رہا۔ وہ ایک دن غصے میں کہنے لگے۔ تم میرا مقات (مذاق) اڑاتے ہو اپنے اُس اُس تات (استاد) کی بھی عتت (عزت) نہیں ترتے۔" میں نے فوراً کہا۔ "آپ میری..... نن..... نن..... نن..... نقل اتارتے ہیں۔"

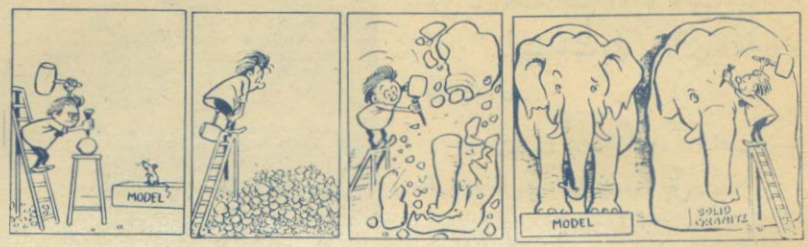

میرا اسٹار میرا حبیب بناسپتی

بہتر تو تھا ہی
اب سب سے بہترین

منفرد ڈبہ کھولنے اور
بند کرنے کی سہولت

صرف
حبیب بناسپتی
جادو تو

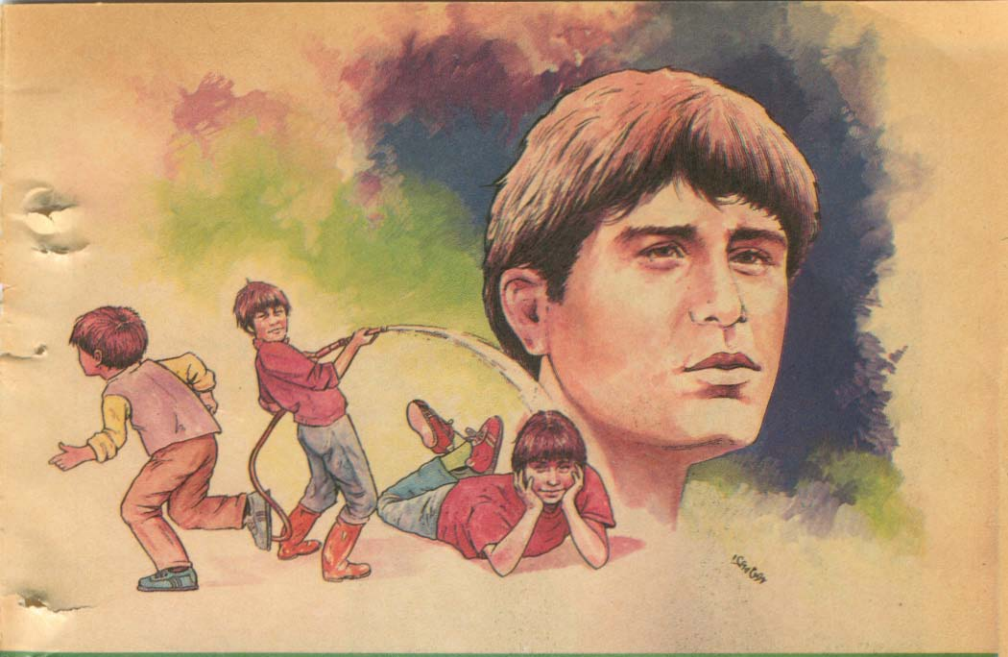

اُف میری توبہ

سلمان مراد

اس دفعہ سردیوں کی چھٹیاں منانے کے لئے ہم نے لاہور اپنی خالہ کے گھر جانے کا پروگرام بنایا۔ ان کے تین انتہائی شرارتی چھوٹے چھوٹے بیٹے بھی ۔۔۔ جن کے نام کامران، سلیم اور رحیم ہیں۔ خیر ۔۔۔ ہم نے اس دفعہ لاہور گھومنے کا پکا ارادہ کیا ۔۔۔ لئے ان شرارتی بچوں کی پروا کئے بغیر وہاں ۔۔۔یاریاں شروع کر دیں۔ آخر مقررہ تاریخ ۔۔۔ر اسٹیشن پہنچے تو ہمیں لینے کے لئے خالو ۔۔۔سے موجود تھے۔ ان کو جلد آفس پہنچنا تھا اس لئے وہ ہمیں گھر کے گیٹ ہی پہ اتار کر آفس چلے گئے۔ خیر جناب ہم نے گھنٹی بجائی۔ کافی دیر تک کوئی نہ آیا اچانک ہمیں اپنی پتلون نیچے کھنچتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ہم نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ خالہ کے سب سے چھوٹے بیٹے رحیم جن کی عمر تقریباً چار برس ہے چپکے سے ہمارے پیچھے بیٹھے ہوئے ہماری پتلون کھینچنے میں مصروف ہیں۔ ہمیں اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اچانک وہ کھڑے ہوئے اور دروازہ کھول کر اندر گھس گئے اور جوں ہی ہم اندر

داخل ہوئے وہ دور سے دوڑتے ہوئے آئے اور ہمارے اوپر چھلانگ لگادی۔ ہم اس فوری حملے کے لئے تیار نہ تھے اس لئے ان سمیت دروازے سے باہر گر پڑے۔ آواز سن کر خالہ باہر آئیں اور ہمیں اٹھا کر پچکارتی ہوئی اندر لے گئیں۔ خالہ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور امی کی خیریت دریافت کرنے کے بعد ہمیں ہمارے کمرے تک چھوڑ آئیں جسے انہوں نے خاص طور پر ہمارے لئے صاف کروایا تھا۔ سفر کی تھکاوٹ کی وجہ سے جلد ہی نیند آگئی۔

شام ہوئی تو خالہ کے تینوں بیٹے ہمارے کمرے میں آدھمکے اور ہم سے ہمارے سفر کے بارے میں دریافت کیا۔ بہت فرمائش کرنے پر ہم نے ان کو اپنے سفر کی کہانی سنائی اور اس کے بعد ان کے لئے لائے ہوئے تحفے ان کے حوالے کئے۔ ابھی وہ تحفے لے کر ہمارے کمرے سے نکلے ہی تھے کہ کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز آئی۔ ہم فوراً باہر نکلے تو دیکھا کہ ہمارا دیا ہوا پیارا سا گلدستہ کئی ٹکڑوں میں بٹ چکا ہے ہم نے غصے سے ان کی طرف دیکھا تو کامران بول اٹھا "بھائی! کل ہم نے ایک انڈین فلم دیکھی تھی اس فلم کے ہیرو نے بھی گلدستہ اسی طرح پھینکا تھا مگر وہ تو نہیں ٹوٹا تھا۔" اس سے پہلے کہ ہم غصے میں ان کو تھپڑ مارتے وہ وہاں سے نو دو گیارہ ہو گئے اور ہم کو اپنے پیارے سے گلدستے کے لئے اکیلے ہی آنسو بہانا پڑا۔

اگلے دن صبح اٹھے تو پتا چلا کہ خالو اور خالہ کسی عزیز کے گھر تقریب میں جارہے ہیں اور شام کو آئیں گے۔ لیکن بچے ساتھ نہیں جارہے ہیں۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا لیکن ہماری یہ وقتی خوشی اس وقت ختم ہو گئی جب ہمیں معلوم ہوا کہ بچوں کی وجہ سے ہمیں بھی گھر پر رہنا پڑے گا۔ ان کے ساتھ اکیلے ٹھہرنے کے خیال سے ہی ہمیں خوف سے پسینہ آنے لگا۔ خالہ کے جانے کے بعد وہ تینوں ہمارے کمرے میں آگئے اور کہنے لگے "بھائی جان آج ہم نے گھر کی صفائی کا پروگرام بنایا ہے کیوں کہ ہمارے اسکول ٹیچر نے کہا ہے کہ صفائی اچھی عادت ہے۔"

"ہاں! یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ تم نے تو سنا ہو گا کہ صفائی نصف ایمان ہے۔" ہم نے خوش ہو کر کہا۔

"تو پھر آپ ہمارا ساتھ دیں گے۔"

"ہاں کیوں نہیں۔ ہم سب سے پہلے ڈرائنگ روم کی صفائی کریں گے۔"

ابھی ہم ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے ہی تھے کہ اچانک کامران نے سلیم کو زور سے دھکا دیا۔ اور وہ زور سے رونے لگا اور اس نے رونے پر ہی بس نہیں کیا بلکہ صفائی کرنے والا برش کھینچ کر کامران کو دے مارا۔ برش اپنے نشانے پر لگنے کی بجائے شوکیس سے ٹکرایا اور ایک ہی لمحے میں شوکیس اپنے مالکِ حقیقی سے جاملا۔ شوکیس کے شیشے کمرے میں پھیل گئے۔ مرتے کیا نہ کرتے ہم نے شیشے کے ٹکڑوں کو جمع کرنے کے لئے کاغذ کی تلاش میں

نظریں ادھر ادھر دوڑائیں۔ سامنے میز پر ایک کاپی پڑی تھی۔ ہم نے اس میں سے کچھ صفحے نکال لئے اور اس سے شیشے سمیٹنے لگے۔ اچانک سلیم نے ایک دل دوز چیخ ماری اور زور زور سے رونے لگا۔ ہم نے اس کے رونے کی وجہ دریافت کی تو کامران نے انکشاف کیا کہ "بھائی آپ نے اس کی اردو کی کاپی پھاڑ دی ہے اور سب سے سخت ٹیچر اس مضمون کی ہیں۔" ابھی ہم اس کی بات پوری طرح سے سمجھنے بھی نہ پائے تھے کہ کمرے میں گھمسان کا رن پڑ گیا۔ ہر طرف صوفے کی گدیاں چلنے لگیں۔ ہم نے بھی ایک صوفے کے پیچھے پناہ لی۔ تھوڑی دیر بعد جوں ہی صوفے کے پیچھے سے سر اوپر کر کے صورتحال کا جائزہ لینا چاہا تو اچانک ہمارے سر پر کوئی بھاری سی چیز آ گری اور آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا۔ ہاتھ پھیرا تو پتا چلا کہ سر پہ گومڑ سا بن گیا ہے۔ آخر بڑی مشکل سے اس صورتِ حال کو سنبھالا۔ دوپہر ہوئی تو کھانے کی فکر ہوئی۔ خالہ کھانا تو تیار کر کے گئی تھیں بس صرف گرم کرنا تھا۔ ہم باورچی خانے میں گئے تو پتا چلا کہ وہاں کھانا پہلے ہی اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے اور خالی ہنڈیا ہماری راہ تک رہی ہے۔ ہم نے گھوم کر دیکھا تو سب سے چھوٹے بیٹے ہماری طرف دیکھ کر اپنے ٹوٹے ہوئے دانتوں کی نمائش کر رہے تھے۔ ہمارا دل چاہا کہ ان کے باقی دانت بھی توڑ دیں مگر اپنے غصے پر قابو پایا اور اپنے کمرے میں جا کر اپنا سامان پیک کرنے لگے اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم کہاں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

بھڑوں کو مارنے کا صحیح طریقہ

یہ پچھلے سال کا واقعہ ہے۔ ہمارے ایک چچا کی چائے کی دکان ہے۔ دکان کے دیوار میں ایک سوراخ تھا جس کے اندر بھڑوں نے اپنا چھتہ بنا رکھا تھا۔ میں اور میرا بھائی اکثر وہاں سے گزرتے تھے۔ جیسے ہی کوئی ایک آدھ بھڑ سوراخ کے باہر ہمیں نظر آتی۔ ہم جوتے سے اسے ڈھیر کر دیتے۔ ایک دن چچا کو پتہ نہیں کیا سوجھی۔ کہنے لگے کہ تمہیں بھڑوں کو مارنے کا طریقہ نہیں معلوم۔ دیکھنا میں ابھی ان کو کیسے ختم کر کے دکھاتا ہوں۔ ہم نے سوچا دیکھتے ہیں کیا ترکیب ہے چچا کے پاس۔ چچا نے جھاڑو میں سے ایک تنکا نکالا اور بھڑوں کے بل کے اندر داخل کر دیا۔ پھر جب انہوں نے اس تنکے کو باہر کھینچا تو ہم نے بس اتنا دیکھا کہ اکٹھی دس بارہ بھڑیں جھنجھناتی سوراخ سے نکلیں اور ان کے منہ پر حملہ آور ہوئیں۔ پھر ہمیں اتنا یاد ہے کہ چچا زور زور سے چلا رہے تھے۔ پھر ہم اس خوف سے بھاگ گئے کہ چچا اب ہم ہی کو پٹیں گے۔ دوسرے دن ہم نے دور سے دیکھا کہ چچا نے کپڑے سے اپنا پورا منہ ڈھانپ رکھا ہے۔ ہمارا بہت جی چاہا کہ پوچھیں! "چچا کیا یہی ہے بھڑوں کو مارنے کا صحیح طریقہ؟" لیکن ہمت اس لئے نہیں پڑی کہ چچا کہیں پھر ہمیں بھڑوں کی طرح کاٹ نہ لیں۔

فیصل / عمران

چوہے کی شرارت

محمد عادل منہاج

"ڈیڈی، اوپر والا کمرہ ہم لیں گے۔" وقار تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بولا۔ زرمینہ بھی اس کے ساتھ تھی۔

"ٹھیک ہے بھئی، جیسی تمہاری مرضی۔ ہمارا کیا ہے ہم تو کہیں بھی گزارہ کر لیں گے۔" اکرام بیگ بولے۔

"ایک تو میں ان آئے دن کے تبادلوں سے تنگ آ گئی ہوں۔" بیگم اکرام بھی کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولیں۔ کمرے میں پہنچ کر وہ صوفے پر ڈھیر ہو گئیں۔

"شکر کرو کہ اس بار تو پورے دو سال بعد تبادلہ ہوا ہے۔" اکرام بیگ نے کہا۔

"اور ہوا بھی کیسی جگہ۔ ذرا سے قصبے میں۔" وہ منہ بنا کر بولیں۔

"خیر اب قصبہ تو مت کہو، پورا شہر ہے۔ ہر طرح کی سہولتیں ہیں اور پھر مکان بھی اچھا ہے۔"

"کیا خاک اچھا ہے۔ گیس تک تو ہے نہیں یہاں۔"

"ہاں بس یہی کمی ہے۔ خیر میں نے آتے ہی فون کر دیا ہے۔ شام تک گیس کا سلنڈر اور چولہا آ جائے گا۔"

"یہ انتظام پہلے کروانا چاہئے تھا۔"

"بس تھوڑی بہت کمی تو رہ جاتی ہے۔"

"اچھا اب رات کے کھانے کا انتظام باہر سے کریں۔ شام تک چولہا وغیرہ فٹ بھی ہو گیا تو ابھی کام کرنے کی ہمت نہیں تھکن بہت ہو گئی ہے۔"

"جو حکم۔" اکرام بیگ بولے اور فون کے نمبر گھمانے لگے۔

صبح کی نماز سے فارغ ہو کر بیگم اکرام باورچی خانے کی طرف بڑھیں۔ جماہی لیتے ہوئے انہوں نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوئیں۔ اسی وقت ان کے کانوں سے ایک آواز ٹکرائی۔

"صبح کے چھ بجے ہیں اب آپ خبریں سنیں گے۔"

بیگم اکرام نے حیران ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ آواز کافی قریب سے آئی تھی مگر باورچی خانے میں تو کوئی ریڈیو نہیں تھا۔ اسی وقت خبروں کا مخصوص میوزک بجنا شروع ہو گیا اور پھر نیوز ریڈر کی آواز آئی۔

"پہلے اہم خبروں کا خلاصہ۔ کشمیر کی بگڑتی ہوئی صورت حال....."

خبریں مسلسل جاری تھیں اور بیگم اکرام حیرانی سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں کہ آخر یہ آواز آ کہاں سے رہی ہے؟ انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ بالکل کانوں کے قریب کہیں ریڈیو بج رہا ہے پھر بے خیالی میں ان کی نظر چولہے پر پڑی۔ گیس کا بالکل نیا چولہا کل شام ہی لگایا گیا تھا۔ انہیں یوں لگا کہ خبروں کی آواز اسی چولہے سے آ رہی ہے۔ انہوں نے کان چولہے کے قریب کئے تو آواز واقعی چولہے سے نکل رہی تھی۔ انہوں نے چولہے کے آگے پیچھے اور نیچے جھانک کر دیکھا کہ کہیں کوئی ریڈیو تو نہیں پڑا مگر وہاں ریڈیو نام کی کوئی چیز نہ تھی اور چولہے سے مسلسل خبروں کی آواز آ رہی تھی۔

ایک دم بیگم اکرام خوف زدہ سی ہو گئیں۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھیں اور تقریباً بھاگتے ہوئے کمرے کی طرف گئیں۔ اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور اکرام بیگ باہر نکلے۔ وہ ان سے ٹکراتے ٹکراتے بچے۔

"خیر تو ہے بیگم اتنی افراتفری کیسی؟" وہ حیران ہو کر بولے۔

وہ..... وہ چولہا..... خبریں۔" ان کے منہ سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ نکلے۔

"چولہا خبریں..... یہ خبروں کی کون سی قسم ہے؟" انہوں نے حیرانگی سے پوچھا۔

"چولہے سے خبریں آ رہی ہیں بالکل ریڈیو کی طرح۔" انہوں نے جلدی سے بتایا۔

"کیا کہہ رہی ہو، تم نے کوئی برا خواب تو نہیں دیکھ لیا۔" اکرام بیگ منہ بنا کر بولے۔

"آپ ذرا باورچی خانے تک چلیں۔" بیگم اکرام بھی جھلا کر بولیں۔

"باورچی خانے میں..... وہ کیوں؟"

"آپ آئیں تو سہی۔" وہ بولیں اور اکرام بیگ کندھے اچکاتے ہوئے ان کے ساتھ چل پڑے۔

جب وہ باورچی خانے میں داخل ہوئے تو بیگم اکرام نے کہا۔

"ذرا سنیں کیا چولہے میں سے خبروں کی آواز نہیں آ رہی۔"

"چولہے سے اس وقت کھیلوں کی خبریں نشر ہو رہی تھیں۔" پہلے بیٹنگ کرتے ہوئے پاکستان نے مقررہ پچاس اوورز میں.....

اکرام بیگ نے حیران ہو کر ادھر ادھر دیکھا پھر چولہے کو نیچے اوپر سے دیکھا۔

"یہ..... یہ کیا..... یہ ریڈیو کہاں بج رہا ہے؟" وہ بڑبڑائے۔

"آوازیں اسی چولہے میں سے آ رہی ہیں۔" بیگم اکرام بولیں۔

"لگ تو واقعی ایسا ہی رہا ہے۔"

"لگ نہیں رہا، واقعی ایسا ہے ورنہ یہاں ریڈیو کہاں اور آواز تو عین چولہے سے نکل رہی ہے جیسے چولہا نہ ہو ریڈیو ہو مجھ..... مجھے تو خوف محسوس ہو رہا ہے۔ یہ کوئی آسیبی چکر نہ ہو۔"

"جاہلوں والی باتیں مت کرو۔" تم نے فزکس میں ایم ایس کیا ہے اپنی تعلیم کو بٹہ مت لگاؤ۔" وہ منہ بنا کر بولے۔ انہیں آسیب؛ بھوت پریت، تعویز گنڈوں، پیر فقیروں سے بے حد چڑ تھی۔

"پھر آپ ہی بتائیں یہ کیسے ممکن ہے۔"

اسی وقت خبریں ختم ہو گئیں اور اناؤنسر کی آواز آئی۔ "اب آپ حالات حاضرہ کا پروگرام سنیں گے جس کے میزبان ہیں....."

"یہ تو واقعی ریڈیو بج رہا ہے کہیں اس چولہے کے نیچے زمین میں ریڈیو تو دفن نہیں۔"

"اور زمین میں دفن ریڈیو سے آوازیں اس چولہے سے ہوتی ہوئی نکل رہی ہیں۔" بیگم اکرام طنزیہ لہجے میں بولیں۔

اکرام بیگ نے کوئی جواب نہ دیا۔ انہوں نے چولہے کو ٹھوک بجا کر دیکھا، اس کے ناب گھمائے مگر کچھ نہ ہوا۔ اب چولہے سے حالات حاضرہ کا پروگرام نشر ہو رہا تھا۔

"ارے کہیں یہ وقار کی کوئی شرارت تو نہیں۔" اچانک اکرام بیگ بولے۔

"وقار کی شرارت۔" بیگم اکرام حیرانگی سے بولیں۔

"ہاں بھئی اسے ہی الیکٹرونکس کے تجربات کا خبط ہے۔ ایک بار پہلے بھی اس نے ایک بیل

(BELL) بنا کر دروازے میں چھپا دی تھی جو دروازے کھلتے ہی بج اٹھتی تھی۔

"ارے ہاں مجھے تو یہ خیال ہی نہیں آیا۔ واقعی یہ اسی کی حرکت ہے۔ میری تو جان نکال کر رکھ دی۔"

"مم مگر یہ اس نے کیا کیسے کہ چولہے سے ریڈیو کے پروگرام نشر ہو رہے ہیں۔"

"پوچھیں ذرا اسے بلا کر۔"

"وقار ادھر آؤ۔" اکرام بیگ نے کھڑکی سے سر نکال کر زور سے اسے آواز دی۔

"آیا ڈیڈی۔" وقار چلایا اور پھر تھوڑی دیر بعد وہ باورچی خانے میں داخل ہوا۔ "ارے آپ یہاں ہیں میں کمرے میں دیکھ رہا تھا۔"

"یہ کیا حرکت کی ہے تم نے؟" اکرام بیگ نے اسے گھورا۔

"جی ..... کیسی حرکت؟" وہ حیران ہو کر بولا۔

"یہ اس چولہے کے ساتھ تم نے کیا کیا ہے۔" انہوں نے پوچھا۔

"چولہے کے ساتھ ..... ارے۔" اچانک وہ چونکا اور چولہے کی طرف بڑھا۔ "یہ ..... یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے ایسا لگتا ہے ریڈیو بج رہا ہے۔"

"ڈرامہ مت کرو۔ سیدھی طرح بتاؤ یہ کیا حرکت ہے؟"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ڈیڈی.....!! بھلا مجھے کیا پتہ؟ مم ..... مگر یہ چولہے سے آوازیں۔" وہ حیرانگی سے بولا۔

"تو یہ تم نے نہیں کیا۔" اکرام بیگ الجھن کے عالم میں بولے۔

"جی نہیں، آپ مجھ پر کیوں شک کر رہے ہیں ڈیڈی؟"

"اس لئے کہ تمہیں ہی الٹے سیدھے تجربات کرنے کا شوق ہے۔"

"مم ..... مگر یقین کریں میں نے یہ نہیں کیا۔ میں تو خود حیران ہو کہ یہ کیا چکر ہے؟"

اکرام بیگ کی نگاہوں میں الجھن تیر گئی وہ جانتے تھے کہ وقار شرارتی سہی مگر جھوٹ نہیں بولتا۔

"ٹھیک ہے۔ مجھے کسی الیکٹریشن یا الیکٹرونکس کے ماہر کو بلوانا پڑے گا، وہ آ کر اس چولہے اور باورچی خانے کو چیک کرے گا۔" آخر انہوں نے کہا۔

وہ سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے کہ دروازہ کھلا اور دو اشخاص اندر داخل ہوئے۔ ایک کے کندھے پر تھیلا لٹک رہا تھا۔

"کیا ہوا؟" اکرام بیگ نے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہم چولہے اور باورچی خانے کو اچھی طرح چیک کر چکے ہیں، چولہے کا ایک ایک پرزہ کھول کر دیکھ لیا۔ باورچی خانے کی دیواروں اور فرش کا اچھی طرح جائزہ لیا مگر ہم کچھ بھی نہیں سمجھ سکے کہ یہ چکر

کیا ہے۔ چولہے سے ریڈیو کی نشریات ہماری سمجھ سے باہر ہیں۔" ان میں سے ایک بولا۔

"یہ..... یہ آپ لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔" اکرام بیگ پریشان آواز میں بولے۔

"ہم اپنی کم علمی کا اعتراف کرتے ہیں جناب! آپ کسی ماہر انجینئر یا سائنس دان کے سامنے یہ معاملہ رکھیں۔"

"ہوں..... ٹھیک ہے اب یہی کرنا ہوگا۔"

"ہمیں اجازت دیجئے پھر۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ لوگوں کا شکریہ۔" اکرام بیگ انہیں رخصت کر کے اندر آئے۔

"میں بھی پہلے آسیب وغیرہ کو نہیں مانتی تھی مگر اب مجھے یقین آتا جا رہا ہے۔" بیگم اکرام بولیں۔

"یہ بیسویں صدی کا اختتام ہے بیگم۔ اب ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ اگر کوئی معاملہ سمجھ میں نہ آئے تو اسے فوراً آسیب یا بھوت پریت سے منسوب نہیں کر دینا چاہئے۔ دنیا میں بہت سے ایسے واقعات ہوتے ہیں جن کی کوئی توجیہہ پیش نہیں کی جا سکتی....." اکرام بیگ کے الفاظ درمیان میں رہ گئے اسی وقت فون کی گھنٹی بج اٹھی تھی۔

بیگم اکرام نے ریسیور اٹھایا۔ "ہیلو..... کون..... ابا جان! جی، جی ہاں کل ہی پہنچے ہیں۔ جی ہاں گھر وغیرہ بھی ٹھیک ہے۔ بس ذرا چولہے کا مسئلہ ہے۔ جی وہ بات دراصل یہ ہے کہ ....."

بیگم اکرام پوری تفصیل سنانے لگیں اور پھر چند باتیں کر کے انہوں نے ریسیور رکھ دیا اور بولیں۔

"ابا جان کا فون تھا۔ وہ ہمارے چولہے کے بارے میں سن کر بہت حیران ہوئے اور خود یہاں آ رہے ہیں۔"

"خود آ رہے ہیں؟"

"ہاں، وہ کہہ رہے ہیں کہ میں بھی اس چولہے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

اکرام بیگ، بیگم اکرام اور پروفیسر شجاعت باورچی خانے میں موجود تھے۔ پروفیسر شجاعت بیگم اکرام کے والد تھے۔ انہوں نے الیکٹرونکس میں ایم ایس کیا تھا اس کے علاوہ بھی ان کے پاس نہ جانے کون کون سی ڈگریاں تھیں۔ انہوں نے ہی اپنی بیٹی یعنی بیگم اکرام کو فزکس میں ایم ایس کروایا تھا اور پھر یہ شوق ان کے نواسے وقار تک پہنچا تھا۔ اس وقت بھی چولہے سے موسیقی کا ایک پروگرام نشر ہو رہا تھا۔

"کچھ سمجھ میں آیا ابا جان۔" بیگم اکرام بولیں۔

"ہاں یہ سب دراصل اس چولہے کی شرارت ہے۔" پروفیسر شجاعت بولے۔

"چولہے کی شرارت۔" کرام بیگ حیرانگی سے بولے۔

"ہاں، آؤ ڈرائنگ روم میں اطمینان سے بیٹھ کر تمہیں تفصیل سناتا ہوں۔"

وہ سب ڈرائنگ روم میں آئے۔ یہاں وقار

کیا آپ جانتے ہیں

○ — ریچھ درخت پر پیٹھ کے بل چڑھتا ہے۔

○ — بچھو کی آنکھیں اور سانپ کے کان نہیں ہوتے۔

○ — وہیل مچھلی کی عمر ۵۰۰ سال تک ہوتی ہے۔

○ — ہما "پرندے کا نام مشہور ہے، لیکن آج تک کسی نے نہیں دیکھا۔ کیونکہ یہ خیالی پرندہ ہے۔

○ — مچھلی اپنی تمام زندگی میں ایک قطرہ بھی پانی نہیں پیتی۔

○ — چمگادڑ پرندہ ہے مگر بچوں کو دودھ پلاتا ہے۔

مرسلہ..... گلشن آرا خورشید جھنبہ، کراچی

اور زرمینہ بھی تھے۔

"کچھ پتہ چلا نانا..... کہ چولہا گانا کیسے سنا رہا ہے؟" زرمینہ بولی۔

"ہاں بھئی، تمہارے تو مزے ہیں، چولہے پر کھانا بھی پکاؤ اور مزے مزے کے پروگرام بھی سنو۔" وہ مسکرائے پھر چند لمحے خاموش رہ کر بولے۔ "دراصل یہ کوئی نیا واقعہ نہیں۔" اس قسم کے واقعات پہلے بھی دنیا کے مختلف حصّوں میں پیش آ چکے ہیں۔

"آپ کا مطلب ہے کسی اور کا چولہا بھی اسی طرح پروگرام نشر کرتا رہا ہے۔"

ہاں کینیڈا کی ایک خاتون کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا تھا کہ ان کے چولہے سے موسیقی نشر ہوتی تھی۔ شکاگو کا ایک وکیل تھا اس نے انکشاف کیا تھا کہ وہ جب اپنے بستر پر سونے جاتا ہے تو بستر سے موسیقی کی آوازیں آتی ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے لوگوں نے اس قسم کے واقعات سنائے کہ ان کے ہیٹر، استریاں اور بجلی سے چلنے والے آلات سے عجیب و غریب آوازیں آتی ہیں۔"

"حیرت ہے، ہم تو سمجھ رہے تھے کہ یہ واقعہ صرف ہمارے ساتھ ہی پیش آیا ہے۔" بیگم اکرام بولیں۔

"صرف یہی نہیں کچھ لوگوں کو تو اپنے غسل خانے میں نہانے کے ٹب سے بھی آوازیں نکلتی محسوس ہوئی ہیں۔ البرٹا کے ایک کسان نے یہ واقعہ سنایا کہ اس کے کھیتوں میں ایک کنواں ہے وہ جب بھی اس کا ڈھکنا اٹھاتا ہے، کنویں سے موسیقی نشر ہونے لگتی ہے۔ پولیس نے اس کے کنویں کی تلاشی لی، تہہ تک کھنگال ڈالی مگر اس میں پانی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔"

"مم، مگر ان سب واقعات کی توجیہہ کیا ہے۔ آخر یہ مختلف چیزوں سے آوازیں کیوں نکل رہی ہیں؟"

"جب بھی اس قسم کا کوئی واقعہ پیش آیا۔ سائنس دانوں نے تحقیقات کیں مگر سچی بات یہ ہے کہ وہ ابھی تک ان واقعات کی کوئی توجیہہ پیش نہیں کر سکے۔ ان کا خیال ہے کہ ان واقعات کی وجہ ریڈیو کے شارٹ ویو (SHORT WAVE)

ٹرانسمیٹر ہیں اور مختلف چیزیں ان ٹرانسمیٹروں کے سگنل کیچ کر لیتی ہیں۔ مگر ان چیزوں میں اینٹینے جیسے خصوصیات کیسے پیدا ہو گئیں اور یہ ریڈیو کے سگنل کس طرح کیچ کرتی ہے۔ ان کی کوئی وجہ ابھی تک دریافت نہیں ہو سکی۔ سائنس دان تحقیقات کر رہے ہیں شاید آئندہ چند سالوں میں یہ معمہ حل ہو جائے۔" پروفیسر شجاعت نے بتایا۔

"اوہ..... تو اس کا مطلب ہے کہ واقعات ابھی تک راز ہیں۔"

"ہاں مگر ہر راز کبھی نہ کبھی حل ہو جاتا ہے۔ انسان جستجو میں لگا رہتا ہے اور رازوں کو کھنگال ڈالتا ہے۔"

"مگر اب ہم اس چولہے کا کیا کریں؟" بیگم اکرام پریشان ہو کر بولیں۔

"بھئی کرنا کرانا کیا ہے۔ مزے سے کھانا پکاؤ اور مفت کی ریڈیو نشریات سنو۔" پروفیسر شجاعت مسکرائے۔

"اور کیا، اس ریڈیو کا تو لائسنس بھی نہیں بنوانا پڑے گا۔" وقار بولا۔

"اسے کہتے ہیں چپڑی اور دو دو۔" اکرام بیگ بولے۔

"اچھا پھر میں تو چلی کھانا پکانے۔" بیگم اکرام اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"ٹھہرو! میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" پروفیسر شجاعت بولے۔

"جی آپ کیا کریں گے۔"

"خبروں کا وقت ہو گیا ہے۔ خبریں سنوں گا۔" وہ بولے تو جواب میں اکرام بیگ نے زور دار قہقہہ لگایا۔

ایجاد کا سبب

خان اکبر علی خان

رائٹ برادران کا باپ ایک پادری تھا۔

وہ ۱۸۷۸ء میں کسی مذہبی کام سے سفر کر رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں لڑکوں کے لئے ایک مشینی کھلونا خرید لیا۔ جب وہ گھر واپس آیا تو اسے دیکھ کر لڑکے اس کی طرف بھاگے۔ پادری کی آنکھوں میں شرارت تیر رہی تھی اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بچو! میں تمہارے لئے ایک چیز لایا ہوں۔ لو اسے کیچ کرو۔"

اور ایک چیز ان کی طرف پھینک دی اور پھر ایک ناقابل یقین بات ہوئی۔ وہ چیز لڑکوں کی سمت جانے کے بجائے چھت کی سمت اڑنے لگی اور چند لمحے بعد پھڑپھڑا کر فرش پر گر پڑی۔ لڑکے حیرت اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے پکڑنے کے لئے بھاگے۔ جب کہ پادری ہنس پڑا۔

پادری اپنے بچوں کے لئے جو چیز لایا تھا وہ ایک اڑنے والا مشینی کھلونا تھا جو تار، بانس اور کاغذ کا بنا ہوا تھا۔ اسی کھلونے کی وجہ سے ان لڑکوں میں پرواز کرنے کا شوق پیدا ہوا جو ہوائی جہاز کی ایجاد کا سبب بنا۔

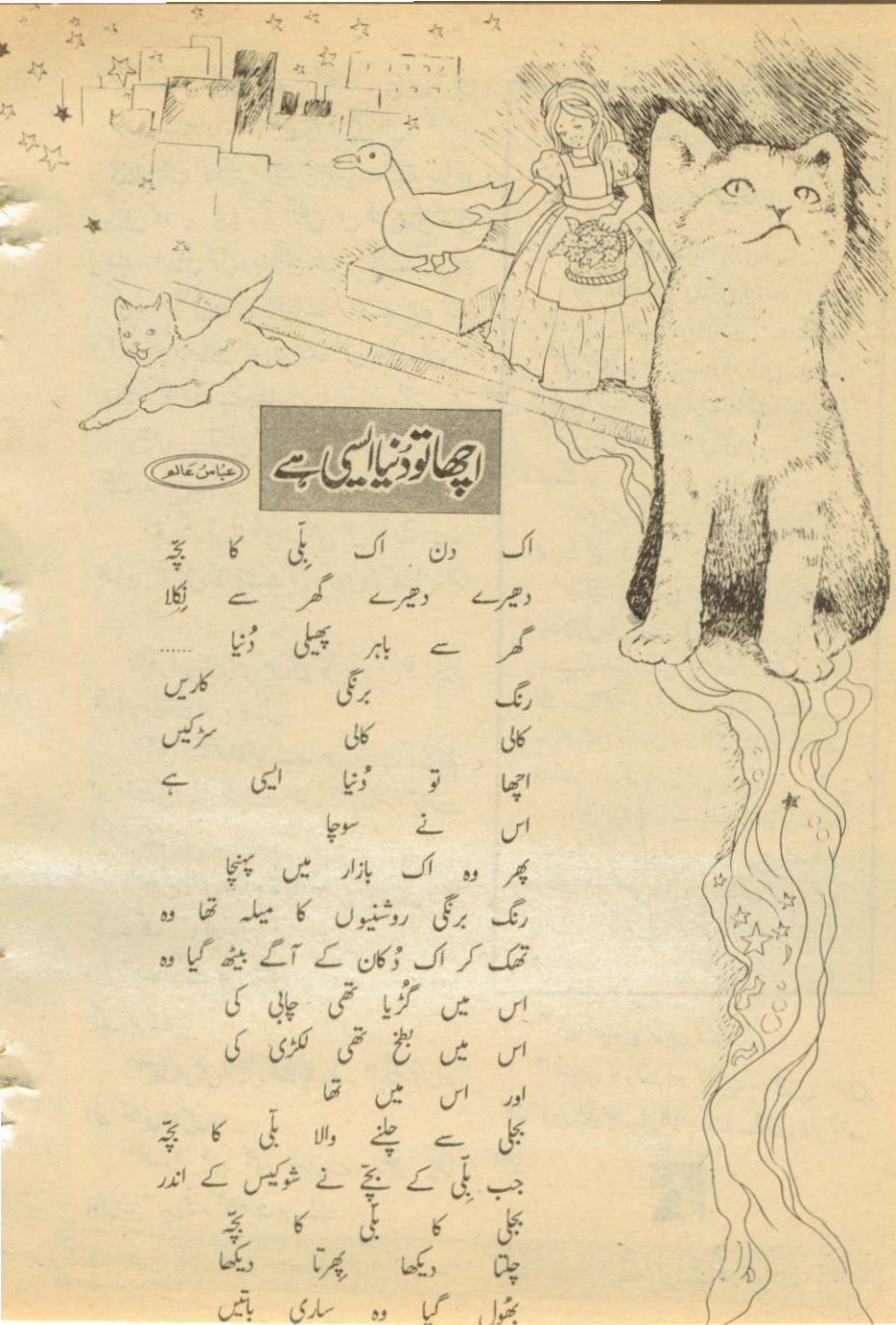

اچھا تو دُنیا ایسی ہے

عباس عالم

اک دن اک بِلّی کا بچّہ
دھیرے دھیرے گھر سے نِکلا
گھر سے باہر پھیلی دُنیا .....
رنگ برنگی کاریں
کالی کالی سڑکیں
اچھا تو دُنیا ایسی ہے
اس نے سوچا
پھر وہ اک بازار میں پہنچا
رنگ برنگی روشنیوں کا میلہ تھا وہ
تھک کر اک دُکان کے آگے بیٹھ گیا وہ
اس میں گڑیا تھی چابی کی
اس میں بطخ تھی لکڑی کی
اور اس میں تھا
بجلی سے چلنے والا بلّی کا بچّہ
جب بِلّی کے بچّے نے شوکیس کے اندر
بجلی کا بلّی کا بچّہ
چلتا دیکھا پھرتا دیکھا
بھول گیا وہ ساری باتیں

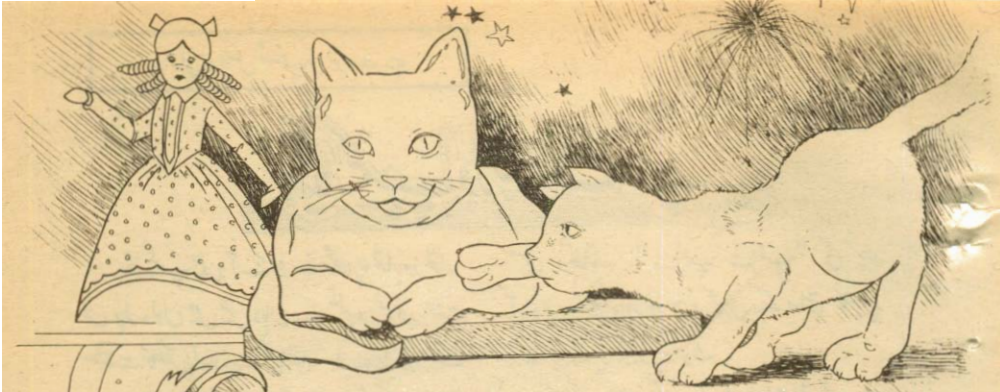

بیٹھ گیا شوکیس کے آگے
اس کی آنکھوں میں حیرت تھی
پھر وہ اُٹھا
لوگوں کے پیروں سے
اور نظروں سے بچتا
اس شوکیس کے اندر پہنچا
جس میں بجلی کا بلّی کا بچہ بھی تھا
کیا کھاتے ہو؟ کیا پیتے ہو؟
شیشے کے صندوق میں کیسے رہ لیتے ہو؟
اس سے پوچھا
لیکن وہ تو بجلی کا تھا
کچھ نہ سمجھا، کچھ نہ بولا
تب بلی کا بچّہ سمجھا
اس کا چلنا اس کا پھرنا
ایک شرارت ہے
انسانوں کی فِطرت سے
شرمندہ شرمندہ وہ بلّی کا بچّہ
واپس اپنے گھر کو لَوٹا
بجلی کو پہچان گیا وہ
انسانوں کو مان گیا وہ

یہ کہانی دراصل مصنف کی شرارت ہے

بیگار کیمپ اور شرارت

محمد بن مالک

بیگار کیمپ میں آئے ہوئے مجھے چوتھا روز تھا۔ ان چار دنوں میں میں وہاں کے ظلم و ستم اور محنت مشقت کا تقریباً عادی ہو گیا تھا۔ بڑے بڑے سخت پہاڑی چٹان نما پتھر توڑ توڑ کر چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ میں اور میرے ساتھ کے دوسرے تمام قیدی لڑکے دن بھر اس زبردستی کی مشقت میں مصروف رہتے۔ پانچ چھ خونخوار قسم کے کوڑا بردار ہر وقت ہمارے سروں پر مسلط رہتے تھے۔ جونہی کوئی قیدی اپنے کام میں سستی دکھاتا۔ "شڑاپ شڑاپ" کی چند آوازیں آتیں اور وہ مزید تیزی کے ساتھ کام پہ جُت جانے پر مجبور ہو جاتا۔

بیگار کیمپ میں گزرنے والے ابتدائی تین دن میرے لئے کسی عذاب سے کم نہیں تھے۔ اپنے اغوا پر میں سخت برہم تھا اس لئے پہلے دن میں نے کام کرنے سے انکار کر دیا جس پر مجھے اس بری طرح سے پیٹا گیا کہ مجبوراً مجھے کام شروع کرنا پڑا۔ کیمپ والوں نے میرے دونوں پاؤں میں بیڑیاں

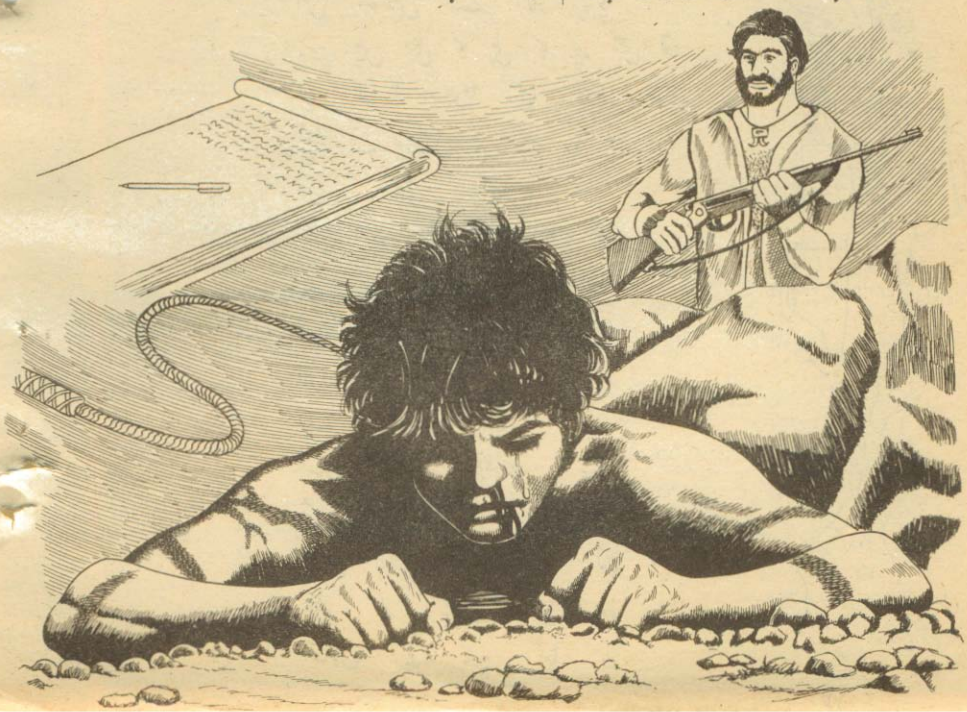

ڈال رکھی تھیں جن کی درمیانی زنجیر اتنی مختصر سی تھی کہ میں لمبے قدم اٹھا کر چل ہی نہیں سکتا تھا۔ انہوں نے پتھر توڑنے کے لئے مجھے ایک وزنی ہتھوڑا اور ایک بھاری بھرکم کدال دی تھی۔ چنانچہ میں نے اللہ کا نام لیا اور دوسرے مغوی لڑکوں کی طرح پتھروں کو توڑنے میں لگ گیا۔

وہ پتھریلی پہاڑیوں کا ایک سلسلہ سا تھا۔ جہاں ہم سے بیگار لی جا رہی تھی۔ کچھ قیدی لڑکے پہاڑیوں کے عین اوپر چڑھے، مختلف چٹانوں کو پہاڑیوں سے الگ کر کر کے نیچے لڑھکا رہے تھے اور باقی قیدی اپنے اپنے اوزاروں سے ان چٹانوں کو چھوٹے چھوٹے پتھروں میں تقسیم کر رہے تھے۔ جنہیں عرف عام میں "روڑی" کہا جاتا ہے۔ پتھر توڑنے والے ان لڑکوں میں میں بھی شامل تھا اور یہ سارا کام چند خوں خوار "کوڑا برداروں" کے زیر نگرانی ہو رہا تھا جو ادھر سے ادھر گشت کرتے پھر رہے تھے اور جہاں بھی کوئی خلاف حکم بات دیکھتے شڑاپ شڑاپ کوڑے چلانا شروع کر دیتے۔ ان کے علاوہ میں نے کچھ فاصلے پر چند رائفل بردار بھی دیکھے جو بظاہر تو بے پروائی سے ٹہلتے تھے لیکن در حقیقت وہ لڑکوں کی نگرانی پر مامور تھے۔ ہر لڑکے کے پیروں میں چھوٹی مگر مضبوط زنجیر والی بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں تاکہ اگر بھاگنے کی کوشش کریں تو کامیاب نہ ہو سکیں۔

میں نے اپنی زندگی میں صرف دماغی محنت کی تھی، جسمانی مشقت کی کبھی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔ اس لئے پہلے دن جب میں نے وزنی ہتھوڑا ہاتھ میں لے کر پتھروں کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا شروع کیا تو تھوڑی ہی دیر بعد اپنے بازو اور کاندھے بری طرح شل ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ بس پھر کیا تھا ..... شائیں شائیں کی چند آوازوں کے ساتھ ہی میری پشت پر گویا انگارے سے بھر گئے ..... میں بلبلا کر مڑا ..... پیچھے ایک گھنی مونچھوں والا خوفناک شکل کا انسان کھڑا اپنا کوڑا لہرا رہا تھا۔

"اوئے یہاں کیا آرام کرنے آیا ہے؟" اس نے غرا کر کہا، "دوسروں کو نہیں دیکھتا کس طرح کام میں لگے ہوئے ہیں!!"

میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ میں خود سے تو یہاں نہیں آیا۔ مگر مزید کوڑے کھانے کی ہمت نہیں تھی۔ اپنے جوش کو دباتے ہوئے میں نے ہتھوڑا اٹھایا اور دوبارہ پتھر توڑنے لگا۔ دھاتی اوزاروں کے پتھروں سے ٹکرانے کی آوازیں مسلسل بازگشت پیدا کر رہی تھیں۔ کبھی کبھی "نگرانوں" کی چیخ و پکار اور ہنٹروں کی ہولناک شڑاپ شڑاپ بھی سنائی دے جاتیں۔ تمام لڑکے اس قدر تندہی کے ساتھ پتھر توڑنے میں مصروف تھے جیسے ان کی زندگی کا مقصد ہی یہی ہو۔ میں اپنا سارا غصہ پتھروں پر اتار چکا تو پھر دھیرے دھیرے میری قوت بھی جواب دینے لگی۔ سورج غروب ہونے والا تھا۔ دھوپ کی حدت اور اس مشقت کے باعث پسینہ میرے جسم سے دھاروں کی صورت میں نکل کر بہہ رہا تھا۔ دوسرے تمام لڑکے بھی پسینے میں

شرابور ہو رہے تھے۔ میں نے ایک لمحے کے لئے ہتھوڑا روکا تو ایسا لگا جیسے میرے دونوں بازو کاندھوں پر موجود ہی نہیں ہیں۔ درد کی شدت سے دونوں سُن ہو کر رہ گئے تھے۔ جوں جوں میں مشقت کرتا رہا۔ درد میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا اور طاقت میں بتدریج کمی ہوتی رہی۔ ایک وقت ایسا آیا کہ درد اور نقاہت کے باعث پتھر پر مارنے کے لئے ہتھوڑا مجھ سے اوپر اٹھایا ہی نہیں گیا۔ جیسے ہی میرا ہاتھ رکا۔ وہ گھنی مونچھوں والا ایک دم بلائے نا گہانی کی طرح نازل ہو گیا۔ پھر سننے والوں نے شڑاپ شڑاپ کی چند مانوس آوازیں چیخوں کی آمیزش کے ساتھ سنیں۔ اور دیکھنے والوں نے معمول کا منظر دیکھا۔

"بہت آرام طلب ہے۔" گھنی مونچھوں والا ہنٹر برساتے ہوئے دھاڑا۔ "اپنے آپ کو مہمان سمجھتا ہے! لے اب ہماری مہمان نوازی بھی دیکھ!!"

پھر جب تک میں نے دوبارہ "کام" شروع نہیں کر دیا، وہ مجھ پر ہنٹر برساتا رہا۔ پھر شاید کسی اور لڑکے نے موقع غنیمت جان کر اپنا ہاتھ روک لیا تھا۔ وہ "ملک الموت" اپنا "فریضہ" ادا کرنے اس طرف چلا گیا۔ پھر وہی مانوس چیخیں اور شڑاپ شڑاپ.....!

غنیمت تھا کہ تھوڑی ہی دیر بعد دوپہر کے کھانے کا "وقفہ" ہو گیا ورنہ مجھ میں تو اب ہاتھ ہلانے کی بھی تاب نہیں رہ گئی تھی۔ کھانا وہی تھا جو کہ قیدیوں کے لئے ہوتا ہے یعنی تھوڑی سی پتلی دال اور چند ادھ جلی چپاتیاں..... ظالموں نے پانی دیا ہی نہیں کہ کہیں ہم پہ سستی طاری نہ ہو جائے۔ میں نے دو چار روکھے نوالے زہر مار کئے اور دال غٹاغٹ پی گیا۔ مگر پیاس بھی بھلا پانی کے سوا کسی اور چیز سے بجھی ہے.....!! حلق بری طرح سوکھ رہا تھا۔ زبان چپک کر تالو سے جا لگی تھی۔ مگر پانی نہ ملنا تھا..... نہ ملا..... بعد میں پتہ چلا کہ صبح کام شروع ہونے سے پہلے اور شام کو کام ختم ہونے کے بعد کیمپ والے قیدیوں کو جی بھر کر پانی پلاتے تھے۔ درمیان میں کہیں بھی پانی نہ ملتا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں کیمپ والوں پر سو بار لعنت بھیجی اور دوسرے قیدیوں کے ساتھ واپس "جائے مشقت" کی جانب چل پڑا۔

شام کو جب سائے ڈھلنے لگے تو سب لڑکوں کو واپس ان کی "کمیں گاہوں" میں لے جایا گیا۔ تمام قیدی بری طرح نڈھال ہو رہے تھے۔ میری حالت تو کچھ زیادہ ہی پتلی تھی۔ کیونکہ وہاں میرا یہ پہلا دن تھا۔ گرتے پڑتے قیدی اپنے اپنے خیموں میں پہنچے تو انہیں جی بھر کر پانی پلایا گیا۔ پھر سب نے اپنا مخصوص کھانا کھایا اور گھاس پھونس کے بستروں پر گھوڑے بیچ کر سو گئے۔

صبح سویرے سب قیدیوں کو ٹھوکریں مار مار کر اٹھایا گیا۔ جب تمام قیدی بیدار ہو گئے تو انہیں ناشتہ کرنے کا حکم ملا۔ جس چیز کو ناشتہ کہا گیا تھا وہ ایک پیالی چائے اور چند توسوں پر مشتمل تھا۔ چائے کیا

تھی گدلا سا پانی تھا جو پیالوں میں بھر کر ہمیں دے دیا گیا تھا۔ سب نے مجبوراً اس نام نہاد "ناشتے" کو حلق سے نیچے اتارا..... پیٹ کی آگ بھی تو بجھانا تھی.....!! ناشتے کے بعد آرڈر ملا کہ جس کو جتنا پانی پینا ہے پی لے..... پھر "کام" کے دوران پانی نہیں ملے گا۔ چنانچہ سب نے پیٹ بھر کر پانی پیا کیونکہ ناشتے سے پیٹ بھر ہی نہیں پایا تھا۔ پھر ہمیں ہانک کر پہاڑیوں پر لے جایا گیا تا کہ "دھندے" کا آغاز ہو سکے۔ یہ تھا اس بیگار کیمپ کا روز مرہ کا روٹین.....

شروع کے دو تین دن میرے بازوؤں، کاندھوں اور سینے میں بڑا شدید درد رہا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ایک ہفتے مسلسل آرام کرتا، مگر بیگار کیمپ میں تو آرام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اور وہ بھی "کام" کے اوقات میں.....

چوتھے دن میں نے قیدیوں کے ساتھ کام کیا تو اپنی تکلیف میں خاصی کمی محسوس کی۔ تین دن کی شدید محنت کی وجہ سے میرے بازوؤں اور سینے کے عضلات خاصے ابھر آئے تھے۔ اس کے علاوہ میں اپنی رگوں اور پٹھوں میں بھی کافی سختی محسوس کر رہا تھا۔ گویا میں آہستہ آہستہ اس محنت کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔

جس دن میں اس بیگار کیمپ میں لایا گیا تھا۔ اسی دن سے یہاں سے فرار ہونے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مگر کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی تھی۔ رات کو اپنے خیمے میں سونے کے لئے لیٹتا تو سونے سے پہلے فرار کے امکانات پر خوب سوچ و بچار کرتا۔ کیمپ والوں نے اس پہاڑی وادی کے دامن میں قیدیوں کے لئے دس پندرہ خیمے نصب کر رکھے تھے۔ ہر خیمے میں تقریباً دس قیدی ہوتے تھے۔ اور خیموں کے باہر دو دو پہریدار رات بھر پہرا دیتے ..... تھے۔ چوتھے دن رات کو جب میں قیدیوں کے ساتھ سونے کے لئے لیٹا تو باوجود تھکن کے نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ رہ رہ کر اپنا گھر اور گھر والے یاد آرہے تھے۔ نجانے وہ میرے لئے کتنے فکر مند اور پریشان ہوں گے۔

میں نے ایک آہ بھر کر سوچا۔ گھر والوں کی پریشانی کا خیال مجھے اکثر ستاتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی اپنے ساتھ کے قیدی لڑکوں کا بھی خیال آتا تھا کہ ان کا بھی یقیناً کوئی گھر ہو گا، بہن بھائی اور ماں باپ ہوں گے جو ان کو ہر وقت یاد کرتے رہتے ہوں گے۔ جی چاہتا تھا کہ ان لڑکوں سے بات چیت کروں مگر اس کا موقعہ ہی نہیں ملتا تھا۔ رات کو جب سب اپنے اپنے خیموں میں آتے تو لیٹتے ہی خراٹے لینا شروع کر دیتے۔ یوں کسی سے گفتگو کرنے کا موقع ہی ہاتھ نہیں آتا تھا۔ خیالات کے اسی تسلسل کے دوران نہ جانے کب نیند کی دیوی نے آن دبوچا اور ان فکروں سے تھوڑی دیر کے لئے نجات دلا دی۔

رات کا جانے کونسا پہر تھا۔ میں بے سدھ پڑا خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا کہ اچانک کسی نے میرا شانہ تھپتھپایا۔ میں نے غنودگی میں کروٹ

بدل لی۔ پھر کسی نے مجھے ہلکے سے جھنجھوڑا ..... میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں ..... تاریکی میں ایک ہیولا سا نظر آیا جو میرے اوپر جھکا ہوا تھا .....

"اٹھو ..... جلدی کرو ..... اچھا موقع ہے ..... " ہیولے نے سرگوشی میں کہا۔

"کیا ہوا !! " میں نے آنکھیں ملتے ہوئے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

" دونوں پہریدار باہر پڑے سو رہے ہیں ..... آؤ یہاں سے نکل چلیں۔ اچھا موقع ہے۔ " ہیولے کی سرگوشی پھر سنائی دی۔

میں ہڑبڑا کر فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر میں نے اپنے ساتھی کی مدد سے اپنے خیمے کے تمام قیدیوں کو جگا دیا۔ انہیں جب پتہ چلا کہ کہ باہر راستہ صاف ہے تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اب ہم لوگ فرار کے لئے بالکل تیار تھے ..... خیمے کے باہر دونوں پہریدار زمین پر آڑے ترچھے پڑے خرّاٹے لے رہے تھے۔ ہم نے ان کی رائفلوں پر قبضہ کیا۔ پھر انہیں جاگنے کا موقع دیئے بغیر رائفلوں کے بٹ ان کے سروں پر مار کر انہیں بے ہوش کر دیا۔ سناٹے میں دو ہلکی سی آوازیں ابھریں ..... پھر دوبارہ خاموشی چھا گئی۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ سینے کے بل چت لیٹ کر رینگ رینگ کر آگے بڑھیں گے۔ کیونکہ ضروری نہیں تھا کہ دوسرے خیموں کے پہریدار بھی سوئے ہوئے ہوں۔ ہمارے دیکھ لئے جانے کا امکان تھا۔ جب ہم ان کی "نظروں سے دور" ہو جاتے تو پھر اٹھ کر بھاگ سکتے تھے۔ پاؤں میں پڑی بیڑیاں گھسٹنے میں زیادہ دشواری پیدا نہیں کر رہی تھیں۔ پتھریلی زمین نے اگرچہ ہمارے ہاتھوں پیروں میں خراشیں ڈال دی تھیں مگر ہم آگے بڑھے چلے جا رہے تھے۔ میں تو آزادی کی دُھن میں اپنے ساتھوں سے خاصی دور نکل آیا تھا۔ یہاں تک کہ کچھ دیر بعد میں نے خود کو ایک چھوٹی سی پہاڑی پر پایا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو پتہ چلا کہ ساتھی ابھی خاصے دور ہیں۔ میں پہاڑی کے عین اوپر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا تاکہ اس کی دوسری طرف اتر سکوں۔ اچانک فضا گولیوں کی ہولناک تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی ..... میں نے گھبرا کر پیچھے دیکھا ..... میرے ساتھیوں پر انتہائی طاقتور سرچ لائٹ پڑ رہی تھی اور وہ گولیاں کھا کر خاک و خون میں تڑپ رہے تھے ..... پھر قبل اس کے کہ میرا بھی انہیں جیسا حشر ہوتا، میں نے آنکھیں بند کر کے پہاڑی کی دوسری طرف چھلانگ لگا دی .....

"اے بیٹا! ذرا جلدی سے اٹھ کر آدھا کلو دھلی مونگ کی دال تو لے آ۔ تاکہ میں ہانڈی چڑھا سکوں ..... کھانے کا ٹائم قریب ہے۔ " امی جان کی قریب آتی ہوئی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"اونہہ ہوں .....!! " میں نے منہ بناتے ہوئے، کاپی اور قلم کو ایک طرف رکھ دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ کہانی لکھتے ہوئے اگر بیچ میں کوئی رخنہ پڑ جائے تو بڑی سخت کوفت ہوتی ہے۔ اور اس وقت تو کوفت کی انتہا ہو جاتی ہے، جب کہانی اپنے کلائمکس پر پہنچی ہوئی ہو .....!!"

شرارتی لکیریں

پہلا انعام

فرقان وہاب

دوسرا انعام

عبدالوارث

تیسرا انعام

طارق محمود

خصوصی انعام

سید نیئر آفاق

تفصیل صفحہ ۱۹۶ پر ملاحظہ فرمایئے!

ببلو گبلو

نعیم مشتاق نومی

وہ دونوں بھائی ہو بہو ایک جیسے تھے۔ قد، ڈیل ڈول، چہرہ مہرہ ہر لحاظ سے ایک دوسرے کی فوٹو اسٹیٹ تھے۔ انہیں دیکھ کر یوں لگتا تھا، جیسے کسی نے ایک تصویر کے نیچے کاربن پیپر رکھ کر بڑی مہارت اور صفائی سے اس جیسی دوسری تصویر ٹریس کی ہو۔

ان کے نام "ببلو" اور "گبلو" تھے۔

انہیں دیکھ کر کوئی بھی کنفیوز ہو سکتا تھا اور لوگ ہوتے تھے مثلاً ان کے ٹیچرز، دوست مہمان، رشتہ دار وغیرہ۔ یہ صرف ان دونوں کو معلوم ہوتا تھا کہ کون ببلو ہے؟ اور کون گبلو؟ حد تو یہ تھی کہ ان کے اپنے ماں باپ بھی انہیں فقط لباس سے یا جوتوں اور چال سے پہچانتے تھے۔ اسی بات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ رنگ برنگی شرارتیں کیا کرتے تھے۔

وہ جمعہ کا دن تھا۔ ببلو اور گبلو اپنے بیڈ روم

میں لیٹے ہوئے تھے۔ صبح ہو چکی تھی۔ مگر وہ ابھی تک اپنے بستروں میں گھسے ہوئے تھے ببلو نے ادھ کھلی آنکھوں سے وقت دیکھا۔ صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ اس کے بعد ان کے ڈیڈی کی آواز ابھری۔

"بیٹا! اٹھ جاؤ..... اب تو آٹھ بج رہے ہیں۔" ڈیڈی نے کہا "اور ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے....." ڈیڈی اتنا کہہ کر چلے گئے۔ببلو نے آنکھیں ملیں اور جمائی لیتے ہوئے بستر سے باہر آ گیا

"گبلو خان! اٹھ جاؤ" اس نے بھائی کو آواز دی۔ "ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

"یار! آج تو سونے دو۔" گبلو کروٹ بدل کر بولا۔ "تم کر لو ناشتہ جا کے..... میں بعد میں خود ہی کر لوں گا!"

"گبلو خان! اٹھ جاؤ فائدے میں رہو گے!" ببلو نے کہا۔

"گڈ بائی!" گبلو نے کہا اور دوبارہ سو گیا۔

ببلو منہ ہاتھ دھو کر ناشتے کی ٹیبل پر پہنچ گیا۔

"گڈ مارننگ ڈیڈی!" ..... گڈ مارننگ ماما!" اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"گڈ مارننگ بیٹا۔" اس کے ممی ڈیڈی نے جواب دیا۔

"گبلو نہیں آیا بیٹا! کیا کر رہا ہے وہ؟" ڈیڈی نے پوچھا۔

"ڈیڈی! وہ کہہ رہا ہے، آپ ناشتہ شروع کریں میں بھی آ رہا ہوں!" ببلو نے جواب دیا۔

"اچھا!"

"جی ڈیڈی۔"

"آپ لوگ تو شروع کریں وہ بھی آ جائے گا۔" ببلو کی ممی نے کہا۔

یوں ناشتہ شروع ہو گیا مگر گبلو نہ آیا کیونکہ وہ سویا ہوا تھا۔

"یہ گبلو ابھی تک نہیں آیا۔" ببلو کے ڈیڈی نے تھرمس سے کپ میں چائے ڈالتے ہوئے کہا۔

اس وقت تک ببلو تقریباً ناشتا کر ہی چکا تھا۔

"آپ جا کر دیکھیں تو سہی، یہ آخر کر کیا رہا ہے؟" اس کی ممی بولیں۔

اس کے ڈیڈی اٹھنے لگے تو وہ جلدی سے بولا "ڈیڈی! آپ بیٹھیں میں دیکھتا ہوں وہ ابھی تک کیوں نہیں آیا؟"

ببلو وہاں سے اٹھا اور فوراً اپنے بیڈ روم میں پہنچ گیا۔

"اوئے لیزی بونز (LAZY BONES) ..... اٹھ جاب.....!" ببلو بولا۔ "اب تو پونے نو بج رہے ہیں.....!"

"پلیز یار!..... ڈونٹ ڈسٹرب می!" گبلو نے منہ بنا کر جواب دیا۔ "پورے چھ دن بعد فرائی

ڈے آتا ہے..... کچھ تو خیال کرو!"

"آخری بار کہتا ہوں،..... اٹھ جا!....."

ببلو کو اچانک کچھ سوجھا۔ "ورنہ نقصان اٹھائے گا..... یعنی ناشتے سے ہی جائے گا!"

اتنا کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

ممی ڈیڈی ابھی ناشتے کی ٹیبل پر موجود تھے اور گبلو کا انتظار کر رہے تھے۔اس وقت دونوں کے ہاتھ میں چائے کے کپ تھے۔

اسی وقت گبلو نمودار ہوا۔ قریب پہنچ کر اس نے کہا۔ "گڈ مارننگ.....!" جواب میں ممی ڈیڈی بھی بولے۔ "گڈ مارننگ بیٹا!"

"بیٹا!..... یو آر سو لیٹ.....!" ڈیڈی بولے۔ "کیا کر رہے تھے؟"

"سوری ڈیڈی! وہ بس..... آنکھ لگ گئی تھی.....!" گبلو کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"یہ لو بیٹا! یہ رہا تمہارا پسندیدہ آملیٹ.....!" اسکی ممی نے اس کے سامنے آملیٹ والی پلیٹ رکھتے ہوئے کہا۔

"تھینک یو ممی!" گبلو نے کہا اور پھر فوراً ہی ایک شریر مسکراہٹ کے ساتھ ..... ناشتا شروع کر دیا۔

ناشتہ کرنے کے بعد وہ اٹھ گیا۔ چند منٹ بعد گبلو دوبارہ آیا۔ اس کے ممی ڈیڈی ابھی تک وہیں موجود تھے۔ ممی چائے پی رہی تھیں، جبکہ ڈیڈی اخبار پڑھ رہے تھے۔

"گڈ مارننگ ڈیڈی! گڈ مارننگ ممی!" گبلو نے کہا اور ان کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔

ممی ڈیڈی نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔ "گڈ مارننگ!"

"ممی! لائیے میرا آملیٹ کہاں ہے؟" گبلو نے کہا۔

"آملیٹ!" اس کی ممی حیرت سے بولیں۔

"جی ممی!" گبلو بولا۔

"کیا مطلب؟" اس کی ممی اس کا منہ تکنے لگیں۔

"مطلب یہ ہے ممی کہ ناشتہ کرنا ہے۔" گبلو نے کہا۔

"تو کیا تم نے ناشتہ نہیں کیا؟" اس کے ڈیڈی حیرت سے گویا ہوئے۔

"نو ڈیڈی! میں تو ابھی بیڈ سے اٹھ کر آ رہا ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے ببلو....." اس کے ڈیڈی سمجھ گئے کہ یہ حرکت ببلو نے کی ہے۔ یعنی اس نے گبلو کے کپڑے پہنے اور آ کر دوبارہ ناشتہ کیا۔ یوں اب گبلو کے لئے وہاں نہ آملیٹ تھا اور نہ ہی سلائس اور گبلو ناشتے میں کچھ اور کھاتا بھی

"میں ببلو کو ابھی دیکھتا ہوں آخر اس نے ایسا کیا کیوں؟" اس کے ڈیڈی نے کہا اور ببلو کے کمرے کی طرف چل دیئے۔

"ممی! میرا ناشتہ۔" گبلو رونی صورت بنا کر بولا۔

"تم بیٹھو! میں ابھی آملیٹ بنا کر لاتی ہوں۔" اس کی ممی نے کہا اور اٹھ کر کچن میں چلی گئیں۔

اس کے ڈیڈی جب ببلو کے کمرے میں پہنچے تو ببلو وہاں موجود نہیں تھا۔ بلکہ ایک بڑا سا کاغذ سامنے ہی پڑا تھا جس پر کچھ لکھا ہوا تھا اور اس ہینڈ رائٹنگ کو وہ بخوبی پہچانتے تھے۔ یہ ببلو کی رائٹنگ تھی۔

انہوں نے پڑھا، لکھا تھا۔

"ڈیئر ممی اینڈ ڈیڈی!

آئی ایم رئیلی سوری! میں نے جو کچھ کیا، یہ گبلو بھائی کی بہتری کے لئے کیا ہے کیونکہ وہ صبح جلدی نہیں اٹھتا۔ آج کے بعد ہو سکتا ہے، وہ ناشتے کے ڈر سے جلدی اٹھا کرے اور مجھے پورا یقین ہے آپ بھی یہی چاہیں گے کہ وہ صبح سویرے وقت پر اٹھا کرے۔

اس کے باوجود اگر آپ کو میری یہ حرکت ناگوار گزرے تو بے وقوف بیٹا سمجھ کر معاف کر دیجئے گا۔

آپ کا بیٹا..... ببلو"

پوری تحریر پڑھنے کے بعد اس کے ڈیڈی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ انہیں ببلو کی یہ شرارت اچھی لگی تھی کیونکہ اس میں ایک تعمیری جذبہ پوشیدہ تھا۔ وہ وہاں سے واپس ناشتے کی ٹیبل پر پہنچ گئے۔

عین اسی لمحے اس کی ممی بھی وہاں پہنچ گئیں۔

"بیگم! بھئی گبلو بیٹا کو نیا آملیٹ بنا دو۔" ڈیڈی بولے۔

"مجھے سمجھ نہیں آ رہا یہ اچانک انڈے کہاں غائب ہو گئے ہیں؟" اس کی ممی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولیں۔

"ابھی کچھ دیر پہلے میں نے جب آملیٹ بنایا تھا تو فرج میں آٹھ دس انڈے پڑے تھے جب کہ اب میں نے دیکھا ہے تو انڈوں کا نام و نشان نہیں وہاں پر۔"

یہ سن کر اس کے ڈیڈی مسکرا دیئے۔

"آپ مسکرا رہے ہیں!" ممی کی حیرت مزید بڑھ گئی۔

"جی ہاں!" وہ اطمینان سے بولے۔

"حیرت ہے۔"

"حیرت نہیں حرکت ہے، ببلو کی!" وہ مسکرا کر بولے۔

ممی کے منہ سے ایک لمبی سانس نکلی۔ "تو یہ بات ہے۔"

انہوں نے سر ہلا کر کہا۔

"جی ہاں!" ڈیڈی نے مسکرا کر سر ہلایا۔

"بالکل یہی بات ہے۔"

"مگر کیوں؟" ممی نے پوچھا۔ "اس نے ایسا کیوں کیا؟"

"یہ پڑھئے اس میں آپ کے سوال کا جواب موجود ہے۔" انہوں نے ببلو کا لکھا ہوا رقعہ نما

مختلف زبان لکھنے کے لئے مختلف ہاتھ

امریکہ کے ۲۰ویں صدر "جیمس گارفیلڈ" جو ۱۸۸۱ء میں صرف دو ماہ صدر رہے تھے۔ لاطینی زبان دائیں ہاتھ سے اور یونانی زبان بائیں ہاتھ سے بیک وقت تحریر کرتے تھے۔

کاغذ ان کے ہاتھ میں دے دیا۔

"میرا ناشتا!" گبلو بولا۔ "میں کیا کھاؤں۔"

اس کے انداز میں بے بسی کے ساتھ ساتھ غصہ بھی شامل تھا۔

"بیٹا! آج دودھ یا مکھن کے ساتھ گزارا کرو۔" ڈیڈی بولے۔

"دودھ! مکھن!" گبلو نے برا سا منہ بنایا۔

مگر چونکہ بھوک لگی تھی، لہٰذا ناشتہ تو کرنا ہی تھا، لہٰذا وہ مکھن کے ساتھ توس نگلنے لگا۔

ببلو کی تحریر پڑھ کر اس کے ڈیڈی کے ساتھ ساتھ اس کی ممی بھی مسکرانے لگیں۔

اس دن کے بعد آملیٹ کے ڈر سے گبلو ہمیشہ جلدی اٹھا۔ چاہے وہ دن فرائی ڈے ہو یا کوئی اور اس شرارت پر ببلو کو اپنے ممی ڈیڈی سے انعام بھی ملا تھا۔ مگر گبلو کے سامنے نہیں..... چھپ چھپا کر..... جی ہاں!

اور اب آخر میں ایک گزارش ہے کہ آپ یہ بات گبلو کو نہ بتایئے گا۔

وضاحت

محترم قارئین!

اب تک آنکھ مچولی کا سالانہ چندہ -/۱۵۰ روپے تھا۔ لیکن ڈاک کے اخراجات میں ہوشربا اضافے کے بعد ہمیں بادلِ نخواستہ اس میں اضافہ کرنا پڑ رہا ہے۔ آنکھ مچولی کے دس عام اور دو خاص شماروں کی سالانہ قیمت مع رجسٹرڈ ڈاک خرچ -/۲۶۰ روپے بنتی ہے جبکہ ممبرشپ حاصل کرنے والے قارئین کو ان بارہ شماروں کے لئے صرف -/۲۰۰ روپے ادا کرنے ہوں گے۔ یوں قارئین کو -/۶۰ روپے کی خصوصی بچت ہوگی اور سال بھر آنکھ مچولی باقاعدگی سے ملتا رہے گا۔

البتہ پہلے سے ممبرشپ رکھنے والے ساتھی اپنی ممبرشپ کی مدت پوری ہونے تک اس اضافے سے مستثنیٰ ہوں گے۔

ہمیں امید ہے کہ قارئین ہماری مجبوری کا احساس کرتے ہوئے اس اضافے کو قبول فرمائیں گے۔

(ادارہ)

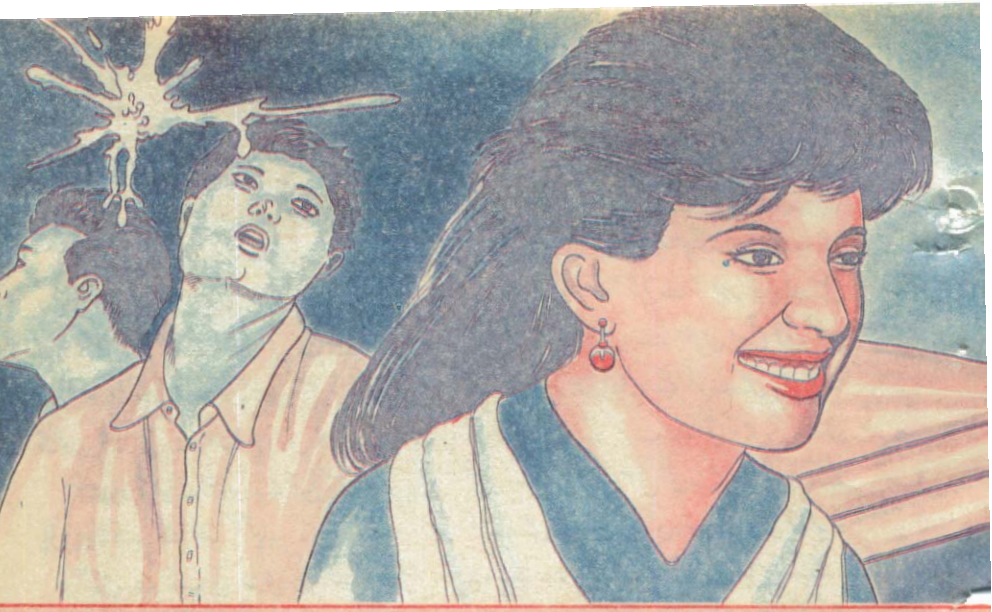

یونیورسل شرارتی

سیدہ صدف عرفان

"لو بھلا یہ بھی کوئی شرارتیں ہیں جو آپ کرتے ہیں۔ نازو آپا کی آدھی چٹیا کاٹ دی، فریحہ آپی کی دوست آئیں تو کمرے میں مینڈک چھوڑ دیا، مُردہ چھپکلی کو دُم سے یا جھینگر کو مونچھ سے پکڑا اور سُنبل کے پیچھے بھاگتے پھرے۔ میں تو ایسی شرارت مان ہی نہیں سکتی۔"

میں بھائی جان سے بحث کر رہی تھی جبکہ بھائی جان اپنے آپ کو یونیورسل شرارتی ثابت کرنے پر مصر تھے۔

"یہ کیوں نہیں کہتیں کہ تم کوئی شرارت کر ہی نہیں سکتیں۔" بھائی جان نے مجھے تاؤ دلایا اور واقعی مجھے غصہ آ گیا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ اس مرتبہ شرارت ہوگی اور آپ کے ساتھ ہی ہوگی۔" میں نے چیلنج کر دیا جسے انہوں نے ہوا میں مُکا لہراتے ہوئے قبول کر لیا۔

"پیاری صدف کہاں ہو تم!"

بھائی جان کے لب و لہجے سے شیرینی ٹپک رہی تھی۔ میں جو دروازے پر کھڑی بھائی جان کے حصے کی رس ملائی پہ ہاتھ صاف کر رہی تھی، چونک گئی جلدی جلدی منہ چلایا اور باہر نکل آئی۔

"کیا بات ہے؟"

"میرا دوست آرہا ہے۔ لاہور سے۔ رات بارہ بجے تک پہنچے گا۔" بھائی جان نے اطلاع دی۔

"تو میں کیا کروں؟"

"تم یہ کرو کہ میرے ساتھ جاگتی رہو۔ دونوں بیٹھ کر ٹیرس پر باتیں کرتے رہیں گے۔ ورنہ مجھے نیند آ جائے گی اور اس کے لئے دروازہ کون کھولے گا۔ وعدہ کرتا ہوں صبح تم پر نہ پانی پھینکوں گا نہ امّی سے ڈانٹ پڑواؤں گا۔"

مجھے یاد آگیا کہ انہوں نے آج صبح ہی مجھ پر پانی پھینکا تھا۔ مجھے غصّہ آ گیا۔

"میں نے آپ کی ساری رس ملائی کھا لی ہے۔" میں نے انہیں غصّہ دلایا۔

"ایں......" وہ چونکے۔

"اچھا چلو کوئی بات نہیں بہنیں، بھائیوں کی چیزیں کھا ہی لیتی ہیں۔" ان کا لہجہ پھر سے میٹھا ہو گیا۔

"میں نے وہ کوک بھی پی لی ہے جو آپ نے فرج میں چھپائی تھی۔" میں نے آخری حملہ کیا۔

"کک کوک۔" بھائی جان نے تھوک نگلا۔

"کوئی بات نہیں بھائیوں کی چیز پی بھی لی جاتی ہیں۔"

"میں آپ کے یہ جملے ٹیپ کروں گی۔" میں نے ہٹ دھرمی دکھائی۔

"چلو کر لو۔" بھائی جان نے کمزور لہجے میں کہا۔

نیند ان کی سب سے بڑی کمزوری تھی جو صرف باتیں کرنے ہی سے بھاگتی تھی۔

میں مان گئی تھی لیکن پھر اچانک ہی میرے ذہن میں جھماکا ہوا۔ "شرارت" خود کو یونیورسل شرارتی منوانے کا اس سے بہترین موقع کوئی نہیں تھا۔ میں اوپر بھائی جان کے کمرے میں چلی گئی۔ دو گھنٹے بعد ان کے کمرے سے نکلی تو میں مسکرا رہی تھی۔ ساری کاروائی مکمل تھی۔ بس بھائی جان کے کمرے میں جانے کی دیر تھی، اور مجھے یقین تھا کہ وہ بارہ بجے سے پہلے کمرے میں نہیں جائیں گے۔

رات بارہ بجے تک ہم دونوں باتیں کرتے رہے۔ امّی ابّو سو چکے تھے۔ جب ان کے دوست آ گئے تو بھائی جان نے خوشامد شروع کر دی۔ "میرا دوست تھکا ہارا آیا ہے اس کے لئے چائے بنا دو۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" میں مان گئی۔

"ہونہہ تو یہ مزے ہیں۔ ڈیپ فریزر میں آئس کریم کے دو کپ اور سیون اپ کی دو بوتیں رکھی تھیں۔ صرف دو کپ اور دو بوتلیں۔ اچھا بچّو! اب کروں گی میں اصلی شرارت۔"

چائے تو میں نے بھائی جان کے "تھکے ہارے" دوست کے لئے شرارت کی بجائے شرافت سے بھجوا دی اور خود اوپر ٹی وی لاؤنج میں آ کر چُھپ گئی۔ سامنے ہی بھائی جان کا کمرہ تھا۔

بھائی جان اپنے دوست کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے سوئچ پر ہاتھ مارا۔ "لائٹ ندارد، اوہ شاید لائٹ چلی گئی ہے۔ میں موم بتی لے کر آتا ہوں۔"

ڈھونڈ ڈھانڈ کر موم بتی لائے۔ "تم نہا دھو کر فریش ہو جاؤ۔ آج گرمی بھی بہت ہے۔ انہوں نے بے خیالی میں پنکھے کا سوئچ بھی دبا دیا۔ "تڑ، تڑ، تڑ" پنکھے کے تینوں پروں پر رکھے ہوئے پانی کے ڈونگے نیچے گرے۔ بھائی جان اور ان کے دوست "بارش" میں نہا گئے تھے۔ اندھیرا گرمی اور اوپر سے برستے ڈونگے۔ ایک لمحے کو بھائی جان بھی بوکھلا گئے۔ ان کے دوست تو شکل ہی سے "حواس باختہ" لگ رہے تھے۔ چیخ مار کر بھائی جان سے لپٹ گئے۔ بڑی مشکل سے انہیں علیحدہ کیا۔ وہ جان ہی چکے تھے کہ یہ شرارت کس نے کی ہے؟ لائٹ بھی موجود تھی، پنکھوں کا چلنا اس بات کا ثبوت تھا۔ انہوں نے بلب والے سوئچ پر ہاتھ مارا تو کمرہ روشن ہو گیا۔ بھائی جان کے کمرے میں ایک ٹیوب لائٹ اور ایک بلب لگا ہوا ہے۔ عموماً ٹیوب لائٹ ہی استعمال ہوتی ہے۔ اسی لئے میں نے ٹیوب لائٹ نکال لی تھی۔

روشنی ہوئی تو ایک اور منظر سامنے تھا۔ بھائی جان کے تمام کپڑے سلیقے سے تہہ کر کے اٹیچی میں رکھ دئے گئے تھے۔ ایک ہینڈ بیگ بھی اٹیچی کے ساتھ کمرے کے وسط میں رکھا تھا جس میں جوتے بھرے ہوئے تھے۔

"ارے تم کہیں جا رہے تھے کیا؟" بھائی جان کے دوست نے حیرت سے پوچھا۔

"ارے سوئیٹر بھی رکھے ہوئے ہیں۔ سوات کا پروگرام لگتا ہے میں بھی چلوں گا، لاہور کی گرمی نے تو حالت خراب کر دی ہے۔ دو تین دن بعد پروگرام رکھ لیتے ہیں۔" دوست نے کھڑے کھڑے پروگرام بھی تیار کر لیا۔

"ہاں، ہاں چلیں گے۔ فی الحال تم یہاں ٹھہرو، بلکہ بستر پہ بیٹھو میں تمہارے لئے آئس کریم لے کر آتا ہوں۔"

تھوڑی دیر میں بھائی جان ٹرے لئے واپس آئے۔ "یہ لو پہلے بوتل۔ میں ذرا یہ اٹیچی ایک طرف کر دوں۔"

"تم کیوں نہیں لے رہے۔ کیا بہت ٹھنڈی ہے؟" بھائی جان نے دوست کو بوتل پیتے نہ دیکھ کر کہا۔

"آں ہاں۔ پی رہا ہوں۔" بھائی جان کے دوست کی حالت دیدنی تھی۔

"اور سناؤ کیسی گزر رہی ہے؟" بھائی جان نے اپنی بوتل اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ "بس اب تک تو ٹھیک ہی تھی لیکن اب....."

"اب ..... کیا ..... اب حالت خراب ہو گئی ہے کیا..... یا..... یا....." بھائی جان نے بوتل کا سپ لے لیا تھا۔

"ارے اس میں تو نمک مرچ ملا پان ہے۔" ان کے منہ سے نکلا۔

"ہاں اس میں بھی ہے۔" دوست جو زبردستی کی مسکراہٹ ہونٹوں سے چپکائے سیون اپ سے شغل فرمارہے تھے۔ بول اٹھے اور بوتل یوں ہاتھ سے چھوڑی جیسے بوتل نہ ہو کیڑا ہو۔

بھائی جان کھسیا گئے تھے۔

"اچھا، تم یہ آئس کریم تو لو۔" انہوں نے پولکا کپ کا ڈھکنا اٹھایا تو بھونچکے رہ گئے۔ دونوں کپ خالی تھے اور ان میں کاغذ کا ایک ٹکڑا رکھا تھا جس پر تحریر تھا۔

"بہنیں، بھائیوں کی چیزیں کھا بھی لیا کرتی ہیں اور پی بھی لیا کرتی ہیں۔"

وہ دن اور آج کا دن بھائی جان مجھے یونیورسل شرارتی کہتے ہیں۔ کیونکہ ایک ہی دفعہ میں جتنی شرارتیں میں نے کیں وہ آج تک نہیں کر سکے۔

گئے تھے نوڈلز کھانے پڑ گئے جان کے لالے

آنکھ مچولی

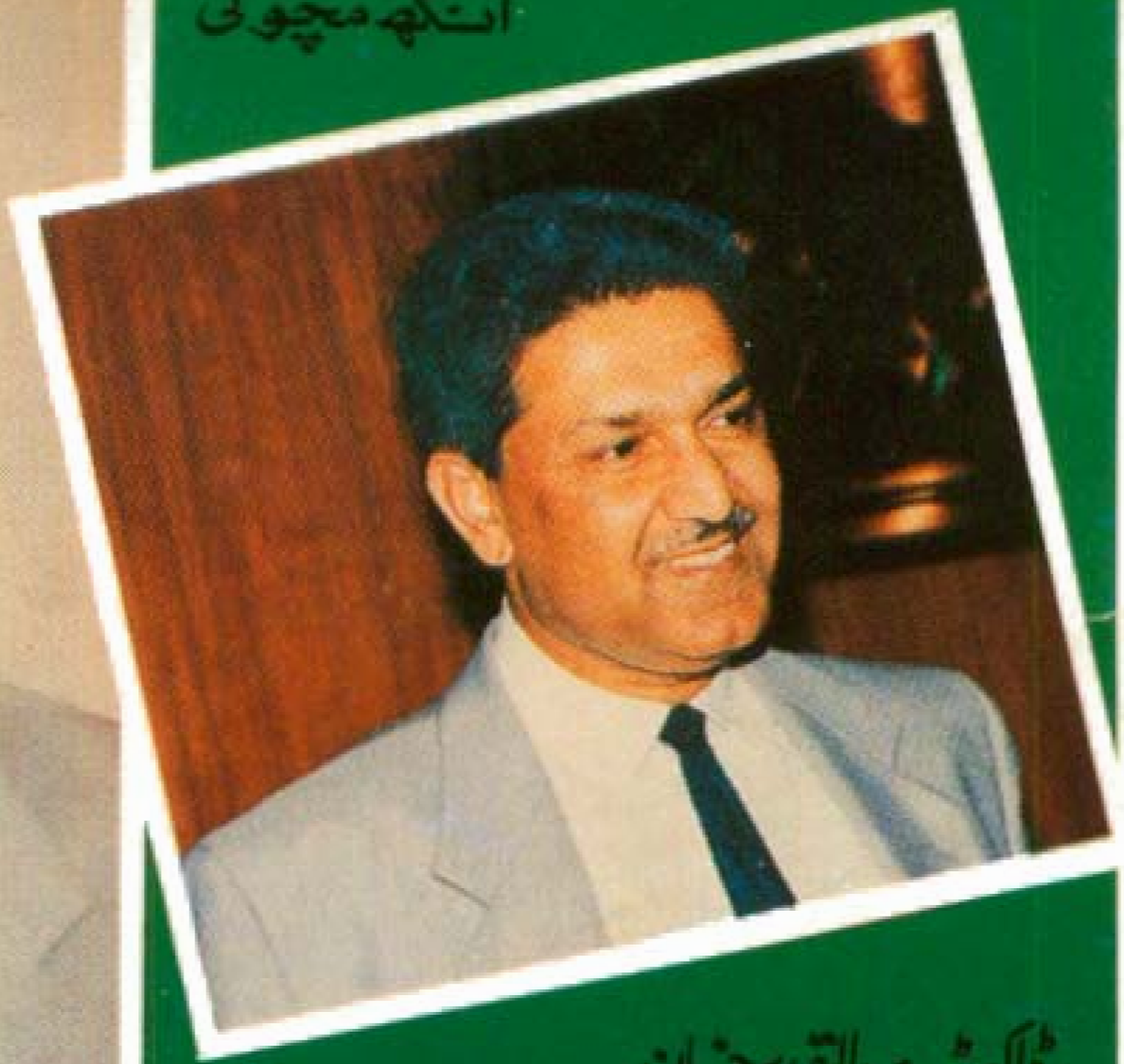

ڈاکٹر عبدالقدیر خان

نام : _____

کلاس: _____

اسکول : _____

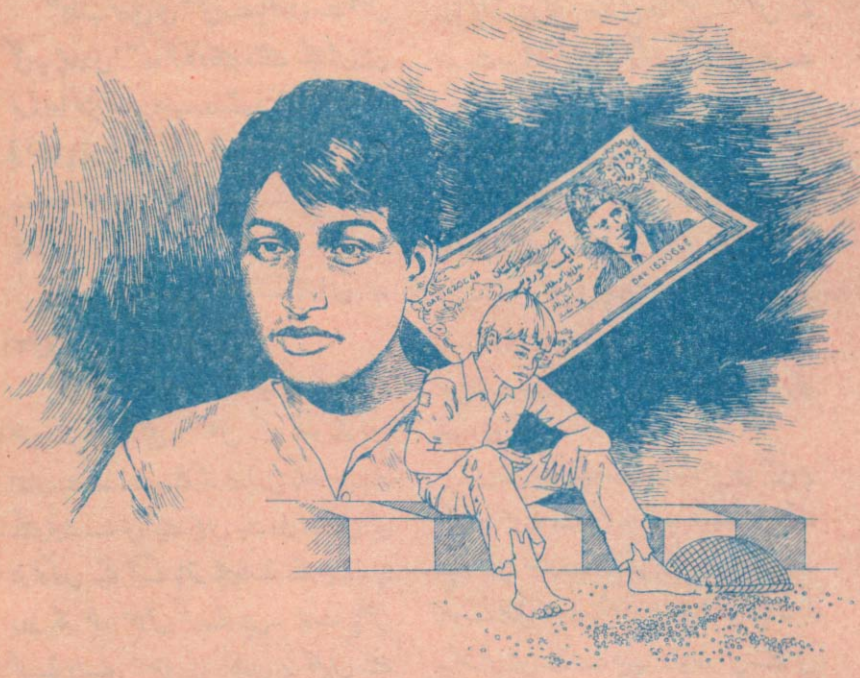

شرارت دیگر

شازیہ فرخین

مرکزی چوک پہ پہنچتے ہی میری آنکھیں دکھ سے بھر آئیں۔ سڑک کے عین وسط میں وہ چھوٹا سا بچہ بیٹھا اپنی قسمت پر آنسو بہا رہا تھا۔ اس کی چنے فروخت کرنے کی چھوٹی سی چھابڑی سڑک پر الٹی پڑی تھی اور لوگ بڑی دلچسپی سے اس کے آنسوؤں کے بہنے کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔

بیساختہ کسی ارادے کے بغیر میں اس لڑکے کے قریب گیا اور اس کے ننھے ہاتھوں کو تھام کر حوصلہ دیا مگر وہ مسلسل روئے جا رہا تھا۔

"کس کی غلطی تھی؟" میں نے سوال

داغا۔

"جناب میری ہی غلطی سے ہاتھوں سے پھسل گئی یہ چھابڑی!" وہ لڑکا دھیمے دھیمے لہجے میں بین کرتا ہوا کھڑا تھا اور جب روتے روتے بے حال ہوا تو فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے وہ فٹ پاتھ پر گرے ہوئے چنے اٹھا کر چھابڑی میں ڈال دیتا۔

"باپ ہے تمہارا؟" میں نے پھر اس سے سوال کیا۔

"وہ جی باپ ہوتا تو مجھے یہ کام کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔" اس کے آنسو کچھ اس انداز سے بہہ رہے تھے کہ میرا دل پگھلا جا رہا تھا مجھے ہمیشہ سے ہی ایسے بچوں سے دلی ہمدردی تھی جو لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلانے کے بجائے اپنا روز گار خود تلاش کرتے ہیں۔ بوٹ پالش کرنے والے، مستری کی دکانوں پر گالیاں سننے والے، ہوٹلوں میں لذیذ کھانے پیش کرنے والے، بھاری اینٹیں اٹھانے والے۔ غرض کہ ایسے تمام بچے مجھے اچھے لگتے ہیں، ان کے محنتی ہاتھوں سے مجھے عقیدت ہے، ان کے بہتے پسینے سے مجھے محنت کی خوشبو آتی محسوس ہوتی ہے۔

میں ابھی سوچوں کے سفر میں آگے ہی آگے نکلا جا رہا تھا کہ میں نے دیکھا اس کے آگے لوگوں نے پانچ اور دس روپے کے ڈھیر لگا دیئے۔

اس نے جو یہ دیکھا تو سرعت سے اٹھا اور اپنے ہاتھ پیچھے کر لئے۔

"نہیں مجھے یہ بھیک نہیں چاہئے مجھے بھوکا رہنا گوارا ہے لیکن بھکاری بننا نہیں۔" اس کے منہ سے یہ جملہ ادا ہوا تو لوگوں نے عقیدت سے اسے دیکھا گویا وہ اس کی باتوں سے مرعوب ہوئے جا رہے تھے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سب نے اپنے پیسے اٹھا لئے اور ادھر ادھر چل نکلے۔ مجھے نجانے کیا ہوا کہ میں وہاں سے قدم نہ ہلا سکا اور اس کے قریب بیٹھ کر اس کی پشت پر اپنا ہاتھ رکھ دیا پھر میرے ہاتھ میری جیب میں رینگ گئے جہاں سو کا سرخ نوٹ بوقت ضرورت کے لئے میں نے رکھ چھوڑا تھا۔

بس میں نے چپکے سے وہ نوٹ اس کی ہتھیلی پر رکھا اور محبت سے بولا۔ "یہ بھیک نہیں تحفہ ہے، میں تمہارے بڑے بھائی جیسا ہوں اور چھوٹے بھائی کا دکھ بانٹنا میرا اخلاقی فرض ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اسے چپ کرایا اور اس لمحے اس کی آنکھوں سے میرے لئے عقیدت کے موتی ٹپک پڑے۔ پھر میں وہاں سے چل دیا کہ کہیں اس کا فیصلہ تبدیل نہ ہو جائے۔

اگلے کئی روز تک میری بھٹکتی نظریں اس کی تلاش میں رہیں مگر وہ نظر نہ آیا ہاں آج صدر کے ریگل چوک پر وہ مجھے نظر آیا۔ میں اس کا حال پوچھنے آگے بڑھا ہی تھا کہ جو منظر میری آنکھوں نے دیکھا وہ میرے لئے ناقابل یقین تھا۔ اس نے بڑی تیزی سے اپنی ہی ٹکر سے ارادتاً چھابڑی سڑک پر اس خوب صورتی سے

گرائی کہ میں اس کی ہاتھ کی صفائی پر حیران رہ گیا اور پھر اسی روز کی طرح وہ سڑک کے کنارے بیٹھا آنسو بہا رہا تھا۔

اچھا تو ایک ساتھ بڑی رقم ہتھیانے کی یہ چال ہے، میں نے غصے سے مٹھیاں بھینچیں اور قریب جا کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔

"دھوکے باز، تو یہ کرتا پھرتا ہے۔" میری رگیں غصے سے تن گئیں تھیں اور اب مجھے وہ سو کا نوٹ شدت سے یاد آ رہا تھا جو میں نے ثواب کی خاطر اسے دیا تھا۔

"بھائی! میری بات تو سنو۔" وہ بڑبڑایا لیکن میں سخت مشتعل تھا اور مجھے اپنا سو کا نوٹ کسی صورت میں بھی اس سے واپس لینا تھا۔

"کہاں ہے تمہارا گھر جلدی بتاؤ۔" میں نے غصے سے گھُر کا تو وہ گیدڑ کی طرح دبک کر مجھے اپنے گھر کی طرف لے جانے لگا۔

آدھے گھنٹے کی مسافت کے دوران میں اسے لعنت ملامت سے نوازتا گیا بالآخر اس کے گھر پہنچ کر میں مزید حیران ہوا۔

یہ گھر تو ہماری ماسی کا تھا جو ہمارے پرانے گھر میں برتن دھونے آیا کرتی تھی لیکن ماسی تو بہت نیک، پارسا تھی لیکن اولاد کس قدر بد دیانت، دھوکے باز ہے۔

میں نے ماسی کو سلام کیا تو ماسی نے حیرانی سے مجھے دیکھا میرا حال پوچھا اور پھر اپنے بیٹے کو میرے ساتھ مجرم کی طرح دیکھ کر وہ کچھ پریشان سی ہوئی۔ "کیا ہوا عبداللہ!" وہ بڑبڑائی۔

"ماسی! تعجب ہے تم جیسی عورت کا بیٹا، اس قدر دھوکے باز بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے تمہید باندھی اور پھر ساری تفصیل اس کے آگے گوش گزار کر دی۔ یہ سننا تھا کہ ماسی نے دھڑا دھڑ عبداللہ کو مارنا شروع کر دیا ابھی وہ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گئی تھی کہ میں نے بڑی مشکل سے عبداللہ کو اس سے الگ کیا۔

"بتا کیوں کیا تو نے ایسا؟" ماسی بلند لہجے میں دھاڑی۔

"اماں قسم لے لو، آج میں نے شرارت سے چھابڑی الٹی تھی بابو سمجھ رہے ہیں کہ یہی میرا کاروبار ہے۔"

"تو کیوں کی ایسی شرارت؟" ماسی نے اس کے بال پکڑے۔

"میں نے سوچا کہ شاید اس طرح اس روز کی طرح دو وقت کے بجائے تین وقت کا کھانا نصیب ہو جائے۔" اس نے ہچکیوں کے درمیان روتے ہوئے کہا تو میں کچھ دیر وہاں جم سا گیا۔

عین اس لمحے مجھے زور دار ڈکار آئی، آپی کا بنایا ہوا فریش کریم کیک کچھ زیادہ ہی بد ہضمی پیدا کر گیا تھا۔ میں نے شرمندگی سے اپنے آپ کو اور پھر اس محنت کش بچے کو دیکھا جو اپنی پہلی شرارت پر ماسی کے سامنے ہاتھ اٹھائے توبہ کر رہا تھا۔

مناسب دام ۔ بہت آرام

آنکھ مچولی

گھر بیٹھے پایئے

86 روپے بچایئے

آنکھ مچولی کے ۱۰ عام اور ۲ خاص شماروں کی
سالانہ قیمت مع رجسٹرڈ ڈاک خرچ ۲۶۰ روپے بنتی ہے

مگر؟

ممبر شپ حاصل کرنے پر ۶۰ روپے کی خصوصی بچت

آپ ہمیں ۲۰۰ روپے کا منی آرڈر روانہ کر دیجئے
ہم آپ کو سال بھر آنکھ مچولی باقاعدگی سے بھجواتے
رہیں گے۔

منی آرڈر فارم پر اپنا مفصل نام
اور پتہ ضرور لکھئے۔
مشرقِ وسطیٰ کیلئے ۴۰۰ روپے
امریکہ اور یورپ کیلئے ۵۰۰ روپے

منی آرڈر اس پتے پر روانہ کریں

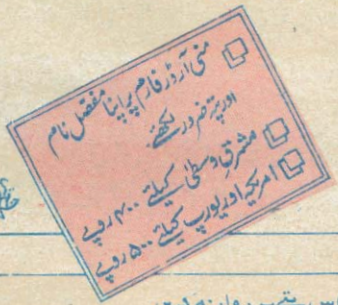

ماہنامہ آنکھ مچولی۔ 1۔پی۔آئی۔بی کالونی، کراچی ۔۵

اُف میری کہانی

شیر علی چنگیزی

مانو ہماری گول مٹول سی پیاری بلی کا نام تھا۔ چمکتی آنکھیں، خوب صورت سے کھڑے کان، ننھی منی ناک، لمبے لمبے براؤن بال اور لمبی سی موٹی دم جس پر کبھی کبھار غلطی سے پاؤں پڑنے پر مانو چلا اٹھتی تھی۔ مانو سیامی نسل کی بلی تھی اس لئے بہت کم آواز نکالتی۔ کبھی بھوک لگتی تو میاؤں کہہ کر پکارتی ورنہ خاموشی سے ادھر.... ادھر پھرتی رہتی۔ اس لحاظ سے مانو گھر بھر میں "شرافت کا پیکر" کے نام سے مشہور تھی۔ جب مانو ہمارے گھر میں لائی گئی اس وقت میں چھوٹا سا تھا یہی کوئی آٹھ نو برس کا ناسمجھ بچہ اور شرارتوں کا پتلا۔ مانو کیا آئی میرے ہاتھ کھلونا آگیا۔ دن بھر

میں مانو کے پیچھے بھاگتا پھرتا۔ ہاتھ آنے پر دم سے پکڑ کر اٹھا لیتا۔ مانو بھی شاید ابھی چھوٹی تھی اس لئے پنجے جھاڑنے سے ڈرتی ہوگی، میں شیر ہو گیا۔ کبھی اسے بستے میں بند کر دیتا تو کبھی تکیئے کے غلاف میں چھپا دیتا۔ جب گھبرا کر اچھلتی کودتی تو مجھے بہت مزا آتا۔ آہستہ آہستہ میں شرارتوں کی آخری سرحدیں بھی عبور کرنے لگا۔ ننھی سی جان کو پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیتا اور پھر قینچی سے مونچھیں غائب ہوتیں۔ بستے میں بند کر کے بستہ فضا میں اچھال دیتا اور چیختی چلاتی مانو چند لمحوں بعد دھپ سے پتھریلی زمین پر گرتی۔ اسے کوئی چوٹ نہ آتی تو مارے غصے کے دوبارہ اچھال دیتا مگر مانو ویسی کی ویسی نظر آتی اور پھر ایک دن جب میں اپنے چچا اشرف کے گھر سے لوٹا تو مانو کمرے کے باہر برآمدے میں کاغذ کے ٹکڑے سے کھیل رہی تھی جسے کبھی اپنے ایک ہاتھ سے ہلاتی کبھی دوسرے ہاتھ سے۔ کاغذ کچھ دور جاتا تو مانو بھاگ کر دونوں ہاتھوں سے کاغذ کو دبوچ لیتی۔ اس وقت مانو بڑی پیاری لگ رہی تھی میں پکڑنے کے لئے آگے بڑھا تو مانو ڈر کر باہر کو بھاگی۔ میں بھی پیچھے پیچھے دوڑا۔ جیسے ہی مانو گیٹ سے باہر سڑک پر نکلی زوں کی آواز کے ساتھ ایک تیز رفتار کار مانو کے اوپر سے گزر گئی۔ میں نے چیخ ماری اور خوف سے آنکھیں بند کر لیں مگر پھر یہ دیکھ کر میرے منہ سے اطمینان بھری سانس نکل گئی کہ مانو لنگڑاتی ہوئی دوسری جانب نکل گئی ہے۔ مانو کی ٹانگ زخمی ہو گئی تھی۔ میں بھاگا بھاگا ابو کے پاس پہنچا اور اپنی توتلی زبان سے کہنے لگا۔

"ابو ابو! وہ مانو بلی تی ٹانگ میں توت لگ گئی ہے آپ تلیں۔" (ابو ابو! وہ مانو بلی کی ٹانگ میں چوٹ لگ گئی ہے آپ چلیں) ابو مسکراتے ہوئے اٹھے اور میرے ہمراہ مانو کے پاس پہنچے۔ مانو گھاس پر بیٹھی اپنی زخمی ٹانگ چاٹ رہی تھی۔ ابو نے مانو کو پکڑ کر دوا لگائی اور چند دنوں میں مانو بھلی چنگی ہو گئی مگر میری شرارتیں اسی طرح جاری تھیں۔

سال گزر گیا اب میں پانچویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ ایک روز میں اسکول سے واپس آیا تو اچانک مجھے خیال آیا کہ مجھے کوئی کہانی لکھنی چاہئے۔ بچوں کے رسالوں میں کہانیاں تو میں پڑھتا رہا تھا لیکن لکھنے کا خیال پہلی بار آیا تھا۔ اور اب میں کاپی پینسل ہاتھوں میں لئے بیٹھا سوچ رہا تھا مگر کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا لکھوں کہاں سے شروع کروں؟ کہانی نقل کرنے کے بارے میں میں سوچ بھی نہ سکتا تھا آخر جب کچھ نہ لکھ سکا تو غصے سے پینسل کاپی میز پر پٹخ کر اٹھا اور باہر لان میں جا کر بیٹھ گیا۔ سامنے مانو چڑیوں سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ مانو کو خوشی سے کھیلتا دیکھ کر میں تلملا اٹھا اور اپنا غصہ مانو پر اتارنے کے لئے مانو کو پکڑا اور اپنے خالی بیگ میں بند کر دیا پھر چھت پر جا کر بیگ نیچے پھینک دیا۔ مانو غراتی ہوئی دھپ سے پتھریلی زمین پر گری تو مجھے عجیب طرح

کی خوشی محسوس ہوئی۔ دو تین مرتبہ یہ حرکت دہرانے کے بعد میں نے بیگ کمرے میں رکھ دیا، ارادہ تھا کہ مانو کو دو تین دن بیگ میں ہی بھوکا پیاسا بند رکھوں گا۔

آج دوسرا دن تھا جب کہانی لکھنے کے لئے مجھے کوئی پلاٹ نہ سوجھ رہا تھا۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا صفحہ پر صفحہ پھاڑتا جا رہا تھا کہ اچانک میرے ذہن میں ایک خوبصورت کہانی کا خیال آیا اور کاغذ پر میرا قلم تیزی سے چلنے لگا تقریباً تیس منٹ مسلسل لکھنے کے بعد میری کہانی مکمل تھی۔ میں نے فخریہ انداز میں مکمل کہانی کو دیکھا اور پھر پڑھنے لگا۔

"جب تک مجھے وہ پیلا لہنگا نہیں مل جاتا میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔" اتنا کہہ کر عائشہ نے دروازہ بند کر دیا اور ممی ٹرے ہاتھوں میں لئے کھڑی رہ گئیں۔

ابھی میں اتنا ہی پڑھ پایا تھا کہ اچانک میرے ہاتھوں پر کوئی وزنی چیز گری اور اگلے لمحے کہانی میرے ہاتھوں سے غائب تھی۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا [illegible] تھی جو میری کہانی منہ میں دبائے تیزی [illegible] جا رہی تھی۔ میں چیخا ...... "مانو واپس آؤ۔ مانو!!" ...... اور پیچھے بھاگا۔ مانو تیزی سے بھاگتی ہوئی دروازے کے نیچے موجود خلا سے اسٹور کے اندر گھس گئی۔ میں نے اسٹور کے دروازے کو دھکا دیا مگر پھر رک گیا۔ دروازے پر بڑا وزنی تالا میرا منہ چڑا رہا تھا۔

میں تیزی سے واپس مڑا اور بھاگ کر ابو کے کمرے تک پہنچا۔ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر موجود چابیوں کا گچھا اٹھایا اور اسٹور کے تالے پر آزمانے لگا۔ ایک ایک کر کے تمام چابیاں دیکھ ڈالیں مگر تالے کو نہ کھلنا تھا نہ کھلا۔ میں پیر پٹختا ہوا باورچی خانے کی طرف مڑا جہاں امی کھانے کی تیاریوں میں مصروف تھیں ...... "امی جان وہ اسٹور کی چابی کدھر ہے؟۔"

"بیٹا! وہ تو تمہارے ابو ساتھ لے گئے ہیں۔" امی پیاز کاٹتے ہوئے بولیں۔

"جی! ابو ساتھ لے گئے ہیں مگر امی جان ابو جان کو چابیوں سے کیا کام؟"

"بیٹے! اسٹور میں کل کچھ ضروری اور قیمتی اوزار رکھوائے ہیں اسی وجہ سے چابی تمہارے ابو نے اپنے "کی رنگ" میں رکھ لی ہے تاکہ گم ہونے کا خدشہ نہ رہے۔" امی نے آملیٹ کی پلیٹ تیار کرتے ہوئے کہا۔

"اب میں کیا کروں؟" ...... میں بے چینی سے مٹھیاں بھینچ کر بولا۔

"بیٹا! آخر تمہیں کیا چاہئے اسٹور سے؟۔" امی نے میری بے چینی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"امی! وہ مانو میری کہانی لے کر بھاگ گئی ہے۔" میں قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ بولا۔

"اچھا اچھا! اب ہمارا شبر بیٹا کہانیاں بھی لکھنے

لگا ہے" اور میں منہ بسورتا ہوا واپس کمرے میں آکر بیٹھ گیا۔ مجھے مانو پر بے حد غصہ آرہا تھا۔ ایک دفعہ نظر آجائے چھوڑوں گا نہیں پھر اچانک خیال آیا کہ مانو بیگ میں سے نکل کیسے گئی؟ میں نے کل سے مانو کو بند کیا ہوا تھا اور پھر خبر تک نہ لی تھی۔ میں نے بیگ اٹھا کر دیکھا تو بیگ میں سوراخ ہو چکا تھا۔ مانو اپنے دانتوں سے بیگ کتر کر باہر نکلی تھی شاید ایک دن بھوکا رہنے کی وجہ سے اس نے نکلتے ہی میرے ہاتھوں میں جو چیز دیکھی کھانے کی چیز سمجھتے ہوئے جھپٹ لی ...... اور بھاگ کر اسٹور میں چھپ گئی۔ "اف اللہ! اب میں کیا کروں۔"

پھر خیال آیا کہ وہی کہانی دوبارہ لکھوں مگر کیسے؟ کہانی کے سب الفاظ میں بھول چکا تھا۔ اس وقت روانی میں جو کچھ لکھا گیا سو لکھا گیا۔ پڑھنے کی نوبت ہی آئی تھی کہ مانو لے اڑی۔ سوچتے سوچتے میری آنکھیں بھر آئیں اور میں تکیئے میں سر چھپا کر رونے لگا۔ روتے روتے اچانک میری سوچ کا دھارا پلٹا اور ایسا لگا جیسے یہ مجھے سزا ملی ہو۔ میں آج تک مانو کو تنگ کرتا آیا ہوں، مانو بھی تو میرے تنگ کرنے سے پریشان ہوتی ہوگی۔ میرے ذہن میں لاتعداد سوال سر اٹھانے لگے۔ وہ بے زبان جانور ہے تو کیا ہوا تکلیف تو اسے بھی ہوتی ہوگی پھر آج مجھے یہ احساس کیسے ہوا شاید اس لئے کہ ویسی ہی تکلیف آج مجھے پہنچی ہے۔ میں مانو کو اپنے کھیل ہی کھیل میں بے حد تکلیف پہنچاتا رہا ہوں شاید اس لئے اللہ میاں نے بھی مجھے سزا دی ہے کہ جو کہانی اتنی مشکل سے لکھی وہ مانو لے جھپٹی اور اب تک تو شاید مانو اسے کھا بھی چکی ہوگی (یہ بات بتانا میں بھول گیا کہ ہماری مانو کبھی کبھار کاغذ بڑی رغبت سے کھاتی تھی) اب سوائے ہاتھ ملنے کے کیا ہو سکتا تھا۔ میں بوجھل قدموں سے اٹھا اور ٹیلی فون کی جانب بڑھا تاکہ اپنے دوست خرم سے بات کر کے اداسی کم کر سکوں۔

اگلے روز میں صبح جلدی اٹھ گیا اور ابو سے چابی لے کر اسٹور کا تالا کھول کر اندر داخل ہوا۔ لائٹ جلائی تو ایک کونے میں مانو بیٹھی نظر آئی۔ مجھے دیکھتے ہی مانو سہم گئی اور صندوق کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرنے لگی۔ میں پیار سے چمکارتے ہوئے آگے بڑھا اور مانو کو اٹھا کر گود میں بٹھا لیا اور دیر تک اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتا رہا۔ مانو کو اپنے کمرے کی طرف لے جاتے ہوئے مجھے اب کہانی کا کوئی افسوس نہ تھا کیونکہ ایک کہانی تو خود بخود بن چکی تھی۔

ارے! آپ اتنی جلدی مایوس ہو گئے۔ بھئی پھر کوشش کیجئے۔ ورنہ صفحہ نمبر ۱۶۵ پر دیکھئے۔

ٹیمپو کی دُنیا
رنگوں کی دُنیا
ٹیمپو
فائبر ٹِپ
SAYYED
سید انجینرز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
۴۰ - احمد پارک گارڈن ٹاؤن لاہور، پاکستان۔
فون: (۹۲-۴۲) ۵۸۶۶۴۸۴ (تین لائنیں) ۹ - ۵۸۶۵۸۴۸
ٹیلکس: ۴۴۱۹۰ سید پی کے۔ کیبل: ٹیمپوپین۔
فیکس: (۹۲-۴۲) ۵۸۶۵۸۴۶
SV ADVERTISING

آدھی اینٹ کا ریڈیو

عمران سہیل بوبی

یہ گذشتہ سال کی بات ہے۔ شارجہ کپ کرکٹ ٹورنامنٹ ہو رہا تھا۔ اس دن فائنل میچ پاکستان اور ویسٹ انڈیز کی ٹیموں کے مابین کھیلا جانا تھا۔

میں نے اس دن بھی کالج سے چھٹی نہ کی۔ فائنل میچ کی وجہ سے ساٹھ میں سے صرف پندرہ لڑکے حاضر تھے۔

انگلش کا پیریڈ تھا۔ سر ظفر لیکچر دے رہے تھے۔ ان کے لیکچر کے دوران دھیمی دھیمی کمنٹری کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ظفر صاحب نے جب یہ دیکھا کہ آج کوئی طالب علم پڑھنے میں دلچسپی نہیں لے رہا تو انہوں نے اپنا پیریڈ ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔

انگلش کا پیریڈ فری ہوتے ہی کلاس روم میں خوشی سے ایسا شور ہوا جیسے پولٹری فارم میں مرغی کے چوزوں کو دانہ ملتے ہی چوں چوں کا شور

ہوتا ہے۔

کلاس روم میں صرف وہ طالب علموں کے پاس ریڈیو تھے اس لئے پندرہ لڑکوں کا گروپ دو حصّوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ ایک لڑکے کا ریڈیو "بیٹری سیل" کمزور ہونے کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔ اس طرح اب ایک ریڈیو کو پندرہ لڑکوں نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ میں نے بھی اپنے کان ان ہی پندرہ دونی تیس کانوں کے ساتھ ریڈیو سے چپکا رکھے تھے — لیکن اچانک ایک زور دار دھکا لگا اور میں گرتے گرتے بچا۔ رمیز راجہ نے چھکا لگایا تھا اور اسی چھکّے کی خوشی میں مجھے یہ دھکا ملا تھا۔

اس دھکے نے ہی مجھے شرارت کرنے پر مجبور کیا میں کلاس روم سے باہر نکل آیا۔ اور پچھلے احاطہ سے آدھی اینٹ کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور اسے رومال میں لپیٹ کر دوبارہ کلاس روم میں داخل ہوا۔ اور ایک کونے میں بینچ پر بیٹھ گیا۔ رومال میں لپٹا آدھی اینٹ کا ٹکڑا میں نے دائیں ہاتھ میں پکڑ کر اس طرح کان کے ساتھ لگایا جیسے میں بھی ریڈیو سے کرکٹ میچ کی کمنٹری سن رہا ہوں۔ دوسری طرف چودہ لڑکوں کا گروپ بڑی دلچسپی سے پاکستان کی پر جوش بیٹنگ کی کمنٹری دھکے کھاتے ہوئے سن رہا تھا۔ اس دھکم پیل سے آخر تنگ آکر ریڈیو والا طالب علم اپنا ریڈیو اٹھا کر بھاگ گیا۔ تب اس گروپ کی نظر مجھ پر پڑی۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ "واہ رے بوبی صاحب!" آج پہلی مرتبہ ریڈیو لائے ہو اور وہ بھی رومال میں لپیٹ کر۔ کیا تمہارے ریڈیو کو نظر لگ جائے گی۔"

"میں نے مصنوعی غصے سے کہا۔ "او مسٹر! ذرا تمیز سے بات کرو۔ یہ ریڈیو ٹنڈو آدم کا بنا ہوا نہیں ہے۔ یہ تو میرے سکھر والے ماموں پولینڈ سے لائے ہیں۔ اس کی چمک دمک کو بچانے کے لئے میں نے اسے رومال میں لپیٹ رکھا ہے۔ ہاں آپ لوگ چاہیں تو کمنٹری سن سکتے ہیں لیکن خاموشی سے کیونکہ ریڈیو کے سیل کچھ زیادہ ہی کمزور ہیں۔" میرا لہجہ سنجیدہ تھا۔

"واہ بھئی پولینڈ کا ریڈیو اور وہ کمزور سیل والا۔"

کسی نے طنزیہ انداز میں کہا۔ اس پر ایک زور دار قہقہہ پڑا۔ لیکن میری سنجیدگی نے ان قہقہوں کو بے جان کر دیا۔

"باسط علی اور سلیم ملک پچاس پچاس رنز مکمل کر چکے ہیں۔" میں نے با آواز بلند کہا۔ یہ سنتے ہی لڑکوں کا تجسس بڑھا۔

"باسط علی لگاتار چوکے چھکوں کی بارش کر رہا ہے۔" میرا اتنا کہنا تھا کہ گروپ کے چند لڑکے لپک کر نزدیک آئے اور میرے "ریڈیو سے کان لگانے کی کوشش کرنے لگے۔ میں چیخ پڑا۔ "بد تمیزوں! کہہ جو دیا کہ ریڈیو کے سیل کمزور ہیں، کمنٹری مجھے مشکل سے سنائی دے رہی ہے اور تم لوگ اوپر سے کان لگا رہے ہو۔" لیکن لڑکوں کی بے چینی بھلا کہاں دور ہونے والی تھی۔ سب میرے گرد جمع ہو گئے۔

"اب تین اوور باقی رہ گئے۔" میں نے اعلان کیا۔ "میچ سنسنی خیز مرحلے میں داخل ہو گیا ہے۔"

یہ سنتے ہی وہ سب اپنے کان "ریڈیو" کی طرف گھیرنے لگے۔

اب تو میرا ہاتھ بھی آدھی اینٹ کے ریڈیو کو مسلسل اٹھائے ہوئے تھک گیا تھا۔ "اچھا بھئی میں تو باتھ روم چلا۔ تم لوگ کمنٹری کے لئے کوئی اور ریڈیو تلاش کرو۔" میں نے وہاں سے کھسکنا چاہا۔

"ہاں ہاں ضرور جاؤ لیکن کمنٹری سننے کے لئے ریڈیو ہمیں دے جاؤ۔"

"اف میرے خدا! آدھی اینٹ کا ریڈیو ان کے ہاتھ آجائے گا تو میرا کیا بنے گا۔" یہ خیال آتے ہی میں نے بھاگنے کی کوشش کی۔ لیکن لڑکوں کا گروپ مجھے ایسے گھیرے ہوئے تھا جیسے وزیر اعلیٰ کو غریب لوگ ہاتھوں میں درخواستیں لئے گھیرتے ہیں۔ اب تو میں کافی پریشان ہوا۔ آج پتا چلا تھا کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔

میں ہمت ہارنے والا کب تھا کیونکہ شرارتیں کرنے کا اٹھارہ سالہ تجربہ تھا۔ "بلسط علی ۹۹ کے اسکور پر بولڈ ہو گیا ہے۔" میں نے ریڈیو کو کانوں سے لگائے لگائے کہا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے کہا "لیجئے! سلیم ملک ۷۲ کے سکور پر رن آوٹ ہو گیا۔ اب ۴۸ اوور پر مجموعی سکور ۲۱۵ ہے۔" یہ سنتے ہی تیرہ لڑکوں کا منہ لٹک گیا۔ ادھر مجھے باتھ روم جانے کی جلدی تھی لیکن شیطانوں کی گرفت میں جو تھا اس لئے ایک اور جھوٹ بولنا پڑا۔

"وسیم اکرم نے آتے ہی لگاتار ایک چھکا اور دو چوکے لگائے ہیں۔ جس سے پاکستان کا ۴۹ اوروں میں مجموعی اسکور ۲۲۹ ہو گیا ہے۔" یہ سنتے ہی لڑکوں نے نعرہ لگایا اور بھنگڑا ڈالنے میں مصروف ہوگئے۔ "یہی ہے موقع بوبی بھاگ لو نہیں تو..... اور میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ کالج کے گیٹ کے پاس پہنچا ہی تھا کہ پیچھے سے آکر لڑکوں نے مجھے دبوچ لیا۔ "بوبی آخری اوور کی کمنٹری بھی سناتے جاؤ۔ نہیں تو ہم تمہارا پولینڈ والا ریڈیو توڑ دیں گے۔" ان میں سے ایک لڑکے نے چیخ کر کہا۔ پھر وہ میرے ارادے کو بھانپ کر آدھی اینٹ کے ریڈیو کی طرف لپکے میں نے ہاتھ فضا میں بلند کر کے ریڈیو کو بچانے کی کوشش کی۔ اس کھینچا تانی میں رومال ذرا سا پھٹ گیا۔ میں نے ان سے کہا۔

ساتھیو! یہ جلد بازی آپ کو بہت مہنگی پڑے گی۔ پولینڈ کا ریڈیو ٹوٹ گیا تو میں آپ کو نہیں چھوڑوں گا۔ میرا یہ کہنا تھا کہ زور دار جھٹکے سے ایک لڑکے نے ریڈیو ہتھیا لیا۔ پھر کیا تھا..... جوں ہی رومال سے آدھی اینٹ کا ٹکڑا برآمد ہوا لڑکوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ ایک لڑکا غصے سے آدھی اینٹ عرف پولینڈ کا ریڈیو لئے میری طرف بڑھا اور میں اس سے زیادہ تیز بھاگا۔ اب شاید یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ پھر کیا ہوا۔ پھر یہ ہوا کہ میں نے شرارت سے توبہ کر لی۔

عافی تم بہت شریر ہو گئی ہو

فوجین

گرمی کی دوپہر تھی اور باہر تیز دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی لو بھی چل رہی تھی اس لئے سڑکیں تقریباً سنسان پڑی تھیں اور لوگ اپنے اپنے گھروں کے اندر آرام کر رہے تھے۔ عافی کے گھر والے بھی اس وقت بڑے کمرے میں جمع تھے۔ ابامیاں، اماں، دادی جانی، بڑی آپا، احسن ماموں اور نوید بھائی نہایت گرم جوشی کے ساتھ کسی اہم مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے۔ "عافی بہت شریر ہو گیا ہے۔" ابامیاں نے اپنی عینک جو ان کے ناک پر بیٹھی ہوئی تھی اوپر کرتے ہوئے کہا۔

"صرف شریر نہیں بلکہ بے حد شریر۔ خطر ناک حد تک شریر۔" نوید بھائی نے بھی ابامیاں کی تائید کی "لو بھئی! یہ کوئی کہنے والی بات ہے یہ تو محلے کا بچہ بچہ، بچہ جانتا ہے۔" دادی جان نے بھی گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے کہا۔

"ابھی پرسوں پتہ ہے اس نے میرے ساتھ کیا کیا؟" بڑی آپا نے نہایت راز داری سے کہا تو سب ہی یک دم بول اٹھے "کیا کیا؟"

"ہوا یہ کہ میں کالج جانے کے لئے استری کر رہی تھی جلدی میں میرا دوپٹہ جل گیا میں نے سوچا چلو کالج سے واپسی میں رفو کے لئے دے دوں گی

ابھی دو منٹ کے لئے بیگ لینے گئی تھی اور ادھر عافی صاحب اپنا کارنامہ انجام دے چکے تھے جلے ہوئے حصے پر انہوں نے خوب اچھی طرح برنول لگایا ہوا تھا جب میں نے پوچھا کہ یہ تم نے کیا کیا تو کہنے لگا کہ بڑی آپا ٹی وی میں آتا ہے جل گیا برنول لگایئے بس اب دو منٹ میں ہی آپ کا دوپٹہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا اور ..... " بڑی آپا نے ابھی بات ختم ہی نہ کی تھی کہ چاروں طرف سے قہقہے ابل پڑے۔

" واہ بھئی۔ ویسے یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ عافی بہت ذہین قسم کی شرارتیں کرتا ہے۔ احسن ماموں جو ہنسی سے بے حال ہو رہے تھے، بڑی مشکلوں سے اپنی بات مکمل کی۔

" چھوڑیں ماموں ..... کیا آپ کو عینک والی بات یاد نہیں ہے؟ " نوید بھائی نے احسن ماموں کو کچھ یاد دلاتے ہوئے کہا۔

" چھوڑو یار ..... اب رہنے بھی دو ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ " ماموں نے شرمندہ ہونے کے کہا " نہیں نوید..... ہمیں بھی تو پتہ چلے یہ عینک والی بات۔ " بڑی آپا نے نوید بھائی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

" اصل میں ایک دن ماموں کی عینک گم ہو گئی سارے گھر میں تلاش کر لیا مگر نہیں ملی آخر پتہ چلا کہ عافی نے اسے مانو بلی کی آنکھوں پر لگایا ہوا تھا بقول اس کے اس کی آنکھیں کمزور ہو گئیں تھیں اور اب اسے بھی " عینک والے جن " کی طرح صاف نظر آتا ہے۔ " نوید بھائی نے ہنستے ہوئے سارا واقعہ بیان کیا تو ایک مرتبہ کمرہ پھر بھرپور قہقہوں سے گونج اٹھا۔ " لو بھائی! کچھ اس قسم کا واقعہ میرے ساتھ بھی پیش آچکا ہے۔ " ابامیاں نے بڑے جوش و خروش سے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

" میں نے اپنے نقلی دانت پانی کے مگ میں رکھ دیئے تاکہ خراب نہ ہوں صبح سو کر اٹھا تو غائب۔ ابھی تلاش کا سلسلہ جاری و ساری تھا کہ محترمہ مانو صاحبہ میاؤں میاؤں کرتی ہوئی کمرے میں تشریف لے آئی اور میری پوری بتیسی ان کے منہ میں ٹھونسی ہوئی تھی ابھی میں حیران ہی تھا کہ بلی صاحبہ نے میرے دانت کیسے لگائے کہ عافی کمرے کے اندر اس کے پیچھے آگیا اور کہنے لگا کہ ابامیاں کل سے مانو ٹھیک سے کھانا نہیں کھا رہی تھی میں نے آپ کے دانت لگا دیئے تو آج یہ سارا گوشت کھا گئی۔ لو بھلا سنی تم لوگوں نے اس کی بات۔ " ابھی ابامیاں نے پوری بات ختم نہ کی تھی کہ سب کے مشترکہ قہقہے ایک مرتبہ پھر گونج اٹھے۔

" بس بھئی بہت ہو چکا یہ قہقہے لگانا تو بھلا بات شروع ہوئی تھی کہ عافی بہت شریر ہو گیا ہے بجائے اس کے کہ تم لوگ اس کا حل نکالو اس کی شرارتیں ایسے بیان کر رہے ہو جیسے اس نے کوئی کارنامہ انجام دیا ہو۔ " اماں نے ناراضگی سے کہا۔

" پھر کیا کیا جائے اماں؟ " بڑی آپا نے یوں پریشانی کے عالم میں پوچھا جیسے مسئلہ کشمیر کا حل

معلوم کر رہی ہوں۔

"میرے خیال سے اسے سزا دینی چاہئے۔" نوید بھائی نے تجویز پیش کی۔

"مگر کیسی سزا؟" دادی اماں نے نوید بھائی سے پوچھا۔

"یہی کہ اس کی پٹائی کی جائے۔" نوید بھائی نے سزا کی شکل بتاتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں بھئی! ابھی تو بالکل بچہ ہے نازک سی جلد ہے نہ بھئی ..... یہ پٹائی والی بات ٹھیک نہیں۔" ابامیاں نے سختی سے مخالفت کرتے ہوئے کہا۔

"پھر ایسا کرتے ہیں کہ اس کے کان کھینچے جائیں۔" نوید بھائی نے فوراً ہی دوسری سزا بتائی۔

"لو بھلا پہلے ہی اس کے کان لمبے ہیں اور دن بھر میں جس قدر وہ شرارتیں کرتا ہے اگر اتنی ہی مرتبہ اس کے کان کھینچے جائیں تو اس کا شمار خرگوشوں کی نسل میں ہونے لگے گا۔" اماں نے اس سزا کو بھی رد کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا ایسا ہے کہ اب آپ لوگ خود ہی طے کر لیں ایک تو ہم سزا پہ سزا بتا رہے ہیں اور کسی کو پسند ہی نہیں آ رہا ہے۔" نوید بھائی نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

"میرے خیال سے ایسا نہ کریں کہ اس سے بات کرنا بند کر دیں جب ہم اس سے بولیں گے نہیں تو وہ ضرور شرارت کرنا چھوڑ دے گا۔" ماموں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"واہ احسن ماموں کیا سزا تجویز کی ہے اسے کہتے ہیں سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے یعنی عافی کو سزا بھی نہ ملے اور وہ شرارتیں بھی چھوڑ دے۔" بڑی آپا نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"کیوں بھئی منظور ہے سب کو۔" احسن ماموں نے باآواز بلند کہا تو سب نے بھی باآواز بلند جواب دیا! "منظور ہے۔"

اس منصوبے پر عمل درآمد اگرچہ کافی مشکل کام تھا مگر سارے ہی لوگ عافی کی شرارتوں سے عاجز تھے لہٰذا دوسرے دن ہی سے اس پر سختی کے ساتھ عمل شروع ہو گیا اور دو دن تک عافی کے ساتھ مکمل طور پر بات چیت بند رہی۔ تیسرے دن حسب معمول سب لوگ کھانے سے پہلے خوش گپیوں میں مصروف تھے اور ان کا موضوع بحث بھی عافی تھا کہ عافی آ گیا اس کے پیچھے پیچھے مس ثمینہ بھی تھیں۔

لو بھئی..... یہ نہیں ٹھیک ہونے والا چاہے اسے کیسی بھی سزا دی جائے۔" اماں بی نے عافی کو دیکھتے ہوئے یوں کانوں کو ہاتھ لگایا جیسے شیطان کو دیکھ لیا ہو۔ اتنے میں مس ثمینہ بھی عافی کے ساتھ ہی اندر آ گئیں۔

"السلام علیکم۔" مس ثمینہ نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"وعلیکم السلام۔" اندر بیٹھے تمام لوگوں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ اس کی شرارتوں کی شکایت لے کر آئی ہیں تو اس کا کوئی حل ہمارے پاس نہیں ہے۔" ابامیاں نے مس

ثمینہ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"ارے نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے بلکہ میں تو کسی اور کام سے آپ لوگوں کے پاس آئی ہوں۔ چلو بیٹا! آپ اندر جاؤ۔" مس ثمینہ نے عافی کو اندر بھیجتے ہوئے کہا اور خود صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"سچ ہے ہم تو اس کی شرارتوں سے تنگ ہیں مگر یہ مانتا ہی نہیں بلکہ ہم نے تو اس سے بات کرنا بھی چھوڑ دیا ہے مگر یہ اس پر بھی نہ ٹھیک ہوا۔" بڑی آپا نے مس ثمینہ کو تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔

"دیکھیں جی بچے تو ہوتے ہی شریر ہیں ورنہ پھر بھلا ان کو بچہ کون کہے لیکن محض شرارتوں سے تنگ آکر بچے سے بات چیت نہ کرنا صحیح نہیں ہے دراصل اس عمر کے بچوں میں بہت زیادہ توانائی ہوتی ہے جو وہ کسی بھی طریقے سے خرچ کرنا چاہتے ہیں لہٰذا وہ کھیل کود کر شرارتیں کر کے اپنی توانائی کو خرچ کرتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ جیسے جیسے بچہ بڑا ہوتا ہے۔ اس کی شرارتیں خود بخود کم ہو جاتی ہیں کیونکہ اب اس میں اتنی زیادہ توانائی نہیں رہتی اور جو رہتی ہے وہ پڑھائی میں صرف کر دیتا ہے۔ ویسے بھی بچوں کی شرارتوں سے گھر میں رونق رہتی ہے ان کی شرارتوں سے گھر میں شور رہتا ہے ہنگامہ رہتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ گھر میں کوئی موجود ہے۔ بچے گھر کی رونق ہوتے ہیں اور ان کی شرارتیں اس رونق کو مزید بڑھا دیتی ہیں باغ میں پھول اچھے لگتے ہیں مگر جب تتلیاں بھی آجائیں..... تو باغ کی خوبصورتی بڑھ جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح بچے اور شرارت دونوں گھر کی خوبصورتی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ لہٰذا میرا مشورہ ہے کہ آپ لوگ عافی کی شرارتوں کا برا نہ مانیں ہاں اگر وہ غلط قسم کی شرارتیں کرے تو پھر اسے ضرور منع کریں۔ مس ثمینہ نے اپنی بات ختم کر کے پرس اٹھایا اور چلنے کے لئے کھڑی ہو گئیں۔ واقعی آج سے پہلے ہم نے اس بات پر غور ہی نہیں کیا تھا کہ عافی سے زیادہ اس کی شرارتوں کی وجہ سے اس گھر میں رونق رہتی ہے۔

"اب ہم عافی کو شرارت کرنے سے بھی منع نہیں کریں گے۔" دادی جان نے مس ثمینہ کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں ہم سب کا بھی یہی خیال ہے۔" ماموں نے بھی دادی جان کی تائید کی تو مس ثمینہ نے مسکراتے ہوئے اجازت طلب کی اور کمرے سے باہر نکل گئیں۔

اس دن کے بعد سے عافی کی شرارتیں اور بڑھ گئی ہیں بلکہ اب تو اس کی شرارتوں پر اسے شاباش بھی ملتی ہے مگر عافی کو اب شرارتیں کرنے میں وہ مزہ نہیں آتا جو پہلے آتا تھا کیونکہ وہ تو شرارت صرف اپنے پسندیدہ جملہ "عافی تم بہت شریر ہو گئے ہو" کی وجہ سے کرتا تھا مگر اس دن کے بعد سے وہ یہ جملہ سننے کے لئے ترس گیا ہے پھر بھلا اسے شرارت کرنے میں کیسے مزہ آئے گا۔

بن بلایا مہمان

منیر احمد فردوس

"یار جاوید! اس دفعہ میں ایک نرالی شرارت کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔" میں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

"نرالی شرارت؟ کیا مطلب؟"

"نرالی شرارت کا مطلب یہ ہے نرالی شرارت۔" میں نے کہا۔

"تو پھر ایسا کرتے ہیں کہ چہرے پر ڈراؤنا ماسک چڑھا کر محلے کے کسی کمزور دل والے کو ڈراتے ہیں۔" جاوید نے تجویز پیش کی۔

"یار یہ بھی کوئی شرارت ہے۔ بالکل بچوں والی پہلے تو ماسک خریدو، پھر رات کا انتظار کرو، پھر رات گئے گھر سے نکلو۔ نہ بابا نہ، اس میں تو اپنے علاوہ جیب کو بھی تکلیف دینی پڑے گی۔ ایسی شرارت سوچو جس میں نہ خرچہ ہو اور نہ ہمیں گھر

سے باہر نکلنا پڑے۔" میں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اچھا پھر سوچتے ہیں۔" جاوید نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

اور پھر ہم دونوں سوچنے میں مصروف ہو گئے۔

"ویری گڈ۔ واہ! کیا زالی شرارت آئی ہے ذہن میں۔" میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"کونسی شرارت؟ مجھے بھی تو پتہ چلے۔" جاوید نے پوچھا۔

"بس ایسی شرارت کہ ہاتھ پیر ہلائے بغیر کام بن جائے گا۔"

"کچھ بتاؤ گے بھی یا یونہی پہیلیاں بجھواتے رہو گے۔" جاوید نے بے چین ہوتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو پھر سنو۔" اور میں نے تمام تفصیل سمجھا دی۔

"واہ یار! بڑی انوکھی شرارت ہے۔" جاوید نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"کیوں پسند آئی نا۔" میں نے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

"یار باقی سب کچھ تو ٹھیک ہے لیکن۔" جاوید نے تھوڑا پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

"یہ لیکن ویکن تم مجھ پر چھوڑ دو۔ چلو آؤ شرارت کو اب عملی جامہ پہنائیں۔"

میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا تو جاوید بھی کھڑا ہو گیا۔ ہم لوگ اسی وقت ایک ہوٹل کے قریبی بک اسٹال پر پہنچ گئے۔ میں نے دکان دار سے فون کی اجازت لے کر اپنے گھر کا نمبر ڈائل کیا۔

"ہیلو" دوسری طرف سے بھائی جان کی آواز سنائی دی۔

"ہیلو جی میں شکور بول رہا ہوں کراچی سے۔ براہ مہربانی میری والدہ کو بلا دیں۔"

میں نے اونچی آواز سے کہا۔ شکور میرے پڑوسی کے بیٹے کا نام تھا جو ملازمت کے سلسلے میں کراچی میں مقیم تھے اور کبھی کبھار ہمارے ہی گھر پہ فون کر کے اپنی والدہ سے باتیں کیا کرتے تھے۔

"ہولڈ کریں شکور بھائی۔ ابھی بلا کر لاتا ہوں۔" دوسری طرف سے بھائی جان نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد شکور کی امی کی آواز سنائی دی۔

"ہیلو! شکور بیٹے۔ کیسے ہو؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں امی جان۔" میں نے بدستور اونچی آواز میں کہا۔

"یہ تمہاری آواز کو کیا ہوا بیٹا؟" دوسری طرف سے شکور کی ماں نے حیرانگی سے پوچھا۔

"بس امی جان! نزلہ اور کھانسی کی وجہ سے گلا بیٹھ گیا ہے۔" میں نے کھانستے ہوئے کہا۔

"اپنی صحت کا خیال رکھا کرو بیٹے۔" دوسری طرف سے شکور کی ماں نے نصیحت کرتے ہوئے کہا۔

"بس امی! دوا کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ ٹھیک ہو جاؤں گا۔ اچھا امی! میں نے فون اس لئے کیا تھا کہ کل جمعہ کو دوپہر کی فلائٹ سے میرا ایک دوست آ رہا

ہے۔ اسے لینے کے لئے آپ لوگوں کو جانا ہے۔ میرا ایک ضروری کام آگیا ہے۔ انشاء اللہ ایک دو دن میں میں بھی پہنچ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"کہاں سے آ رہا ہے بیٹے تمہارا دوست؟ اور ہاں اس کا نام تو بتایا ہی نہیں تم نے؟" شکور کی ماں نے کہا۔

"میرے دوست کا نام محبوب ہے اور وہ کراچی سے ہی آ رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ کل دوپہر کی فلائٹ سے نا؟" شکور کی ماں نے ایک مرتبہ پھر دہراتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ ہاں کل دوپہر کی فلائٹ سے۔ اچھا امی جان۔ اب اجازت۔"

"اچھا بیٹا اور ہاں اپنی صحت کا خیال رکھا کرو۔" شکور کی امی نے کہا۔

"بس امی معمولی سی کھانسی ہے انشاء اللہ صحیح ہو جاؤں گا۔ ابا کو سلام کہہ دیجئے گا امی جان۔ اچھا خدا حافظ۔"

"خدا حافظ بیٹا۔" دوسری طرف سے شکور کی امی نے کہا اور میں نے ریسیور رکھ دیا اور فاتحانہ مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے اپنے دوست جاوید کی طرف دیکھا۔

"واہ بھئی! یہ تو بڑی زبردست شرارت ہے۔ اب مزہ آئے گا جب وہ بے چارے اتنی دور ائر پورٹ جائیں گے اور کسی مہمان کو نہ پا کر خالی ہاتھ لوٹ آئیں گے۔" جاوید نے مجھے داد دیتے ہوئے کہا اور ہم دونوں خوش گپیاں کرتے ہوئے اپنے گھروں کو چل دیئے۔

دوسرے دن دوپہر کو شکور کا چھوٹا بھائی ابا جان سے کار کی چابی مانگنے آیا کہ شکور کے دوست باہر سے آ رہے ہیں۔ ائر پورٹ سے انہیں لینے جانا ہے۔ ابا جان نے کار کی چابی اس کے حوالے کر دی اور میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔

جب شام ہوئی تو میں جاوید کے گھر گیا۔ پروگرام کے مطابق جاوید گھر پر ہی تھا۔

"آؤ یار! اپنے تھکے ہارے پڑوسیوں کا حال احوال تو پوچھ آئیں۔ آخر وہ ائر پورٹ پر شکور کے دوست کو لینے گئے تھے نا۔ بے چارے تھک گئے ہوں گے۔" میں نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

"ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ آخر وہ ہمارے پڑوسی ہیں حال احوال پوچھنا تو ہمارا حق بنتا ہے۔" جاوید نے بھی محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

جب ہم شکور کے گھر میں داخل ہوئے تو وہاں کا منظر ہماری توقعات کے بالکل خلاف تھا۔

وہاں تو باقاعدہ دعوت کا سماں تھا۔ ہم دونوں بڑے حیران ہوئے۔

"خالہ جان! آج تو بڑا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ خیر تو ہے نا۔" میں نے اپنی حیرت دور کرنے کی خاطر آخر پوچھ ہی لیا۔

"ہاں منیر بیٹا۔ وہ آج ہمارے بڑے بیٹے شکور کے دوست آئے ہوئے ہیں نا باہر سے۔"

شکور کی ماں نے جواب دیا۔

"ہیں!! شکور کے دوست! باہر سے؟" میں نے حیرت کے عمیق سمندر میں ڈبکی لگاتے ہوئے کہا یہی حال جاوید کا بھی ہو رہا تھا۔ ہم حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھے جا رہے تھے۔

"ہاں ہاں، شکور کے دوست آئے ہیں کراچی سے۔ اس میں حیران ہونے والی کون سی بات ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"کیا ہم ان صاحب سے مل سکتے ہیں؟"

"شکور کے ہی کمرے میں ٹھہرے ہیں۔" انہوں نے جواب دیا اور ہم دونوں کمرے کی طرف چل دیئے۔ میں بغیر دستک دیئے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ جاوید بھی میرے پیچھے ہی اندر آ گیا۔ وہ اجنبی دوسری طرف منہ کئے لیٹا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر تک تو ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھتے رہے کہ نہ جانے یہ کون صاحب ہیں؟ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہم کریں تو کیا کریں۔

"السلام علیکم۔" میں نے انہیں مخاطب کیا۔

"وعلیکم السلام۔" ان صاحب نے جنہیں اب ہم بھی شکور کا دوست سمجھنے پر مجبور تھے مڑ کر چونکتے ہوئے جواب دیا۔

"وہ جی ہم فارغ تھے سوچا شکور کے دوست سے مل لیا جائے۔" جاوید نے کہا۔

"آؤ آؤ بیٹھو۔" شکور کے دوست نے مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے کہا۔ ہم دونوں اس کے ساتھ ہی بستر پر بیٹھ گئے۔

"ہم آپ کا نام پوچھ سکتے ہیں؟" جاوید نے جو اس کا نام جاننے کے لئے بے چین بیٹھا تھا پوچھ ہی لیا۔

"میرا نام محبوب ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک عیاں تھی۔

"جی!! محبوب؟" میں نے جی کو لمبا کرتے ہوئے کہا۔ میں اور جاوید دونوں ایک دوسرے کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

"جی ہاں، محبوب ہی نام ہے میرا۔ کیوں آپ کو پسند نہیں آیا؟" اس نے مذاق کے انداز میں کہا۔

"نہیں نہیں، بڑا اچھا نام ہے۔" میں نے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا اب ہم چلتے ہیں تھوڑا سا کام ہے انشاء اللہ فارغ ہونے کے بعد چکر لگائیں گے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ جاوید بھی کھڑا ہو گیا۔

"ضرور آیئے گا۔" اس نے مسکراتے ہوئے ہمیں رخصت کیا اور ہم دونوں کمرے سے باہر آ گئے۔

"بس بیٹے! مل لئے شکور کے دوست سے۔" شکور کی ماں نے ہمیں باہر نکلتے دیکھ کر پوچھا۔

"جی خالہ جان مل لئے۔ اچھا اب ہم چلتے

ہیں۔" یہ کہہ کر ہم دونوں باہر نکل آئے۔

"یار یہ کیسے ہو گیا؟" جاوید نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"آخر کیسے ہو گیا؟ اور سب سے حیران کن بات یہ ہے کہ اس کا نام بھی وہی ہے۔"

"یار مجھے یوں لگتا ہے جیسے اسے میں نے کہیں دیکھا ہے۔" میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"کہاں دیکھا ہے؟" جاوید نے پوچھا۔

"یہ یاد نہیں آرہا کہ کہاں دیکھا ہے!!" میں نے جواب دیا۔

"اب کیا کریں؟ یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہو گیا۔" جاوید نے کہا۔

"بس یار۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔" میں نے جواب دیا۔

اور پھر ہم دونوں اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔ میں رات کافی دیر تک شکور کے دوست یعنی محبوب کے بارے میں سوچتا رہا کہ آخر یہ کون ہو سکتا ہے اور یہ کیا چکر ہے لیکن میں کسی بھی فیصلے پر نہ پہنچ سکا۔

صبح میں نماز پڑھ کر مسجد سے گھر آرہا تھا کہ شکور کے گھر سے رونے کی آوازیں سنائی دیں۔ گھر کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔

"یا اللہ خیر!" میں زیر لب بڑبڑاتا ہوا گھر کے اندر داخل ہو گیا..... اندر کا تو منظر ہی کچھ اور تھا۔ شکور کی ماں اور اس کی دو بہنیں صوفے پر بیٹھیں روئے جا رہی تھیں جب کہ والد اور چھوٹا بھائی سر جھکائے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ دو چار پڑوسی اور میرے ابا بھی وہاں موجود تھے۔

"پتہ نہیں کیسے کیسے چور اچکے دوست بنا رکھے ہیں شکور نے۔" شکور کی ماں نے روتے ہوئے کہا۔

میں نے آہستہ سے شکور کے چھوٹے بھائی نسیم سے پوچھا۔ "کیا بات ہے نسیم! خیریت تو ہے۔"

"بس کیا بتاؤں۔ وہ شکور کے دوست تھے نا محبوب۔ وہ..... گھر سے غائب ہیں اور گھر میں موجود زیور، کرنسی، وی سی آر، ٹی وی وغیرہ سب کچھ غائب ہے۔" نسیم نے افسردہ لہجے میں کہا۔

یہ سب کچھ سنتے ہی مجھ میں مزید بولنے کی ہمت نہ رہی میں بت کا بت بنا کھڑا رہا۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس اب ہو رہا تھا۔ میں انہیں روتا دھوتا چھوڑ کر گھر آ گیا۔

کافی دیر تک میں اپنے کمرے میں پڑا رہا۔ کسی چیز میں بھی مزا نہیں آرہا تھا۔ رہ رہ کر میرے کانوں میں ان لوگوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ چند گھنٹے بعد میں کمرے سے نکل ہی رہا تھا کہ میرا چھوٹا بھائی تیزی سے گھر میں داخل ہوا۔

"امی جان، امی جان! چور سامان سمیت پکڑا گیا۔"

"کون چور؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"وہی جو کل رات خواجہ صاحب کے گھر آیا اور گھر کا صفایا کر گیا۔" بھائی نے جلدی سے کہا۔

"سچ پکڑا گیا وہ۔ یااللہ تیرا شکر ہے۔" میں نے ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہ تجھے اتنی خوشی کیوں ہو رہی ہے۔" امی نے کچن سے نکلتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہ ہو خوشی مجھے امی جان آخر خواجہ صاحب ہمارے پڑوسی ہیں۔" میں نے بات بنا دی۔

جب میں خواجہ صاحب کے گھر پہنچا تو وہاں سارے محلے والے جمع تھے۔

"چور کیسے پکڑا گیا خواجہ صاحب؟" کسی نے پوچھا۔

"وہ سامان سمیت اسٹیشن پر ریل گاڑی کا انتظار کر رہا تھا۔ ہم نے اس کا حلیہ پولیس کو بتا دیا تھا چناں چہ پولیس نے چھاپہ مار کر سامان سمیت اسے گرفتار کر لیا۔" خواجہ صاحب نے جواب دیا۔

بعد میں جب چور صاحب سے پوچھا گیا کہ وہ کیسے شکور کا دوست بن کر آیا تو جواب میں اس نے جو کچھ بتایا وہ ہمارے ہوش و حواس اڑانے کے لئے کافی تھا۔ اس نے بتایا۔

جب ہم دونوں (یعنی میں اور جاوید) ہوٹل میں بیٹھے شرارت کا منصوبہ بنا رہے تھے تو اس وقت وہ بھی ساتھ والی کرسی پر بیٹھا سب کچھ سن رہا تھا اور شکور کی والدہ سے فون پر ہونے والی گفتگو بھی اس نے سن لی تھی۔ جس کے بعد اس نے خواجہ صاحب کے بارے میں تمام تفصیل معلوم کی اور شکور کا دوست بن کر گھر پہنچ گیا۔

اس کے بعد ہمارا کیا حال ہوا یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ عقلمند کے لئے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ یہ ہماری آخری شرارت ثابت ہوئی۔

ش کی شرارتیں

"ش" اردو حروف تہجی کا انیسواں حرف ہے جو اپنی شرارت اور شوخی کی وجہ سے مشہور ہے۔ "شریر" ہونے کے ساتھ یہ "شریف" "شفیق" اور شرمیلا بھی ہے۔ شطرنج کا "شائق" ہے "شاعری" سے اس کو "شغف" ہے۔ مزاج میں "شگفتگی" اور "شادابی" کی وجہ سے "شہر" میں اس کے شناسا اور شیدائی بے شمار ہیں۔ دیکھنے میں شکیل سننے میں شیریں لیکن "شیطانیت" اور "شر انگیزی" ایسی کہ لوگ "ششدر" رہ جاتے ہیں اور اس کی شرافت کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں، غرض یہ کہ "ش" کی "شرارتیں" بڑی شوخ و شنگ ہوتی ہے۔

(مرسلہ ..... صبا امروز، کراچی)

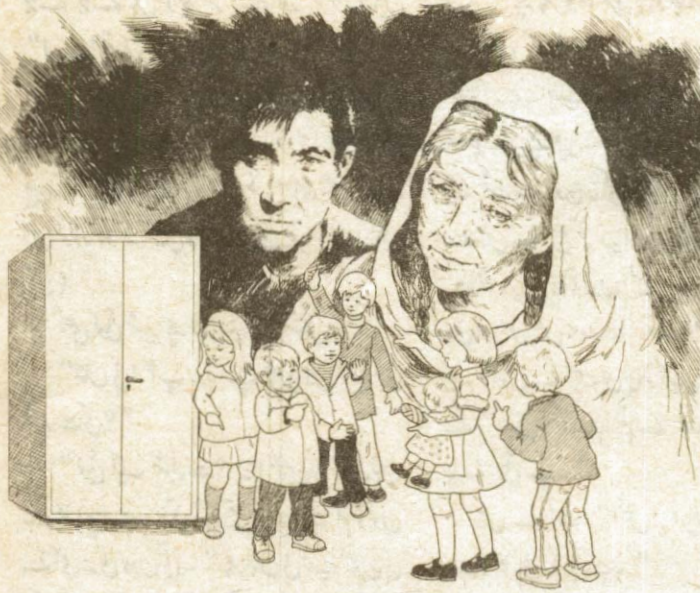

اماں بی کی شرارت

محمد عاقل احمد خان

محلے کے بچے "اماں بی" کو دو چٹیا باندھے دیکھتے تو بے حد حیران ہوتے۔ کبھی کوئی بچہ پوچھتا۔ "اماں بی! جب آپ چھوٹی سی تھیں بالکل ہم بچوں کے برابر تو کیا آپ تب بھی دو چٹیا باندھا کرتی تھیں؟" "ہاں بیٹا! تب بھی اور اب بھی.....

اماں بی مسکرا کر ایک لمحے کو خاموش ہو جاتیں پھر کہتیں: "کیوں بیٹا! کیا تمہیں میری دو چٹیوں پر اعتراض ہے؟"

"نن..... نن..... نہیں اماں! میں تو ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔" بچہ گڑبڑا جاتا تو اماں بی اس کے

بڑے بڑے بال دیکھ کر اسے اور گڑبڑا دیتیں "ارے! تمہاری ٹنی چٹیا کہاں گئی؟" "مم ...... مم ...... میری چٹیا......!! میں تو لڑکا ہوں اماں بی! بھلا میری چٹیا کہاں ...... چٹیا تو لڑکیاں رکھتی ہیں۔" (بچہ اپنے سر پر اس طرح ہاتھ پھیرتا جیسے اس کو ڈر ہو کہ کہیں واقعی اس کی چٹیا تو نہیں نکل آئی)

کبھی کوئی شریر بچہ اماں بی سے سوال کرتا۔

"اماں بی! آپ نے اپنے بچپن میں کبھی کوئی شرارت کی؟"

"کوئی ایک شرارت؟ میرا بچپن تو شرارتوں سے بھرا پڑا ہے۔ اتنی شرارتیں کی ہیں کہ تم لوگوں نے بھی نہ کی ہوں گی۔" پھر اماں بی اپنے بچپن کی کوئی دلچسپ شرارت سنانے لگ جاتیں اور پھر جیسے ہی خاموش ہوتیں تو وہ شریر بچہ اجازت مانگتا۔

"اماں بی! میں آپ کو اپنی تازہ شرارت سناؤں!!"

"ہاں ہاں سناؤ!" اماں بی ہمہ تن گوش ہو جاتیں اور شریر بچہ بڑے جوش و خروش سے اپنی کارستانی بتانے لگتا۔

"ہمارے ایک انکل ہیں۔ انہیں چائے پینے کا بہت شوق ہے۔ دن بھر میں کم از کم بیس پچیّس چائے تو پیتے ہوں گے ......

"کیا؟ بیس پچیّس! کیا وہ جن ہیں؟!" اماں بی حیران ہو کر بچے کی بات کاٹتیں۔

"جن تو نہیں لیکن جنوں والی حرکتیں کرتے ہیں"...... بچہ پھر بولنا شروع ہو جاتا۔ "ہمارے گھر جب بھی آتے ہیں، بے چاری آپا کی شامت آجاتی ہے۔ جب تک وہ بیٹھے رہیں، سات آٹھ بار چائے پیتے ہیں۔ اس بار گھر آئے تو میں نے ایک شرارت سوچ رکھی تھی۔ آپا کو چائے بنانے سے میں نے منع کر دیا اور اپنے ڈرائنگ کلرز جن سے تصویریں بناتا ہوں انہیں پانی میں ملا کر چائے بنائی اور اس میں بہت سا نمک ڈال کر انہیں پیش کی۔ انہوں نے جیسے ہی پی تو کلیاں کرنے لگے کہنے لگے "میاں! لگتا ہے تم نے سمندر کے پانی سے چائے بنائی ہے۔"

میں نے کہا۔ "انکل! آج کل نلکوں میں سمندر کا پانی آرہا ہے۔"

وہ پوچھنے لگے۔ "کب سے؟" میں نے کہا "جب سے آپ ہر گھر میں سات آٹھ چائے پینے لگے ہیں۔" اس کے بعد وہ ہمارے گھر نہیں آئے شاید شرمندہ ہو گئے ہیں۔"

"تم نے بالکل ٹھیک کیا۔ ایسے لوگوں کو اسی طرح شرمندہ کیا جانا چاہئے۔ میں تمہاری جگہ ہوتی تو انہیں مرچوں والی چائے پلاتی۔" اماں بی نے غصّے سے کہا تو سب بچے ہنس پڑے۔

اماں بی پورے جگ کی اماں تھیں۔ ان کے شوہر وفات پا چکے تھے۔ اولاد بھی کوئی نہیں تھی۔ محلے کے تمام بچوں کا جمگھٹا ان کے گھر لگا رہتا تھا۔ اماں بی بھی تمام بچوں سے بے حد محبت کرتیں اور انہیں اپنی اولاد ہی کی طرح سمجھتیں۔ انہوں نے

گھر ہی میں بچوں کے کھانے پینے کے سامان بسکٹس ٹافیوں کی ایک چھوٹی سی دکان کھول رکھی تھی۔ اس چھوٹی سی دکان سے انہیں آمدنی تو کیا ہوتی بس بچے جمع ہو جاتے اور وہ ان سے باتیں کر کے اپنا دل بہلا لیتیں۔

اماں بی کے گھر میں ایک الماری تھی جس کا پٹ ہر وقت کھلا رہتا۔ حالاں کہ اماں بی اس میں پیسے وغیرہ رکھا کرتیں تھیں۔ اس کے باوجود بچوں نے کبھی اس الماری کو بند نہیں دیکھا تھا۔ "معلوم نہیں اماں بی اس کو بند کیوں نہیں کرتیں؟" کچھ بچوں کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوتا۔ وہ سوچتے اماں بی سے پوچھیں گے لیکن اماں کی شوخ و شریر باتیں سننے کے بعد وہ یہ سوال پوچھنا ہی بھول جاتے۔

سردیوں کی ایک شام کا ذکر ہے۔ اماں بی نماز سے فارغ ہو کر بیٹھی ہی تھیں کہ محلے کے بچے بسکٹ ٹافیاں خریدنے آ گئے۔ انہیں فارغ کیا تو بچے کہنے لگے۔ "اماں بی! آپ سے ایک سوال پوچھنا ہے۔"

"پوچھو پوچھو! ایک نہیں دو سوال پوچھو!!" اماں بی نے مسکرا کر کہا تو ایک شریر بچے نے پوچھا۔ "اماں بی! بچپن میں تو آپ نے بہت شرارتیں کی ہیں اب کیوں چھوڑ دیں! کیا بڑے لوگ شرارت نہیں کر سکتے؟" "کر سکتے ہیں۔ شرارتوں کے لئے بڑا یا چھوٹا ہونا ضروری نہیں میں اب بھی کوئی شرارت کر سکتی..... اماں بی کی بات یہیں تک پہنچی تھی کہ گلی میں کسی کے بھاگنے کی آواز سنائی دی اور پھر ایک دم سے ایک لحیم شحیم آدمی دروازے کو دھکا مار کر اندر گھس آیا۔ اس کی شکل ڈاکوؤں جیسی تھی اور اس کے ہاتھ میں چمکتا ہوا تیز دھار والا چاقو بھی تھا جو اس نے فوراً چھپا لیا۔ بچے اسے دیکھ کر سہم گئے لیکن اماں بی بالکل نہیں ڈریں بلکہ انہوں نے ڈپٹ کر پوچھا۔ "کیا بات ہے اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟ کیا تم چور ہو؟"

"چچ..... چچ..... چور..... نن..... نن..... نہیں میں ایک شریف آدمی ہوں۔ نہ جانے پولیس کو کیسے غلط فہمی ہو گئی، چور سمجھ کر میرے پیچھے لگ گئی ہے۔ میں یہاں پناہ کی تلاش میں آیا ہوں۔ کیا مجھے چھپنے کے لئے کوئی جگہ مل سکتی ہے؟" "ہاں مل سکتی ہے۔ تم اس الماری میں چھپ جاؤ۔" اماں بی نے کچھ دیر سوچا پھر مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ خطرناک صورت والا آدمی اماں بی کی بات سن کر جلدی سے الماری میں گھسا اور پٹ بند کر کے اندر بیٹھ گیا۔

جب وہ الماری میں چھپ گیا تو اماں بی زور سے ہنسیں پھر انہوں نے سہمے ہوئے بچوں سے کہا "یہ آدمی شریف نہیں چور ہے اور..... میں نے اس کے ساتھ ایسی شرارت کی ہے کہ جیل میں جانے کے بعد یہ تمام زندگی اسے یاد رکھے گا۔"

"کیسی شرارت اماں بی؟" بچے کچھ حیران ہوئے۔

"تم لوگوں کے آنے سے پہلے میں سوچ رہی

تھی کہ آج تمہارے ساتھ کوئی شرارت کروں گی لیکن تمہارے ساتھ شرارت کرنے سے پہلے ہی یہ چور میری شرارت کا نشانہ بن گیا۔"

"وہ کس طرح اماں بی؟"

"وہ اس طرح کہ اب یہ چور کبھی الماری سے باہر نہیں نکل سکے گا۔ جب اس نے چھپنے کے لئے پوچھا تھا تو میں اسے گودام میں چھپنے کا مشورہ دے سکتی تھی۔ لیکن یہ وہاں سے نکل بھاگتا اس لئے میرے ذہن میں یہی آیا کہ اسے الماری میں چھپنے کا مشورہ دوں۔ اس الماری کا لاک عرصے سے خراب ہے تم لوگوں نے شائد غور نہ کیا ہو کہ میں ہمیشہ اس کا پٹ کھلا رکھتی ہوں کیونکہ پٹ ایک بار بند ہو جائے تو پھر کھلتا نہیں۔ یہ چور جیسے ہی الماری میں گھسا پٹ بند ہوا اور ہمیشہ کے لئے یہ اس میں قید ہو گیا۔ اب تم لوگ خود سوچو میری اس انوکھی شرارت سے ایک خطرناک چور کتنی آسانی سے قابو میں آگیا۔ ..... جاؤ! اب تم لوگ پولیس کو فون کرو....."

اماں بی کی بات مکمل ہوتے ہی بچے فون کرنے بھاگے اور پون گھنٹے بعد ہی پولیس والے خطرناک چور کو الماری سمیت تھانے لے جا رہے تھے۔ کیونکہ الماری کا لاک ان سے بھی نہیں کھلا تھا..... ادھر اماں بی تھیں کہ اپنی شرارت پر ہولے ہولے مسکرائے جا رہی تھیں۔

ایک شریر لڑکے کا انجام

میرا ایک دوست تھا، شیر اکبر، بہت اچھا دوست، مخلص لطیفہ گو، خوش مزاج، بذلہ سنج، بہت سچا اور پیارا لڑکا، ستار بہت اچھا بجاتا تھا۔ اور گاتا بھی خوب لیتا تھا لیکن صرف دوستوں کے محفل میں، پہاڑ کی گود میں یا دریا کے کنارے۔ وہ سارے گاؤں میں اپنی شرارتوں کے لئے بہت مشہور تھا۔ ان گنت دلچسپ واقعات بعض بہت سنجیدہ اور خطرناک بھی، اس کے ساتھ پیش آئے۔ اور وہ جب انہیں سنانے پر اترتا تو رات گزرنے کا احساس تک نہیں ہوتا۔ میں نے فوراً سوچا کہ گاؤں جا کر اس سے کوئی دلچسپ سی شرارت کا حال سن کر آنکھ مچولی کے شرارت نمبر، کے لئے بھیجوں گا لیکن ——

گاؤں جا کر معلوم ہوا کہ پرسوں وہ اپنے ایک دوست اور دور کے رشتہ دار کو جو اتفاق سے میرا بچپن کا دوست اور کلاس فیلو بھی تھا قتل کر کے علاقہ غیر یعنی بلوچستان فرار ہو گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ قتل معمولی سی بات پر ہوا۔ دونوں گپ شپ لگا رہے تھے۔ کسی بات کو دونوں نے اپنی غیرت کا مسئلہ بنایا دونوں نے ایک دوسرے پر فائرنگ کی۔ غفور بیچارا مر گیا۔ شیر اکبر بیچارا (جسے میں اکثر کہتا کہ تم نے پڑھائی تو ویسے بھی چھوڑ دی ہے۔ اس لئے تم ایک اچھے شاعر اور موسیقار بن سکتے ہو اور وہ بھی کہتا کہ ہاں میں بنوں گا) شرافت، خلوص اور نیک دلی کے باوجود یکایک قاتل بن کر مفرور ہو گیا۔ سچ ہے کہ مذاق بھی ایک حد ہی میں اچھا لگتا ہے۔

(عابد سلطان — پشاور)

کیچپ تو صِرف

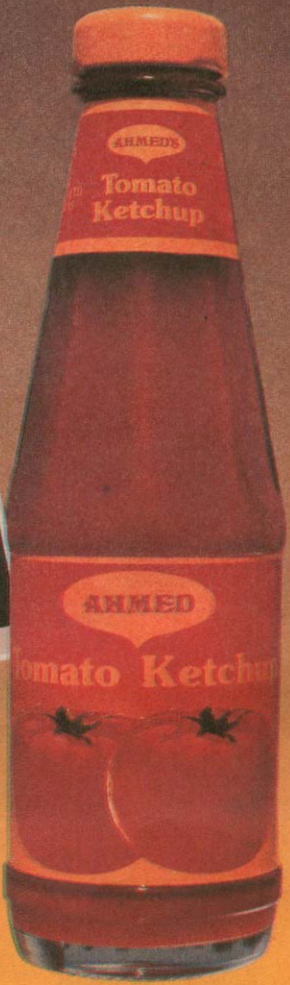

احمد

ٹماٹو کیچپ

شرارت ہی تو ہے

سلمان غزالی

جواد نے دونوں جانب دیکھا...... لابی میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے دھیرے سے دروازے پر دباؤ ڈالا، دروازہ بنا کسی آواز کے کھلتا چلا گیا۔ کمرے میں کوئی نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ممی پاپا دونوں نیچے سٹنگ روم میں بیٹھے ہوئے ہیں تب وہ دبے پاؤں اندر داخل ہو گیا۔ اس نے پورے کمرے میں ایک نظر دوڑائی اور بالآخر بستر کے ساتھ دھرے سائیڈ ٹیبل پر پڑے ہوئے ممی کے پرس پر اس کی نظر رک گئی۔ وہ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے سائیڈ ٹیبل کے پاس آ کر کر ٹھہر گیا۔ اس نے ایک دفعہ پھر دروازے کی طرف دیکھا اور بڑی خاموشی اور احتیاط سے بیگ اٹھا لیا۔ اس نے بیگ کھولا۔ بیگ بے شمار چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ مار کر چیزیں چیک کیں کاغذ، رسیدیں، لپ اسٹک، گولڈ چین، انگوٹھی، ٹشو پیپر اور بہت سی چیزیں پھر اس کی نظریں سو سو اور پانچ سو کے نوٹوں پر جم گئیں۔ اس

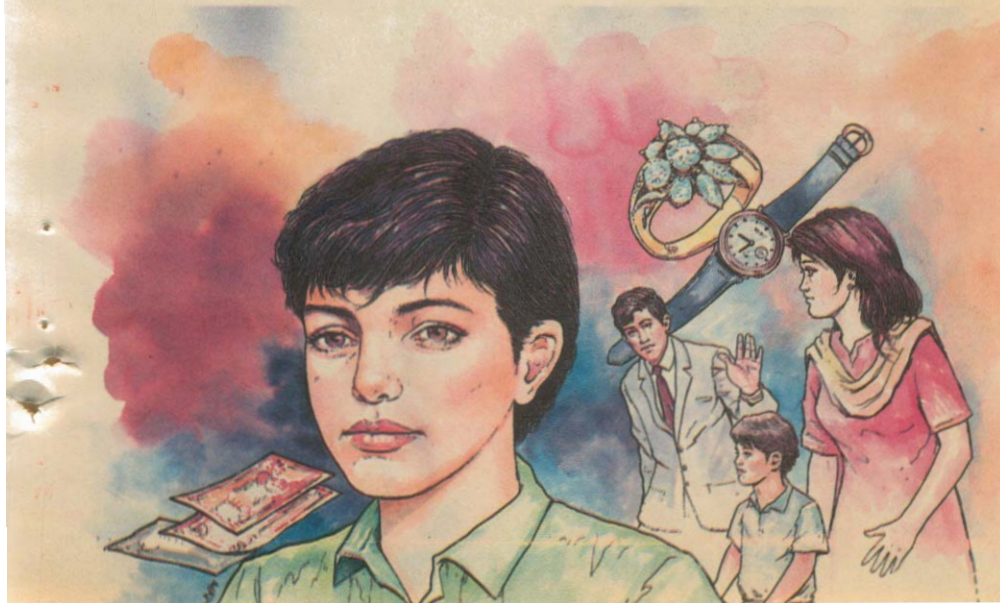

نے روپے ہاتھ میں لئے "نہیں" پھر کچھ سوچا اور بڑے نوٹ رکھ کر ایک پچاس روپے کا نوٹ اٹھایا۔ ابھی اس کا ہاتھ بیگ میں ہی تھا کہ ایک تیز آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی "یہ کیا کر رہے ہو جواد؟" وہ بری طرح گڑبڑا گیا۔ "جی..... وہ ..... میں۔" اس سے کچھ نہ بن پڑا۔ ممی نے آگے بڑھ کر زمین پر سے بیگ اٹھایا "میں کیا پوچھ رہی ہوں تم سے .....!!" ممی نے سختی سے جواد کے کاندھے کو پکڑا تو ڈیڈی نے جواد کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا، ممی کے ساتھ ساتھ وہ بھی کمرے میں آگئے تھے۔

"کیوں بیٹا کیا بات ہے، کیا ڈھونڈ رہے تھے آپ؟" ڈیڈی نے بڑے پیار سے پوچھا، جواد کا ہاتھ اب اپنی جیب میں رینگ گیا تھا۔ "کچھ چاہئے تھا میرے بیٹے کو۔" ڈیڈی نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

"جی پاپا وہ چاکلیٹ۔" وہ بولا۔ ڈیڈی کے رویے سے اسے کچھ حوصلہ ہوا تھا۔

"میرے بیگ میں!" ممی نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"جی وہ آپ نے کہا تھا اور بازار سے چاکلیٹ لاؤں گی تو میں نے سوچا کہ شائد بیگ میں ہوں۔" اب جواد سنبھل گیا تھا۔ "مگر یہ بیگ تو میں ساتھ لے کر نہیں جاتی اور....." ممی بولیں تو ڈیڈی نے بات کاٹ دی۔ "ارے! تو یہ بچے کو کیا پتہ بلاوجہ ڈانٹ رہی ہو اسے۔" وہ جواد کی طرف مڑے۔

"بس بیٹا اتنی سی بات تھی ممی سے پوچھ لیا ہوتا۔ چلو جاؤ کوئی بات نہیں۔" جواد بھاگتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا اور ممی اُن سے کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئیں۔ "آپ بھی کمال کرتے ہیں بلاوجہ کا لاڈ اچھا نہیں ہوتا۔ کچھ معاملوں میں سختی بھی کرنی چاہئے۔"

"ارے چھوڑو بھی بچہ ہے۔" ڈیڈی نے ممی کے ہاتھ سے بیگ لے کر ٹیبل پر رکھ دیا۔

"جواد گھر والوں کا بہت لاڈلا تھا۔ غلطی پر تو دور کی بات اسے کبھی کسی شرارت یا بدتمیزی پر بھی سزا نہیں ملی تھی۔ وہ شرارت شرارت میں خاصا بدتمیز ہو جاتا اور کبھی کبھی نقصان بھی کر بیٹھتا مگر اس کے ڈیڈی کبھی کسی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بچے کو شرارت سے روکنے سے اس کی نفسیات خراب ہو جاتی ہے۔ اس کی ممی البتہ سختی کرتیں مگر وہ جب جواد کو ڈانٹنے لگتیں ڈیڈی اسے بچا لیتے۔ جواد کے دفاع کے لئے ہر بات کا ان کے پاس ایک ہی جواب ہوتا۔ "بچہ ہے بچے تو شرارت کرتے ہی ہیں۔" مگر اب جواد اتنا بچہ نہیں تھا۔ وہ بہت سی باتیں سمجھتا تھا۔ ڈیڈی کی طرف داری نے اس کے اندر کا خوف ختم کر دیا تھا۔ کچھ عرصے سے اس نے گھر سے تھوڑے تھوڑے کر کے روپے اٹھانے شروع کر دیئے تھے۔ رقم اتنی معمولی ہوتی کہ کسی کو پتہ نہ چلتا اور پھر جواد جانتا تھا کہ اگر کسی دن وہ پکڑا بھی گیا تو اسے اس کی شرارت سمجھ کر چھوڑ دیا جائے گا گو ہر چند

مانگنے پر اسے مل جاتی تھی مگر چپکے سے رقم اٹھا کر خود خرچ کرنے میں اسے مزہ آنے لگا تھا۔ اسے کسی سے مانگنا نہیں پڑتا تھا۔ اسے وہ رقم اپنی اپنی سی لگتی تھی۔

ایک دن اس نے شرارتاً ڈیڈی کی قیمتی گھڑی اٹھالی۔ اس کا خیال تھا کہ شام کو انہیں واپس کر دے گا جب وہ آفس سے واپس آئیں گے۔ گھڑی باندھ کر وہ باہر کھیلنے نکل گیا۔ پاس ہی پان سگریٹ کی دکان کرنے والے فضلو کا بیٹا مجید جو اکثر دکان پر بیٹھتا تھا اس نے جواد کے ہاتھ میں وہ گھڑی دیکھی تو پوچھنے لگا کہ گھڑی کہاں سے آئی ہے؟

"یہ گھڑی میرے پاپا کی ہے۔" جواد نے ہاتھ گھما کر گھڑی دکھائی۔

"وہ جانتے ہیں کہ گھڑی تمہارے پاس ہے۔" مجید نے پوچھا۔

"نہیں تو میں نے چپکے سے اٹھالی تھی۔ جب وہ ڈھونڈنے لگیں گے تو پھر انہیں دوں گا۔" جواد نے سادگی سے کہا۔

"تم یہ گھڑی مجھے دے دو تو میں تمہیں سو روپے دوں گا۔" مجید نے سو کا کڑک نوٹ لہرایا۔ سو روپے کا نوٹ دیکھ کر جواد کو بازار میں پڑی ہوئی بہت سی چیزیں یاد آگئیں۔

"مگر ڈیڈی....." جواد نے گھبرا کر کہا۔

"تمہارے ڈیڈی کو تو پتہ ہی نہیں کہ یہ تمہارے پاس ہے پھر تمہیں گھبرانے کی کیا ضرورت ہے تم کسی کو بتانا ہی مت۔" جواد کی ممی اسے سینکڑوں روپے کی چیزیں لے کر دیتی تھیں مگر سو روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ میں کبھی نہیں دیا تھا۔ جواد نے سو روپے پکڑ لئے۔

گھر کی ملازمہ نے جواد کو گھڑی پہنے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ یہ بات ممی ڈیڈی کو پتہ چل گئی وہ پہلی دفعہ یوں پکڑا گیا تھا۔ وہ بہت خوفزدہ تھا بس اسے ڈیڈی کی وجہ سے کچھ سہارا تھا۔ ممی بہت غصے میں تھیں انہوں نے جواد کا کان پکڑ لیا "گھڑی کہاں ہے؟"

"وہ..... وہ کھیلتے ہوئے کہیں گر گئی۔" وہ روہانسی آواز میں بولا۔

"گر گئی..... اتنی قیمتی گھڑی مگر تمہارا پاپا کی گھڑی سے کیا کام، تم نے گھڑی اٹھائی کیوں تھی۔" ممی بہت گرم تھیں۔

"میں تو صرف اپنے دوستوں کو دکھانے کے لئے لے گیا تھا۔ آئی ایم سوری پاپا۔" جواد روتے ہوئے ڈیڈی سے لپٹ گیا تھا اور ڈیڈی نے اسے پیار سے گلے سے لگا کر اسے آئندہ ایسا نہ کرنے کی تلقین کرتے ہوئے بات یہیں پر ختم کر دی تھی۔ اس وقت جواد کو امید نہیں تھی کہ معاملہ اتنی آسانی سے نمٹ جائے گا۔ اس بات کو اب عرصہ گزر گیا تھا اور سزا کا خوف اب جواد کے دل سے تقریباً نکل گیا تھا مگر اس کے باوجود ہیرے کی قیمتی انگوٹھی اس سے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ صبح جب ممی کے اچانک آجانے پر بیگ اس کے ہاتھ سے گر

گیا تھا تو اس وقت اسے اس بات کا احساس نہیں ہوا تھا کہ اس کی مٹھی میں انگوٹھی دبی رہ گئی تھی۔ اسے اب سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اسے رکھ لے یا واپس کر دے۔ ابھی وہ لان میں کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ ممی ڈیڈی کے کمرے سے اسے ممی کی تیز آواز سنائی دی۔

"کمال ہے انگوٹھی کہیں بھی نہیں ہے۔"

"بھئی! یہیں کہیں ہوگی، کہاں جاسکتی ہے، ڈھونڈو گی تو مل جائے گی۔" ڈیڈی نے بڑی لاپروائی سے کہا تھا۔

"مگر مجھے یاد ہے میں نے بیگ میں رکھی تھی اور ..... ارے ہاں صبح جواد نے میرا بیگ کھولا تھا میں اسے بلاتی ہوں۔" ممی جواد کو آواز دینے لگیں تو ڈیڈی بول پڑے۔

"کمال کرتی ہو اب کیا جواد تمہارے انگوٹھی چوری کرے گا، ایسی بات اس سے کہو گی تو بچے کا ذہن خراب ہو جائے گا۔"

"میں نے کب کہا ہے چوری کا، مگر شرارت سے تو اٹھا سکتا ہے پوچھنے میں کیا حرج ہے!"

"ٹھیک ہے اگر اس نے شرارت سے اٹھائی ہے تو واپس کر دے گا۔ اس میں غصہ کرنے کی ضرورت نہیں ابھی وہ سو گیا ہو گا کل میں آرام سے اس سے خود پوچھ لوں گا....."

اس سے آگے جواد کو کچھ سننے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے مٹھی کھول کر چمکدار انگوٹھی کو دیکھا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا اب وہ کافی سمجھدار ہو چکا تھا۔ اسے انگوٹھی کی قیمت کا اندازہ تھا اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ پچھلی دفعہ اس نے گھڑی بہت سستی بیچ دی تھی۔

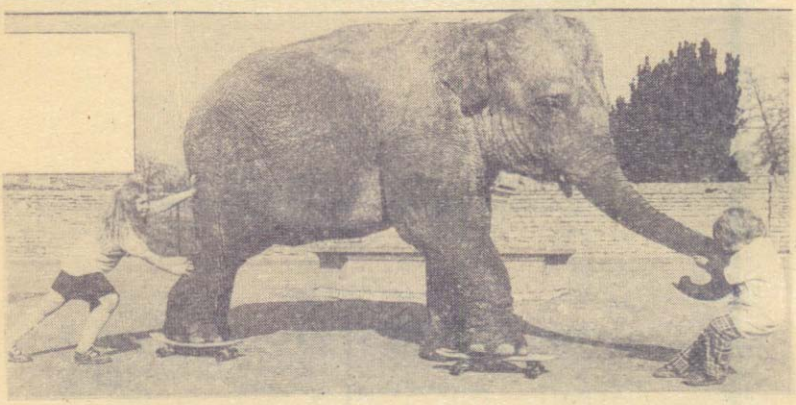

اسکیٹ بورڈ پر کھڑے لوڈ بچے مجھ کو کھینچ رہے ہیں

کپڑوں کی ڈرائی کلیننگ میں بہترین

قالین کی صفائی میں اعلیٰ ترین

TIP-TOP

DRYCLEANERS

*

ہیڈ آفس

علامہ اقبال روڈ ـــــ ۴۵۵۰۹۴۳

*

برانچ آفس

* حسن اپارٹمنٹس ـ ۴۹۶۵۰۶۸
* کلفٹن ـــــ ۵۳۰۳۶۹
* ویڈن برن روڈ ـ ۴۹۴۶۶۱۹
* ڈیفنس سوسائٹی ـ ۵۴۲۱۶۳
* ناظم آباد ـ ۶۲۳۸۱۳
* بلوچ کالونی ۴۳۲۹۵۹

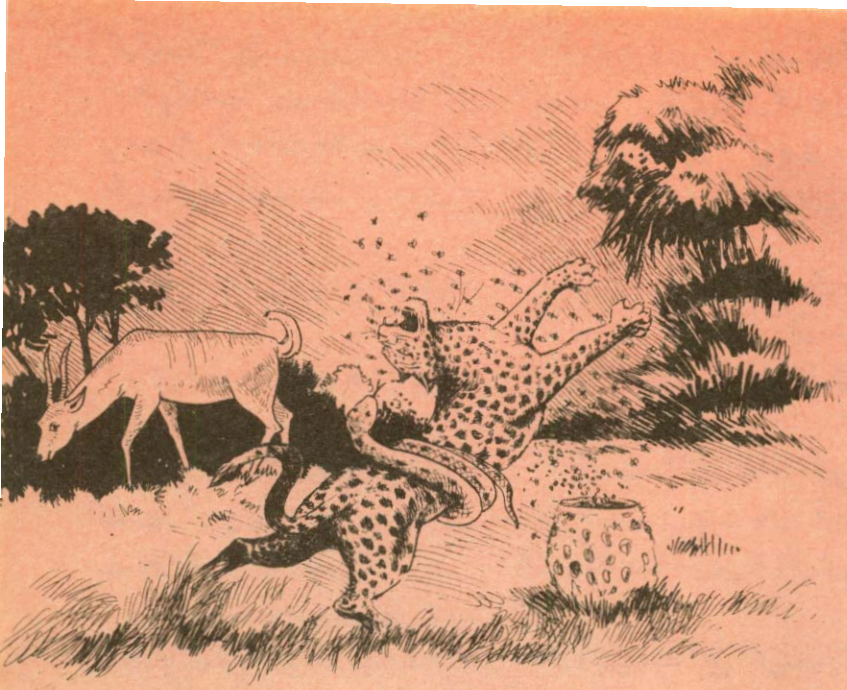

ملائشیا کی شریر لوک کہانی

شریر ہرن

مہوش سکندر

جنگلی ہرن بہت شریر تھا۔ وہ طاقتور نہیں تھا لیکن چالاکی، حاضر دماغی اور شرارتوں میں اس کا جواب نہیں تھا۔

ایک گرم دوپہر کو جنگل میں ہرن نے چیتے کے آنے کی آواز سنی۔ وہ جانتا تھا کہ چیتا اسے کھانے آرہا ہے، اس لئے اس نے چیتے سے بچنے کی ایک ترکیب سوچ لی۔ جب چیتا نمودار ہوا تو اس نے ایسا ظاہر کیا جیسے وہ کسی خاص کھانے کی حفاظت کر رہا ہے حالاں کہ وہ گلے سڑے پتّوں کی حفاظت کر رہا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" چیتے نے پوچھا۔

"یہ کھانا ہے!" ہرن نے جواب دیا "لیکن یہ بہت خاص قسم کا قدیم کھانا ہے۔ اور صرف جنگل کے بادشاہ کے لئے ہے۔ اس لئے میں اس کی حفاظت کر رہا ہوں۔"

"شاہی کھانا!" چیتے کے منہ میں پانی بھر آیا۔

"میں اسے ضرور چکھوں گا۔" چیتے نے کہا۔

"نہیں تم اسے نہیں چکھ سکتے، یہ بادشاہ کا کھانا ہے۔" ہرن چلّایا اور ایک شریر مسکراہٹ کے ساتھ جنگل میں بھاگ لیا۔

ہرن کے جانے کے بعد چیتے نے پتوں کا ایک بڑا نوالہ لیا، وہ توقع کر رہا تھا کہ پتے بہت مزیدار ہوں گے لیکن وہ تو گلے سڑے پتے تھے۔ چیتا غصّے سے چیخا۔ "میں نہیں چھوڑوں گا..... اس نے مجھے بے وقوف بنایا ہے۔" اور ہرن کے پیچھے جنگل میں بھاگا۔

ادھر ہرن نے جنگل میں ایک خوبصورت سانپ دیکھا جو کہ سو رہا تھا۔ ہرن اس کے پاس بیٹھ گیا۔ جب چیتا غصّے سے چلاتا ہوا وہاں پہنچا تو ہرن نے کہا" خاموش! میں بادشاہ کی پیٹی کی حفاظت کر رہا ہوں۔ یہ ایک جادو کی پیٹی ہے۔ جو شخص اسے پہنے گا اور جو بھی اس کی خواہش ہوگی۔ وہ پوری ہو جائے گی۔ لیکن یہ صرف بادشاہ پہن سکتا ہے..... کیوں یہ پیٹی اسی کی ہے۔"

جادو کی پیٹی کا سن کر بے وقوف چیتا خوش ہو گیا اور بولا۔ "یہ پیٹی میں پہنوں گا۔ میری صرف ایک خواہش ہے۔ اپنی خواہش پوری ہوتے ہی میں یہ پیٹی بادشاہ کو واپس کر دوں گا۔"

.....

لیکن دل میں وہ سوچ رہا تھا کہ پیٹی پہن کر بھاگ جائے گا۔ ہرن نے پہلے تو پیٹی دینے سے انکار کیا۔ لیکن پھر اس نے یہ ظاہر کیا کہ جیسے چیتے نے اسے قائل کر لیا ہو۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے کہا "لیکن برائے مہربانی جب تک میں چلا نہ جاؤں، تم اسے نہ پہننا، یہ کہتے ہوئے شریر ہرن پھر جنگل میں بھاگ لیا۔

اور جب چیتے نے "پیٹی" کو پہننے کی کوشش کی تو سانپ جاگ گیا اس نے دیکھا کہ چیتا اسے اپنے جسم کے گرد لپیٹ رہا ہے تب اس نے غصّے سے چیتے کو ڈس لیا لیکن سانپ زیادہ زہریلا نہیں تھا بہر حال

.....

کافی سخت کوشش کے بعد چیتا بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب وہ ہرن کے پیچھے چیختا چلاتا جنگل میں دوڑا جا رہا تھا۔

"میں تمہیں مار دوں گا۔" چیتا پوری قوت سے چلّایا۔ لیکن ہرن سہما نہیں اور بڑے سکون سے ایک گول سی چیز کے پاس کھڑا رہا۔

"برائے مہربانی چپ رہو۔" اس نے چیتے کو مخاطب کر کے کہا۔ "تم دیکھ نہیں رہے کہ میں کیا

کر رہا ہوں۔ میں اس شاہی ڈھول کی حفاظت کر رہا ہوں، جسے صرف بادشاہ ہی بجا سکتا ہے۔ کیا یہ خوبصورت نہیں ہے؟ یہ بہت اچھی آواز نکالتا ہے۔ اور اس کی آواز سننے سے سانپ کا زہر دور ہو جاتا ہے ..... لیکن میں تمہیں یہ بجانے نہیں دوں گا۔"

"میں اسے ضرور بجاؤں گا' اور اگر تم نے مجھے روکنے کی کوشش کی تو میں تمہیں کھا جاؤں گا۔" شریر ہرن یہ دھمکی سنتے ہی وہاں سے بھاگا اور چیتے نے ڈھول کو اپنے پنجے سے زور سے بجایا۔ لیکن وہ ڈھول تو شہد کی مکھیوں کا چھتہ تھا۔ شہد کی مکھیاں غصے میں اپنے چھتے سے باہر نکلیں اور انہوں نے چیتے کو ڈنک مارنے شروع کر دیئے۔

"اُف! مر گیا ..... بچاؤ ..... بچاؤ" چیتا بُری طرح چلایا اور تالاب میں ڈبکیاں لگانے لگا۔ اس بے وقوف چیتے کو دیکھ کر شریر ہرن نے کہا "میں چھوٹا ضرور ہوں لیکن ..... جنگل میں مجھ سے زیادہ کوئی شریر نہیں۔"

"بیگم!..... چائے لاؤ!"

نغمۂ شرارت

تنویر پھول

دنیا کے پاجیوں کے چچا جان، کون؟ ہم!
انسان کے لباس میں شیطان، کون؟ ہم!
کل تیس مکھیوں کا کیا ہم نے تھا شکار
اب بن گئے ہیں تیس مار خان، کون؟ ہم!
اُستاد جی کا "مولا بخش" ہم نے دیا توڑ
جب پوچھا گیا بن گئے انجان، کون؟ ہم!
دادی کا پاندان بھی ہم نے ہی چُھپایا!!
اور تیس روز کھاتے رہے پان، کون؟ ہم!
جتنے شریر بچّے ہیں ان سب کے ہیں لیڈر
گھر میں بنے ہیں "بچۂ نادان" کون؟ ہم!
نغمہ سرائی چھوڑ دو اب پھُول تم اپنی!!
سُن سُن کے بنے جاتے ہیں شیطان، کون؟ ہم!

ایڈیسن کی شرارتیں

خان اکبر علی خان

(۱) ۱۸۴۷ء میں گیارہ فروری کو جب برف باری نے طوفان کی شکل اختیار کر رکھی تھی "سیموئیل ایڈیسن جونیئر" کے ہاں ان کا ساتواں بچہ پیدا ہوا۔ ان کے دوستوں نے پیشگوئی کی۔

"یہ بچہ طوفانی زندگی کا مالک ہو گا۔ کیونکہ طوفان اسے ہوا کے پروں پر اٹھا کر اس دنیا میں لایا ہے۔"

ماں باپ نے اس بچے کا نام "نامس ایلوا ایڈیسن" رکھا جسے ماں باپ پیار کی وجہ سے "آل" کہہ کر پکارتے تھے۔ بچپن ہی سے وہ ان تھک سرگرمیوں اور نئے، اچھوتے خیالات کا مالک تھا۔ وہ ہمیشہ ہر ایک شے کے متعلق کچھ نہ کچھ معلوم کرنے کی دھن میں لگا رہتا۔

چھ برس کی عمر میں ایڈیسن نے پہلا سائنٹیفک تجربہ کیا۔

اس نے ایک دن اپنے باپ کے لکڑی کے انبار میں آگ لگا دی۔ وہ شاید یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آگ لگنے کے بعد کیا ہو گا؟

لیکن اس کے پہلے تجربہ کا نتیجہ اس کی توقع کے بالکل خلاف نکلا۔ لکڑی کا انبار جل کر راکھ ہو گیا۔ ایڈیسن بڑی مشکل کے ساتھ جل کر مرنے سے بچایا گیا۔ باپ نے چیزوں کی تہہ تک پہنچنے کے شوق کا یہ انعام دیا کہ گاؤں کے میدان میں سب کے سامنے ایڈیسن کی خوب پٹائی کی۔

(۲) دوسری بار اس نے ایک اور دلچسپ تجربہ کیا۔

اس کے گھر کے آس پاس کسی جگہ ہنس نے انڈے دے رکھے تھے ایک دن وہ خود ان انڈوں کو سینے کے لئے ان کے اوپر بیٹھ گیا۔ اس تجربہ کا نتیجہ بھی جو نکلنا تھا وہ ظاہر ہے۔

ہنس کے سارے انڈے ٹوٹ پھوٹ گئے۔ جس سے اس کی پتلون گندی ہو گئی۔ ایک بار پھر اس کی پٹائی ہوئی۔ اس نے اپنے اس تجربے کے نتیجے میں ایسی چیزیں دریافت کیں جن سے کوئی مفید کام نہ نکل سکا۔

(۳) جب وہ سات برس کا تھا..... تو اسے بہت سے باتوں کے علاوہ خاص طور پر یہ بات پریشان کئے رہتی کہ آخر پرندوں کے ہوا میں اڑنے کا راز کیا ہے؟

اس نے کئی بار اپنے باپ سے یہ راز معلوم کرنا چاہا۔ لیکن اسے کہیں سے تسلی بخش جواب نہ ملا۔ اور اپنے طور پر اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ پرندے اس لئے ہوا میں اڑتے ہیں کہ ان کی خوراک کیڑے مکوڑے ہیں۔ اس نے اپنے اس عجیب و غریب خیال کو تجربے کی کسوٹی پر پرکھنے کے لئے تیزی سے عمل کیا۔

اگر پرندے کیڑے مکوڑے کھا کر اڑ سکتے ہیں تو اس گھر میں جو لڑکی کام کرتی ہے تو وہ ہوا میں کیوں نہیں اڑ سکتی۔

اس نے ادھر ادھر سے کیڑے مکوڑے جمع کئے۔ انہیں کوٹ چھان کر شربت کا ایک گلاس تیار کیا۔ اور لڑکی کو بلا کر حکم دیا۔

"یہ سارا گلاس پی جاؤ۔"

بیچاری لڑکی اس عجیب و غریب شربت کا سارا گلاس پینے کے بعد ہوا میں اڑنے کے بجائے زمین پر گر گئی۔ اور پیٹ کے درد سے لوٹنے لگی۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اس تجربے کے خطرناک نتیجے میں محفوظ رہی۔ لیکن سزا کے طور پر ایڈیسن کو رات کے کھانے سے ہاتھ دھونے پڑے۔

(۴) روٹی کی بھوک کے ساتھ اس کے تجربے کرنے کی بھوک تیز ہوتی چلی گئی۔ اور آخر کار "پرندوں کے اڑنے کا راز معلوم کرنے کی دھن میں اس نے اپنے دوست "مائیکل اوٹس" پر ایک اور تجربہ کیا۔ ایڈیسن نے مائیکل کو ایک خاص قسم کا نمک (جو دوا کے طور پر استعمال ہوتا ہے) کی ایک بہت بڑی "خوراک" کھلا دی۔ پہلے کی طرح اس تجربے کا نتیجہ بھی "ڈھاک کے تین پات" ہی نکلا۔ مائیکل کے پیٹ میں شدید قسم کا درد اور ایڈیسن کی خوب پٹائی۔

ایڈیسن کے گھر میں ایک تہہ خانہ بھی تھا۔ جو اسے بہت پسند تھا۔ اس تہہ خانے میں اس نے بوتلیں، مرتبان، کیمیائی دوائیں، کئی قسم کے کیڑے مکوڑے، پودے، بوٹیاں اور رنگ برنگے پتھر جمع کر رکھے تھے۔ جنگلوں میں آوارہ گردی کرتے کرتے اس قسم کی جو چیز اس کے ہاتھ لگتی۔ اسے اپنے گودام میں جمع کر دیتا اور اپنا فالتو وقت اسی تہہ خانے میں گزارتا اور اس سے نچلا نہ بیٹھنے والے دماغ میں جس قدر اوٹ پٹانگ خیالات آتے انہیں اس تجربہ گاہ میں تجربے کی کسوٹی پر پرکھا کرتا۔

لیکن ایڈیسن کی ان شرارتوں کو پڑھتے ہوئے یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اس کی شرارتیں کسی کو خواہ مخواہ تنگ کرنے یا تکلیف پہنچانے کے لئے نہیں ہوتی تھیں بلکہ وہ حقیقت کی تہہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ ایک دن سب سے زیادہ چیزیں ایجاد کرنے والا سائنس داں بنا۔

موج میلہ

افشاں بشیر

عُمیر میاں! چلو عاشی باجی کریں موج میلہ
عاشی ! کریں موج کیا خاک پیسہ نہ دھیلا
عُمیر میاں! وہ رکھا تو ہے دادی کا پاندان بہت اس میں پیسے ہیں اے باجی جان
عاشی ! جو ہمت ہے تم میں تو لے آؤ پیسے ذرا میں بھی دیکھوں کہ لاتے ہو کیسے؟
عُمیر میاں! وہ امّی کا بٹوہ جو رکھا ہے باجی بھرے ہیں نئے نوٹ اس پرس میں بھی
عاشی ! چلو خیر بٹوہ اُٹھا لاؤ جاکر تو پھر موج میلہ کریں خوب مل کر
عُمیر میاں! اگر امّی جائیں ذرا سا کچن کو اڑا کر میں لاتا ہوں بٹوہ تو دیکھو
عاشی ! ارے واہ کیسا بہادر ہے بھیّا اُڑا کر مزے سے جو لایا ہے بٹوہ
عُمیر میاں! چلو چاٹ کھائیں چلو جھولا جھولیں چلیں، پارک مل کر چلو خوب گھومیں

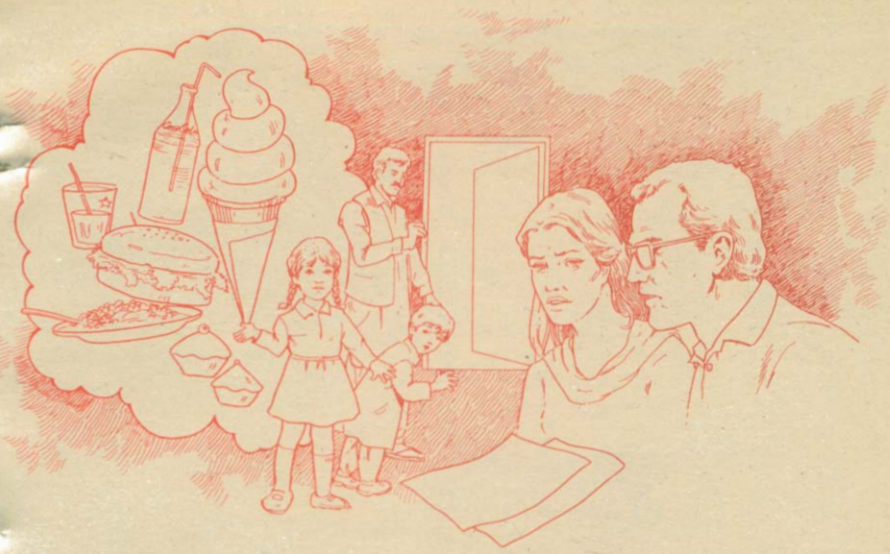

دونوں بہن بھائی پارک جاتے ہیں۔

عمیر میاں! آہا باجی! کتنا مزا آرہا ہے مجھے چاٹ والا نظر آرہا ہے

عاشی ! ارے چاٹ والے ذرا چاٹ لانا بہت چٹ پٹی کھٹی میٹھی بنانا

عمیر میاں! ذرا آلو چھولے مجھے بھی بنا دو کہ پاپڑ پکوڑے مجھے بھی بنادو

عاشی ! یہ بوتل بھی لاؤ وہ بوتل بھی لاؤ ہمیں کوک تم ٹھنڈی ٹھنڈی پلاؤ

عمیر میاں! میں برگر بھی کھاؤں گا اب پیٹ بھر کر

عاشی ! بہت بھر گیا پیٹ اب ہم چلیں گھر

عمیر میاں! ارے اب تو پیسے بھی ختم ہو گئے ہیں مگر سیر بھی خوب ہم ہو گئے ہیں

عاشی ! کہیں پول گھر میں نہ کھل جائے بھیّا چلو گھر چلیں ہو گیا کام اپنا

(گھر میں امّی پریشان حال بٹوہ ڈھونڈنے میں مصروف ہیں

امّی ! مرا بٹوہ جانے کہاں کھو گیا ہے — بُرا حال ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہو گیا ہے

عُمیر اور عاشی! چلو مِل کے ڈھونڈیں ذرا آس پاس — وہ بٹوہ تو دیکھا تھا فضلو کے پاس

امّی ! او فضلو کے بچے! ادھر آ ذرا — اُٹھایا ہے کیوں تونے بٹوہ مرا

تھے اس میں مرے سارے پیسے رکھے — بتا تو نے پیسے کہاں پر رکھے

نوکر فضلو ! نہیں بی بی! میں نے نہیں دیکھا بٹوہ — لگایا ہے کس نے میرا نام جُھوٹا

امّی ! جی عاشی کے ابا! ذرا بات سُنئے — پٹائی تو اس چور فضلو کی کیجئے

خدا کا غضب ہے کہ پیسے چُرائے — پھر اُلٹا ہمیں کو یہ آنکھیں دِکھائے

ابّو ! نہیں بیگم! ایسا نہ الزام دیجئے — ذرا جھوٹ سچ کی تو پہچان کیجئے

شرارت کے پُتلے ہیں بچّے تمہارے — انہوں نے لئے ہوں گے پیسے تمہارے

ادھر آؤ عاشی، عمیر! تم بھی آؤ — کہاں ہے وہ بٹوہ اب سچ سچ بتاؤ

وگرنہ پٹائی کروں گا تمہاری — ابھی پول کھل جائے گا دیکھو سب ہی

عاشی ! میں سچ سچ بتاتی ہوں سب بات ابّو — یہ بھیا بہت ہی ہے چالاک ابّو

اسی نے اُٹھایا تھا امّی کا بٹوہ — کہ جاکر کریں گے بہت موج میلہ

جو دو سو روپے خرچ ہم نے کئے ہیں — یہ سب جاکے باہر ہی کھائے پیئے ہیں

ابّو ! چلو مرغا بن جاؤ اور کان پکڑو — پھر ایسی شرارت سے تم توبہ کر لو

عاشی اور عُمیر ! چلیں ابّو جی اب ہمیں معاف کر دیں — اور فضلو کی جانب سے دل صاف کر لیں

اوہو — بھئی آپ بڑے کم ہمت ہیں۔ اتنی جلدی ہار مان گئے۔ پھر کوشش کیجئے ورنہ صفحہ ۱۸۸ پر دیکھئے۔

جن کا بچہ

ایک شرارتی کہانی

ابن مالک

عاطر نے قرآن حفظ کر لیا تھا اور اب اسے اسکول میں داخل کرانا ضروری ہو گیا تھا..... لیکن اس کے والد اسے اسکول میں داخلہ دلانے سے ڈر رہے تھے۔ ان کے ڈر کی وجہ بھی بجا تھی کیوں کہ عاطر بے حد شریر تھا۔ اس کی شرارتوں کا نشانہ اس کے ہم عمر ہی نہیں بڑے بھی بنتے رہتے تھے۔ گھر میں وہ دادا، دادی کو بھی نہیں بخشتا تھا۔ دادا، دادی بھی اس کی شرارتوں سے عاجز آ چکے تھے اس لئے جب عاطر کے ابو نے اسکول میں داخلے والی تجویز ان کے سامنے رکھی تو انہوں نے اس تجویز کی زبردست حمایت کی اور کہا کہ اس تجویز کو فوری عملی جامہ پہنایا جائے کیوں کہ اسکول میں پڑھنے سے عاطر "انسان کا بچہ" بن جائے گا۔

عاطر کو اسکول میں داخل کرا دیا گیا اور اب ..... انسانوں کے بچے اس کی شرارتوں کا نشانہ بننے لگے لیکن اپنے ابو کی سخت تنبیہ کی وجہ سے اس کی شرارتیں ایسی ہوتیں کہ شرارت کا نشانہ بننے والوں کو پتہ ہی نہ چلتا کہ "شرارت عاطر نے کی ہے۔" وہ جادو کے زور سے ہم جماعتوں کی رنگ برنگی پنسلیں غائب کر دیتا، کسی کی کاپی کسی کے بستے میں اور کسی کا بستہ اڑا کر کسی درخت میں ٹانگ دیتا۔ (بعد میں وہ سب چیزیں بچوں کو واپس مل جاتیں کیوں کہ عاطر کا مقصد صرف شرارت کرنا تھا) اس کے ہم جماعت ہاف ٹائم میں کھانے پینے

کے لئے جو پیسے لاتے عاطر انہیں جادو کے زور سے اپنی جیب میں دھر لیتا اور مزے سے چاٹ والے کے پاس کھڑا ہو کر چٹخارے لے لے کر چاٹ کھاتا۔

اکثر یہ ہوتا کہ جماعت کے کمرے میں لگے ہوئے پنکھے چلتے چلتے رک جاتے اور پھر مخالف سمت میں گھومنے لگتے۔ پھر ان پنکھوں میں سے چرخ چوں جیسی آوازیں نکلنے لگتیں یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی پرانی "پن چکّی" چل رہی ہو۔ بچے حیران ہو کر پنکھوں کو دیکھنے لگ جاتے اور شریر عاطر ان کی حیرانی اور پریشانی سے لطف اندوز ہونے لگتا۔

کلاس میں عاطر جب کوئی شرارت کرتا تو اس پر کوئی حرف نہ آتا کیوں کہ وہ تو اپنی جگہ اطمینان اور معصومیت سے بیٹھ کر اپنی خفیہ طاقتوں کو حرکت میں لاتا تھا۔

ایک بار اسکول میں انسپکٹر صاحب معائنے کے لئے تشریف لائے۔ جب وہ چھٹی جماعت میں داخل ہوئے تو حیران رہ گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ سر یعقوب بلیک بورڈ کے قریب کرسی بنے کھڑے ہیں (جس طرح کہ اکثر بچے سزا میں گھٹنے موڑ کر کرسی بنتے ہیں) انسپکٹر صاحب کو دیکھتے ہی تمام بچے سیٹوں سے کھڑے ہو گئے۔ سر یعقوب بھی سیدھے کھڑے ہو گئے۔ پھر جب انسپکٹر صاحب کا اشارہ پا کر بچے اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے تو سر یعقوب بھی دوبارہ کرسی بن گئے۔

"یہ آپ..... بچوں کے سامنے کیا حرکت کر رہے ہیں؟" انسپکٹر صاحب نے دبی دبی آواز میں سر یعقوب سے کہا "کیسی حرکت جناب!" سر یعقوب کچھ گھبرا سے گئے۔ "آپ کی کرسی کہاں ہے؟" انسپکٹر صاحب نے میز کے اطراف نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا "کک..... کرسی..... کرسی ہی پر تو بیٹھا ہوں جناب میں!" سر یعقوب حیرت سے اٹھ کھڑے ہوئے اور انسپکٹر صاحب کو جیسے چکر سا آ گیا۔ انہوں نے دیکھا کرسی اپنی جگہ موجود تھی اور یعقوب صاحب کرسی پیچھے کھسکا کر ہی اٹھے تھے۔

"کہیں میری طبیعت تو خراب نہیں؟" انسپکٹر صاحب نے ماتھے پر آنے والا پسینہ پونچھا۔ وہ حیران تھے کہ کچھ دیر پہلے کرسی موجود نہیں تھی اور اب موجود ہے۔ جماعت کے تمام بچے حیرانی سے انسپکٹر صاحب کی طرف دیکھ رہے تھے جب کہ عاطر انسپکٹر صاحب کے چہرے پر اڑتی ہوائیاں دیکھ کر لطف اندوز ہو رہا تھا۔

عاطر کے ابو ایک شریف جن تھے، انہوں نے بھی انسان ہی کے مدرسے میں پڑھا تھا اور اب اپنے شریر بیٹے کو انسانوں کے ایک اسکول میں چھٹی جماعت میں داخل کرایا تھا۔ عاطر پڑھنے لکھنے میں بے حد ذہین تھا۔ اساتذہ اس کی ذہانت اور قابلیت سے بہت متاثر تھے جب کہ بچے اس کی خفیہ شرارتوں سے، جو کہ عاطر اپنی شرارتی طبیعت کے پیش نظر کرتا رہتا تھا۔ عاطر کے ابو ڈر رہے تھے کہ اس کی شرارتوں کی وجہ سے کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی

) یہ بھانڈا پھوٹ جائے گا کہ وہ ایک جن کا بچہ
، لیکن عاطر کی شرارتوں میں ذہانت کا پہلو بھی
یاں تھا اس لئے بھانڈا پھوٹنے کا کوئی امکان نہ
۔

ایک روز عاطر جماعت میں پہنچا تو اس نے دیکھا
ایک نیا لڑکا جماعت میں داخل ہوا ہے۔ بڑی
ی روشن چمکدار آنکھیں ذہانت ٹپکاتی ہوئی، سیاہ
ں، خوبصورت ناک نقشہ اور رنگ بے حد گورا۔
ں لڑکے کا نام اشرف تھا۔ سر یعقوب سبق
ھانے کے بعد سوالات پوچھنے لگے۔ کچھ سوالات
اب سے ہٹ کر تھے اور خاصے مشکل تھے۔ کسی
کے کو جواب نہ آتا تھا۔ سر نے عاطر سے بھی
سوال پوچھا لیکن عاطر کو بھی اس سوال کا جواب
علوم نہیں تھا۔ اشرف نے ہاتھ کھڑا کیا اور سر کا
شارہ پاتے ہی کھٹ سے جواب دے ڈالا۔ "بھئی
ابا ش!" سر بہت خوش ہوئے پھر انہوں نے اور
ں سوال پوچھے اور اشرف نے فٹافٹ سوالوں کے
اب دے کر سر کو خوش کر دیا۔ "بھئی عاطر!
رف میاں نے تو آج تمہیں بھی پیچھے چھوڑ
یا۔" سر نے عاطر سے کہا تو عاطر کو پہلی دفعہ کسی
کے سے جلن محسوس ہوئی حالاں کہ اس سے
لے اس کے ساتھ ایسا کبھی نہ ہوا تھا۔ سر یعقوب ہر
ت اسی کی ذہانت کی تعریفیں کرتے رہتے تھے۔

"میں انسان کے اس بچے کو اس کی ذہانت کا
ضرور چکھاؤں گا۔" عاطر نے دل ہی دل میں
ت پیتے ہوئے کہا اور ...... جب سر یعقوب کا

پیریڈ ختم ہو گیا تو اس نے دیکھا اشرف سر جھکائے کاپی پر لکھنے میں مصروف ہے۔

ہاف ٹائم میں تمام بچے جماعت سے باہر چلے گئے تو جماعت میں صرف اشرف اور عاطر رہ گئے۔ اشرف سر جھکائے اردو کے سبق کے سوال حل کر رہا تھا۔ "بڑے پڑھاکو بن رہے ہیں مسٹر...... ہاف ٹائم میں بھی پڑھ رہے ہیں ...... ابھی مزا آ جائے گا بچہ جی جب چیخیں مارتے ہوئے کلاس سے باہر بھاگیں گے!!" یہ سوچ کر عاطر نے ایک بار پھر جماعت کا جائزہ لیا۔ اشرف کے سوا کمرے میں کوئی نہ تھا۔ جماعت کے بچے میدان میں کھیل کود رہے تھے۔ کچھ ٹھیلوں پر چاٹ کھانے میں مصروف تھے۔

موقع غنیمت جان کر عاطر اشرف کے پاس پہنچا۔ اشرف نے کاپی پر سے سر اٹھایا اور یہ سمجھ کر کہ عاطر اس سے ہاتھ ملانے آیا ہے، اپنا ہاتھ آگے بڑھایا لیکن عاطر کی آنکھوں میں تو شرارت ناچ رہی تھی۔ اس نے ہاتھ نہیں ملایا ...... ایک دم سے بھوت بن گیا...... خوفناک قسم کا بھوت، جس کے بڑے بڑے نوکیلے دانت منہ سے باہر جھانک رہے تھے، آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں.... لیکن اشرف بالکل نہیں گھبرایا ...... بلکہ گھبرانے کے بجائے کچھ دیر تک اسے غصیلی نظروں سے دیکھتا رہا اور پھر جیسے ہی عاطر اس کی طرف بڑھا...... اشرف دھواں بن کر غائب ہو گیا............!!

ابّا جان اور میں

صفیان علی شیخ

بچپن کے بارے میں جب بھی میں سوچتا ہوں ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ کھیل جاتی ہے۔ کیسے دن تھے وہ بھی! سکون کے دن، خوشیوں کے دن، کوئی فکر پاس نہ ہو تو ذہن نت نئی شرارتیں تراشتا ہے اور پھر وہ بچپن کس کام کا جس میں شرارتیں نہ ہوں۔ میرا بچپن بھی انہی شرارتوں کے درمیان گزرا ہے۔ میں شرارت کر گزرتا تھا، چاہے بعد میں پٹائی ہی کیوں نہ ہو جائے۔ اس وقت میں بچپن کی ایک شرارت آپ کو سناتا ہوں۔

سردی کا موسم تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ میں لحاف میں دبکا ناول پڑھ رہا تھا۔ کبھی کبھی ایک آدھ نظر ابا جان پر بھی ڈال لیتا تھا جو ہومیو پیتھک کی کوئی کتاب پڑھنے میں مصروف تھے۔ رات کے تقریباً دس بج رہے تھے۔ جب مجھے پڑھتے ہوئے ڈیڑھ گھنٹا گزر گیا تو ابا جان کو شک ہوا۔ انہیں حیرت تھی کہ میں سائنس جیسا خشک مضمون دل لگا کر کیسے پڑھ رہا ہوں۔

جب ڈیڑھ سے دو گھنٹے ہو گئے تو وہ چپکے سے اپنی چارپائی سے اٹھے اور میری طرف بڑھے۔ میں نے ان کے اٹھتے ہی پیر سکوڑے اور ناول کو پیروں میں دبا کر سائنس کی کتاب پر نظریں جما دیں۔ انہوں نے جھک کر کتاب دیکھی تو میرا دل دھک سے رہ گیا کیوں کہ کتاب الٹی تھی۔ میں نے جلدی سے اسے سیدھا کیا اور نہایت سنجیدگی سے صفحے پر نظریں گاڑ دیں۔

ابا جان میرے ہاتھ سے کتاب لیتے ہوئے بولے "ہوں! ...... تو یہ پڑھائی ہو رہی ہے! ذرا بستر سے نکلنا۔"

جل تو جلال تو کا ورد کرتے ہوئے میں نے ناول کو وہیں چھوڑا اور بستر سے نکل کر فرش پر کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے رضائی کھینچ کر ناول کے اوپر ڈال دی اور لگے تلاشی لینے۔ سب سے پہلے تکیے کے نیچے دیکھا پھر چادر گدے اور دری کی باری آئی۔ آخر میں چار پائی کے نیچے نظر ڈالتے ہوئے بولے۔ "سچ سچ بتاؤ ناول کہاں ہے؟" میں نے چونکنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا "کیسا ناول ابا جان؟ آج تو میں لائبریری گیا ہی نہیں۔"

انہیں میری بات کا یقین نہیں آیا تھا مگر ناول بر آمد نہ ہونے کی وجہ سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے۔ تھوڑی دیر سوچتے رہے پھر بولے "ذرا بتانا تو کیا چیز یاد کر رہے تھے؟"

"امونیا گیس کے بارے میں پڑھ رہا تھا۔"

انہوں نے گھور کر میری طرف دیکھا۔ پھر کتاب میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔ "کون سا باب ہے امونیا گیس کا؟ ذرا نکالنا۔"

میں نے کتاب ان کے ہاتھ سے لے لی اور جیسے ہی پہلا صفحہ کھولا، دل دھک سے رہ گیا کیوں کہ وہ کیمسٹری کی نہیں فزکس کی کتاب تھی۔

مجھے خاموش دیکھ کر بولے۔ "کیا بات ہے؟ کتاب کیوں نہیں کھولتے؟"

میں نے ہکلاتے ہوئے کہا "وہ ...... دراصل ابا جان نیوٹن ......"

"ایسی کی تیسی نیوٹن کی ...... یہ امونیا گیس میں نیوٹن کہاں سے گھس آیا؟"

ابا جان کی اس بات پر سب بہن بھائی جو بظاہر سو رہے تھے کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ ابا جان نے سر گھما کر انہیں ڈانٹ پلائی پھر مجھ سے بولے "گدھے کہیں کے! پڑھنا ہوا کرے تو ٹھیک طرح پڑھا کرو نہیں تو کوئی ضرورت نہیں ہے نیند خراب کرنے کی۔" اور میں نے بڑی شرافت سے سر جھکا دیا۔

تھوڑی دیر بعد انہوں نے حکم دیا "چلو لیٹو۔" میں جو بھیگی بلی بنا کھڑا تھا بستر پر لیٹ گیا پھر بڑے آرام سے رضائی کھینچ کر سینے تک لایا ڈر تھا کہ کہیں رضائی کھینچنے سے ناول نیچے نہ گر جائے یا زیادہ کھینچ لینے سے ابا جان کو نظر نہ آجائے اور میری یہی حرکت ابا جان نے تاڑ لی۔ انہوں نے رضائی اٹھا کر دوسری چار پائی پر ڈال دی۔ میں نے آنکھیں یوں بند کر لیں جیسے بلی کو دیکھ کبوتر بند کر لیتا ہے۔ اب حالت یہ تھی کہ میں آنکھیں بند کئے چت لیٹا تھا اور ناول پیروں کے نیچے دبا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد یوں محسوس ہوا۔ جیسے باہر بادل گرج رہے ہوں اور کمرے میں ابا جان۔ تھوڑی دیر بعد مجھ پر اولے برسنے لگے۔ پہلا جوتا پڑنے پر میں چار پائی سے اس طرح اچھلا جیسے بستر نے کاٹ لیا ہو۔ لیکن صاحب اس اچھل کود کا مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ جوتے پڑنے اس وقت بند ہوئے جب

ابا جان کا ہاتھ تھک گیا۔ میں نے اللہ میاں کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کیوں کہ جوتے کا سائز چھوٹا تھا اگر بڑا جوتا ان کے ہاتھ آجاتا تو میری خیر نہیں تھی۔ غصے سے بڑبڑاتے ہوئے اپنی چار پائی پر جا لیٹے۔

اب چھوٹے بھائی کو شرارت جو سوجھی تو لگا منہ چڑانے۔ وہ رضائی سے گردن نکالتا۔ منہ چڑاتا پھر غڑاپ سے منہ اندر کر لیتا۔ میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ جاتا۔ بس چلتا تو دو چار ہاتھ اس کے ضرور جماتا لیکن ابا جان کے ہوتے ہوئے یہ کیوں کر ممکن تھا۔ آخر مجھے ایک شرارت سوجھی۔ میں نے رضائی کے اندر منہ کر کے "کھی کھی" کی آواز نکالی۔ یہ سن کر بہن بھائی ہنس پڑے۔ ابا جان نے ڈانٹ کر کہا۔ "یہ کیا آدھی رات کو دانت نکال رہے ہو! سو جاؤ!" ایک بھائی ہنستے ہوئے بولا "ابو، بھائی ہنسا رہے ہیں۔" ابا جان نے مجھ سے کہا اگر پڑھنا نہیں ہے تو لائٹ آف کر دو۔"

اور یہ کہہ کر خود بتی بجھا دی..... باہر بارش تیز ہو گئی۔ ابا جان کی چار پائی دروازے کے پاس تھی۔ ان پر پانی کے چھینٹے آنے لگے وہ جلدی سے اٹھے اور چار پائی کھینچ کر میرے دائیں جانب آگئے۔ اب بائیں طرف تو دو بھائیوں کی چار پائی تھی اور دائیں جانب ابا جان کی۔ ابا جان کے ساتھ بھی میرا ایک چھوٹا بھائی لیٹا ہوا تھا۔

میرے دماغ میں پھر ایک شرارت نے جنم لیا۔ فرش پر ہاتھ پھیرا تو ایک تنکا ہاتھ آگیا میں نے ہاتھ بڑھایا اور ابا جان کے پاس لیٹے ہوئے بھائی کے کان میں پھرا دیا۔ بھائی نے جلدی سے کان کھجلایا۔ اور بڑی زور سے ہنسا۔ ابا جان نے کس کے ہاتھ دیا اور بولے "کیا کھی کھی کر رہے ہو! اب سونے بھی دو گے یا نہیں؟" وہ بولا "بھائی جان کان میں تنکا گھما رہے ہیں۔" ابا جان ڈانٹ کر بولے "سو جاؤ چپ کر کے۔ اب شرارت کرے تو بتانا۔"

میں نے بھائی کے کان میں تنکا پھرا کر جلدی سے سر رضائی کے اندر کر لیا تھا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد سر نکالا اور آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر بھائی کے کان میں تنکا پھرا دیا۔ لیکن وہ بھائی کا کان نہیں تھا۔ یہ اس وقت معلوم ہوا جب ابا جان ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ انہوں نے اٹھ کر لائٹ جلائی تو میں نے دیکھا ان کی ایک انگلی کان میں تھی۔ اب مجھے کیا معلوم تھا کہ انہوں نے بھائی سے جگہ بدل لی ہے۔ انہوں نے پھر وہی جوتا اٹھایا جس سے پہلے بھی ایک دفعہ پیٹ چکے تھے۔

اب حالت یہ تھی کہ وہ ایک ہاتھ سے انگلی سے کان کھجلاتے جاتے تھے اور دوسرے ہاتھ سے میرے اوپر جوتے برسا رہے تھے۔ سب بہن بھائی بھاگ کر دوسرے کمرے میں جا گھسے اور ان کے قہقہوں نے سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔ آخر میں ابا جان بھی ہنس پڑے۔ وہ ہنستے ہوئے بولے "کم بخت! مجھے بھی نہیں چھوڑتا۔" اب میں انہیں کیسے سمجھاتا کہ قصور میرا نہیں۔ قصور تو اس تنکے کا ہے جو غلط جگہ پہنچ گیا۔

Goldfish
Deluxe Pencil

حقیر سی لکیر

حقیر سی لکیر سے اعلیٰ تحریر تک
ہر قدم، ہر مرحلے پر آپ کی ساتھی

گولڈ فِش ڈیلیکس پینسل

SHAHSONS (PVT) LIMITED
D-88 S.I.T.E MANGHOPIR ROAD, KARACHI-16.
PHONE: 296001-4

جہاں چلے، رواں چلے

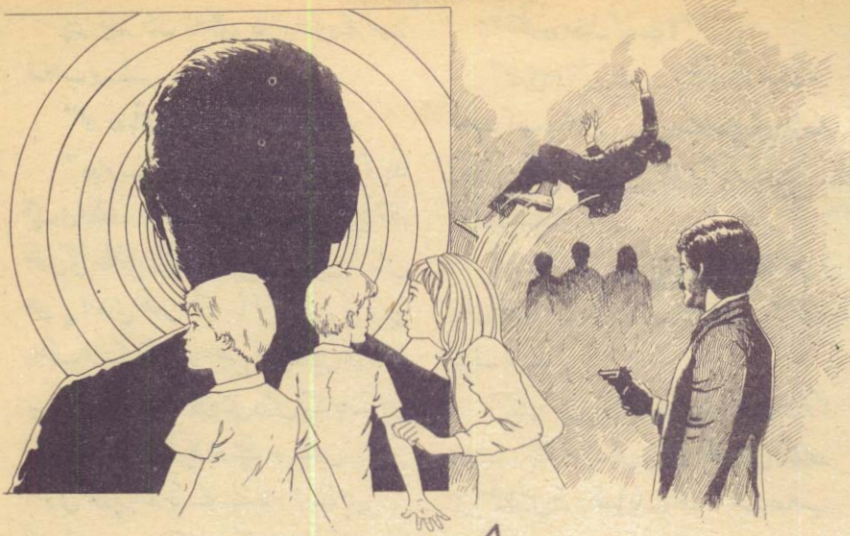

تیرہویں قسط

بچاؤ

اشتیاق احمد

انسپکٹر جمشید کی غیر موجودگی میں بچے گھر پر اکیلے تھے کہ پروفیسر عمران جاہ زخمی حالت میں گھر کے اندر داخل ہوئے۔ دشمن بھی ان کے تعاقب میں یہاں آن پہنچا۔ ایک طویل ذہنی اور جسمانی جنگ کے بعد بالآخر دشمن کو قابو کر لیا گیا۔ انسپکٹر جمشید واپس گھر پہنچے تو میدان صاف ہو چکا تھا۔ تمام حالات معلوم کرنے کے بعد وہ فوج کی مدد سے اپنے ساتھیوں سمیت شہر کی محفوظ ترین عمارت میں منتقل ہو گئے۔ انشارجہ کا زلزلہ بہت چالاک تھا۔ وہ پے در پے چالیں بدل کر عمارت کے اندر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس وقت وہ انسپکٹر جمشید کے میک اپ میں تھا۔ لیکن بظاہر معصوم نظر آنے والے بچے اس کے لئے لوہے کا چنا ثابت ہوئے اور وہ پیکٹ حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ بالآخر صدر صاحب کے انشارجہ سے واپس آنے پر پیکٹ ان کے حوالے کرنے سے پہلے پروفیسر عمران جاہ نے اپنی طویل کہانی کا آغاز کیا۔

(اب آپ آگے پڑھئے)

چند سیکنڈ تک خاموشی طاری رہی پھر صدر صاحب بولے۔

"اور وہ باتیں کیا تھیں؟"

"دوسرے ملکوں کے سائنس دانوں کو بلانا ایک ڈراما تھا۔ ..... دراصل وہ لوگ اس طرح تمام ملکوں کی سائنسی ترقی سے خبردار رہتے ہیں۔ خاص طور پر اسلامی ملکوں کے سائنس دانوں کی برین واشنگ کر کے تمام راز معلوم کر لیتے ہیں اور جب یہ سائنس دان اپنے ملکوں میں واپس بھیجے جاتے ہیں تو اپنے ملک کے لئے بیکار ہو چکے ہوتے ہیں..... غیر محسوس طور پر انشارجہ کے لئے کام کرتے ہیں..... ایک طرح سے وہ انشارجہ کے وفادار ہو کر لوٹتے ہیں۔

"اوہ..... اوہ!" کمرے میں موجود تمام لوگ دھک سے رہ گئے۔

"لیکن اس پیکٹ میں کیا ہے؟" صدر صاحب بولے۔

"ایک تو ان لوگوں کی گفتگو کا ریکارڈ اس میں موجود ہے..... دوسرے ایک اس سے بھی خوفناک اور اہم ترین چیز موجود ہے۔ اور میرا تعاقب دراصل اسی چیز کی وجہ سے ہی کیا گیا ہے۔ سائنس دانوں والی بات اگر دوسروں کو معلوم ہو جاتی ہے تو اس سے انہیں کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا..... وہ یہ معلومات حاصل کرنے کے اور ذرائع تلاش کر لیں گے..... لیکن جو دوسرا مسئلہ ہے..... اس کی راز داری ان کے لئے بہت ضروری ہے۔"

"آخر وہ معاملہ کیا ہے؟"

"میری خواہش ہے..... پہلے وہ راز صرف اور صرف آپ پڑھیں..... اس کے بعد پوری دنیا کے اسلامی ممالک کو بتا دیں کہ انشارجہ کیا کرتا ہے..... کیا کر رہا ہے؟"

"بہت خوب! جب پوری دنیا کو بتانا ٹھہرا تو یہاں موجود سب لوگوں کیوں نہ سن لیں۔" کمانڈر انچیف بولے۔

"نہیں! میں پروفیسر صاحب کی تجویز پسند کرتا ہوں..... پہلے صرف میں پڑھوں گا اور اس کے بعد اس سلسلے میں قدم اٹھایا جائے گا۔" صدر صاحب بولے۔

"جیسے آپ کی مرضی سر!" کمانڈر صاحب نے کہا۔

"تو پھر اب وہ پیکٹ میرے حوالے کر دیا جائے، میرے پاس وقت کم ہے ..... ابھی مجھے واپس انشارجہ جانا ہے ..... وہاں کچھ کام باقی ہے۔" ..... انہوں نے جلدی جلدی کہا۔

"ٹھیک ہے....."

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی..... ان کے کان کھڑے ہو گئے۔

"باہر کون ہے؟"

"سر..... انسپکٹر جمشید کو ان کی خفیہ فورس والے سونا گھاٹ سے لانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اور اب وہ دروازے پر موجود ہیں۔"

"اوہ اچھا..... ایک منٹ۔" یہ کہہ کر کمانڈر

صاحب دروازے کی طرف گئے اور دروازہ کھول دیا۔ انسپکٹر جمشید بجھے بجھے سے اندر داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے اکرام بھی تھا۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں بھئی سب معاملات ٹھیک ہو گئے ہیں ..... رابل اب ہمارے قبضے میں ہے۔ تمہیں بھی آزاد کرا لیا گیا ہے ..... ویسے یہ تمہاری خفیہ فورس خوب ہے۔"

"جی ہاں واقعی! لیکن سب معاملات ٹھیک کس طرح ہو گئے ..... کچھ مجھے بھی تو پتا چلے۔" انہوں نے حیرت زدہ آواز میں کہا۔

"صدر صاحب انشارجہ سے آ گئے ہیں ..... پروفیسر عمران جاہ کو رابل سے بچا لیا گیا ہے۔ اور اب ہم وہ راز صدر صاحب کے حوالے کر رہے ہیں ..... یہی مقصد تھا نا پروفیسر صاحب کا؟"

"ہاں! بالکل" انہوں نے کہا۔

"اس سے پہلے کہ وہ پیکٹ صدر صاحب کے حوالے کیا جائے۔ میں چاہتا ہوں ہم مسٹر رابل کا اصل چہرہ دیکھ لیں ..... مسٹر رابل جو اس وقت یہاں میرے میک اپ میں ہیں۔ جب میں سونا گھاٹ اکرام کو چھڑانے گیا تو ان لوگوں نے مجھے نیلی روشنی سے بے بس کر دیا ..... شاید وہ روشنی بہت زہریلی تھی ..... فوری طور پر میری جان نکلنے لگی تھی....."

"ہوں ..... ٹھیک ..... پھر رابل نے آپ کا میک اپ کیا اور اکرام کا میک اپ بھی اپنے کسی ماتحت پر کرایا ..... اور دونوں یہاں آ گئے۔ اس طرح یہ دونوں کس قدر آسانی سے اندر داخل ہو گئے، لیکن یہ نہیں جانتے تھے کہ محمود، فاروق اور فرزانہ سے پیکٹ حاصل کرنا آسان کام نہیں ہے ..... لیکن اب انہوں نے یہ بات جان لی ہے .....!!" کمانڈر صاحب نے جلدی جلدی کہا۔

"تو ٹھیک ہے ..... پہلے ہم رابل کا اصل چہرہ دیکھتے ہیں۔" پروفیسر بولے۔

"میرا خیال ہے ..... اس سارے کام میں وقت ضائع ہو گا ..... میں تو وہ پیکٹ لے کر چلتا ہوں ....." صدر صاحب نے فوراً کہا۔

"اس میں زیادہ دیر نہیں لگے گی سر ..... یہ کام میں کئے دیتا ہوں ..... مجھے اس کام کا تجربہ ہے۔" پروفیسر عمران جاہ نے آگے بڑھ کر کہا۔

"چلئے پھر ..... جلدی کیجئے۔" انہوں نے کہا۔

پروفیسر عمران جاہ آگے بڑھے ..... رابل کو پہلے ہی رسیوں سے جکڑ دیا گیا تھا۔ انہوں نے اس کے چہرہ کا جائزہ لیا ..... صرف تین منٹ تک جائزہ لیتے رہے ..... باقی لوگ بے چینی کے عالم میں کبھی ان کی طرف اور کبھی رابل کی طرف دیکھ رہے ..... کمرے میں موجود ہر شخص گویا رابل کا اصل چہرہ دیکھنے کے لئے بے چین ہو چکا تھا .....

"یہ میک اپ تو بہت ہی خاص قسم کا معلوم ہوتا ہے ..... مجھے چند سیال استعمال کرنے ہوں گے۔"

"ضرور کریں ..... آپ کو روکا کس نے ہے؟" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

پروفیسر عمران جاہ نے ایک بیگ میں سے چند چھوٹی چھوٹی بوتلیں نکالیں اور ان کے سیال باری باری روئی پر لگا کر رابل کے چہرے پر ملنے لگے۔

..... رابل لگا چیخنے۔

"مر گیا ..... یہ ..... یہ تو خالص تیزاب ہیں ..... پروفیسر کو اس ظلم سے روکا جائے۔"

"جی نہیں! یہ خالص تیزاب نہیں ہیں۔ اگر یہ خالص تیزاب ہیں تو پھر تو آپ کا پورا چہرہ جھلس جانا چاہئے لیکن ابھی سب لوگ دیکھیں گے ایسا نہیں ہو گا ..... آپ کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح چمکنے لگے گا؟" پروفیسر عمران جاہ نے شوخ لہجے میں کہا۔

"کیا کہا ..... چودھویں کے چاند کی طرح ..... پھر تو آپ ان لوشنوں سے بہت بڑا کاروبار کر سکتے ہیں۔ لڑکیاں تو اپنے چہرے چاند کی طرح روشن بنوانے کے لئے ٹوٹ پڑیں گی۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"خاموش! ہم ایسا کوئی کاروبار نہیں کریں گے۔" فرزانہ نے اسے گھورا۔

"یہ بات محمود کو کہنی چاہئے تھی۔"

"جی نہیں ..... مجھے اپنا یہی چہرہ پسند ہے۔" فرزانہ نے تلملا کر کہا۔

"یہ کیا باتیں شروع ہو گئیں!" صدر صاحب نے منہ بنایا۔

"جب تک رابل کے چہرے سے میک اپ نہیں اتر جاتا ..... اس وقت تک خاموش رہنے کا کیا فائدہ؟"

"بولنے سے خاموش رہنا زیادہ بہتر ہے۔" محمود نے فوراً کہا۔

"لیکن اگر کام کی بات کر لی جائے تو خاموش رہنے سے بہتر ہے۔"

"ارے باپ رے ..... مرا" رابل چلاّ پڑا۔

"کک ..... کون مرا .....!"

فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"خاموش! میں تم لوگوں کی بوٹیاں نوچ لوں گا۔" رابل گرجا۔

"اور آپ اپنا یہ شوق کب پورا کریں گے؟" فرزانہ نے پوچھا۔

"بہت جلد ..... تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ کس قدر جلد۔"

"تو آپ بتا دیں ..... ہم تو سوچ نہیں سکتے۔"

"ابھی ..... یہیں ..... بس تھوڑی دیر بعد۔" اس نے چیخ کر کہا۔

"شاید مسٹر رابل پاگل ہو گئے ہیں۔" صدر صاحب نے سرد آواز میں کہا اور اسے گھورا بھی .....

عین اس وقت سب نے دیکھا ..... رابل کے چہرے پر سے انسپکٹر جمشید کا میک اپ اتر رہا تھا ..... اب وہ حیرت زدہ سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

..... انسپکٹر جمشید کے ہاتھ بہت تیزی سے حرکت کر رہے تھے ..... اور پھر پورا میک اپ اتر گیا۔

"ارے ! یہ کیا؟" پروفیسر عمران جاہ نے چونک کر کہا۔

"کیا بات ہے ..... آپ نے خود ہی تو میک اپ اتارا ہے ..... اور خود ہی کہہ رہے ہیں ..... یہ کیا؟" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولے۔

"آخر بات کیا ہے پروفیسر صاحب؟" کمانڈر صاحب بے چین ہو گئے۔

"ہم نے یہاں آنے کے بعد اکرام کے ذریعے کچھ چیزیں منگوائی تھیں ..... ان چیزوں میں ایک تصویر بھی شامل ہے !؟" انہوں نے پراسرار انداز میں کہا۔

"تصویر ..... کس کی تصویر۔"

"مسٹر رابل کی تصویر۔"

"کیا کہا ..... رابل کی تصویر!!" سب ایک ساتھ بولے۔

"ہاں! رابل کی تصویر ..... میں ابھی آپ کو دکھاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ پھر اس بیگ کی طرف پلٹے ..... رابل اب بہت ڈھیلا ڈھیلا نظر آرہا تھا۔ پروفیسر صاحب نے بیگ میں سے ایک لفافہ نکالا۔ لفافے میں سے تصویر نکالی اور سب کو دکھاتے ہوئے کہا:

"یہ ہے رابل کی تصویر۔"

"ارے ..... یہ کیا؟" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"یہ ..... یہ تصویر تو مسٹر رابل کے چہرے سے بالکل مختلف ہے۔"

"ہاں! یہی تو میں آپ کو بتانا چاہتا تھا ....." انہوں نے کہا۔

"مطلب یہ کہ جو شخص یہاں انسپکٹر جمشید کے میک اپ میں موجود تھا ..... اور یہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ دراصل رابل ہے اور انسپکٹر جمشید کے میک اپ میں ہے ..... وہ اصل میں رابل نہیں ہے!!"

"ہاں! یہ رابل ہرگز نہیں ہے!!"

"اوہ ..... تو پھر رابل کہاں ہے؟ کیا رابل کا صرف ہوا کھڑا کیا گیا تھا؟؟" کمانڈر صاحب نے حیران ہو کر کہا۔

"ہوا کھڑا کیا گیا تھا یا رابل کو واقعی یہاں بھیجا گیا ہے ..... لیکن کم از کم یہ رابل نہیں ہے۔"

"حیرت ہے ..... لیکن اس ساری صورت حال سے ہمیں کیا فائدہ ہوا ....." کمانڈر صاحب بولے۔

"مطلب یہ کہ ہمیں اس خوش فہمی میں تو نہیں رہنا چاہئے کہ ہم رابل کو گرفتار کر چکے ہیں ..... وہ ابھی آزاد ہے اور کسی وقت بھی سامنے آسکتا ہے ..... کیا ان حالات میں وہ پیکٹ صدر صاحب کے حوالے کر دیا جائے ..... یا رابل کو پہلے گرفتار کیا جائے کیونکہ اس کا خطرہ زبردست خطرہ

ہے۔"

"یہ تو واقعی بہت سنگین صورت بن گئی....."

"کوئی ایسی سنگین نہیں پیکٹ مجھے دے دیں ..... میں سیدھا ایوان صدر جاکر اس کا مطالعہ کرتا ہوں ..... اور اس کے بعد قوم کے سامنے اس معاملے کو رکھتا ہوں ..... کیا خیال ہے؟" صدر صاحب نے جلدی جلدی کہا۔

"جب کہ میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ پہلے رابل کو گرفتار کر لیا جائے ....." پروفیسر بولے۔

"لیکن کیسے ..... ہم اسے کیسے گرفتار کر سکتے ہیں ..... جب کہ یہ تک معلوم نہیں وہ کہاں ہے؟" کمانڈر صاحب بولے۔

"میرا خیال ہے ..... سب لوگ اطمینان سے بیٹھ جائیں اور اس مسئلہ پر غور کریں۔" پروفیسر عمران جاہ بولے۔

"ٹھیک ہے ..... یہ اچھی تجویز ہے۔" صدر صاحب بولے۔

سب بیٹھ گئے اور سوچ میں ڈوب گئے ..... کئی منٹ اسی عالم میں گزر گئے آخر پروفیسر عمران جاہ نے کہا۔

"اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ پیکٹ کو کھول کر اس راز کو یہیں پڑھ لیا جائے۔"

"اس سے کیا ہو گا؟"

صدر صاحب بولے۔

"راز ہم سب جان لیں گے۔"

"ہماری باتوں کو کون مانے گا ..... اصل چیز وہ ثبوت ہے اور اس ثبوت کے ساتھ آپ کو ٹی وی کے ذریعے پوری دنیا کو خبردار کرنا ہے ....." انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"ہوں! اور رابل کا خطرہ ہمارے سر پر موجود ہے۔ ایسا نہ ہو ..... وہ اچانک آجائے اور پیکٹ لے اڑے۔"

"وہ کس طرح آسکتا ہے ..... اس قدر زبردست ملٹری کے پہرے کے باوجود۔" صدر

صاحب بولے۔

"بالکل اس طرح ..... جس طرح نقلی رابل یہاں آگیا۔"

"یہ تو انسپکٹر جمشید کے میک اپ میں یہاں آگیا تھا۔" انہوں نے کہا۔

"جی ہاں! اس طرح وہ کسی اور کے میک اپ میں یہاں آسکتا ہے۔"

"تو ہم باہر موجود میجر جنرل شبیر سے کہہ دیتے ہیں۔ اب چاہے کوئی بھی آجائے ..... وہ اندر نہ آنے پائے۔"

"میرے خیال میں باہر موجود فوج رابل کو اندر آنے سے نہیں روک سکتی۔" پروفیسر بولے۔

"اور میں کہتا ہوں ..... رابل کا صرف ہوّا کھڑا کیا گیا تھا دراصل رابل یہاں ہے ہی نہیں۔"

صدر صاحب بولے۔

"جی نہیں ..... یہ بات نہیں ہے۔" پروفیسر عمران جاہ بولے۔

"تو پھر کیا بات ہے؟"

"میرے پاس اس بات کا ثبوت موجود ہے ..... کہ رابل ہمارے ملک میں موجود ہے۔"

"نن ..... نن نہیں!" صدر صاحب نے خوف زدہ آواز میں کہا۔

"بلکہ رابل یہاں ..... اس عمارت میں آچکا ہے۔"

"کیا!!!" وہ چلّا اٹھے۔

(پھر کیا ہوا۔ آئندہ شمارے میں پڑھیے)

بچوں کے مشہور و معروف مصنف

اشتیاق احمد

کے سنسنی خیز، ہنگامہ آرا، مزاح اور جاسوسی سے بھرپور ناول

۵۶۲	جرم کی آواز	انسپکٹر جمشید سیریز	۱۰ روپے
۵۶۳	جرم کی موت	〃	〃 ۱۰ 〃
۵۶۴	چوری کا ہنگامہ	〃	〃 ۱۰ 〃
۵۶۵	دعوت کا بھوت	〃	〃 ۱۰ 〃
۳۵	سوٹ کیس کا سفر	〃	〃 ۱۰ 〃
۳۶	دوہری چال	〃	〃 ۱۰ 〃
۱۳	گم شدہ جسم	انسپکٹر کامران مرزا سیریز	۱۰ 〃
۱۴	گونگا پیغام	شوکی سیریز	〃 ۱۰ 〃

۲۰ فروری ۱۹۹۴ء

کوآپ کے شہر میں ہر بڑے بکسٹال پر دستیاب

یا

پھر براہِ راست خط لکھ کر ادارے سے بذریعہ وی پی منگوائیں

اشتیاق پبلی کیشنز

۹/۱۲ نصیر آباد، مسلم پورہ، سانده کلاں

لاهور، — فون ۳۲۱۵۳۷

شرارت ہو ایسی نہ ہو جس میں شر

محمد علی انصاری

شرارت ہے بچپن کا جزِ لازمی
ہے اس کے بِنا بے مزا زندگی

شرارت ہو ایسی نہ ہو جس میں شر
نہیں تو پڑے گا بُرا ہی اثر

اٹھاؤ گے تم اس سے نقصان بھی
کہیں گے سبھی تم کو حیوان بھی

شرارت ہو ایسی کہ دل جیت لے
نہ جس سے کسی کو کوئی غم ملے

نہ آنے دو پاس اپنے شیطان کو
نہ باتوں پہ اس کی دھرو کان کو

ملے گا جو موقع وہ بہکائے گا
شرارت پہ فوراً وہ اُکسائے گا

جو تم اس کے بہکائے میں آؤ گے
بری صحبتوں میں یوں پڑ جاؤ گے

نہ اچھے بُرے کی کرو گے تمیز
بُرائی کو رکھو گے دل سے عزیز

حقارت سے دیکھیں گے تم کو سبھی
نہ تم پاسکو گے محبت کبھی

لہٰذا گناہوں سے بچتے رہو
جو ہو نیک راہ اس پہ چلتے رہو

کرنے چلے شرارت

عثمان بن سلیم

"کس کا خط ہے امی جان؟" زبیر نے اپنی امی کے ہاتھ میں خط دیکھ کر پوچھا۔ "بیٹا! تمہارے ماموں جان کا خط آیا ہے کینیڈا سے۔ کل شام کی فلائٹ سے وہ کراچی پہنچ رہے ہیں۔" "کیا سچ امی؟" زبیر خوشی سے تقریباً چیخ پڑا۔ "ہاں بھئی! کل تمہارے سعید ماموں واقعی آرہے ہیں۔" امی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "پھر تو بہت مزا آئے گا۔ میں ابھی عرفان کو خبر کرتا ہوں۔" زبیر خوشی سے بولا۔ اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کی امی صرف مسکرا کر رہ گئیں۔

زبیر اور عرفان دونوں خالہ زاد بھائی تھے۔ دونوں میں بہت محبت اور گہری دوستی تھی۔ دونوں ساتویں کلاس کے طالب علم تھے۔ لیکن گھر الگ الگ محلے میں ہونے کے باعث دونوں کے اسکول بھی الگ تھے۔ اکثر جمعرات کو عرفان زبیر کے یہاں آجایا کرتا تھا اور رات وہیں سوتا تھا۔ اسی طرح کبھی زبیر عرفان کے یہاں چلا جایا کرتا تھا۔ ان دنوں چونکہ دونوں کے اسکول کی چھٹیاں تھیں۔ اس لئے

عرفان چند دنوں کے لئے زبیر کے یہاں آیا ہوا تھا۔

سعید ماموں سے دونوں ہی بے حد محبت کرتے تھے۔ خود سعید ماموں نے انہیں کبھی اپنے بڑے ہونے کا احساس نہیں دلایا تھا۔

وہ ہمیشہ ان کے ساتھ دوستوں جیسا رویہ رکھتے تھے۔ زبیر اور عرفان بھی ان سے بالکل فری تھے۔ وہ اکثر ماموں کے ساتھ شرارت بھی کر لیا کرتے تھے۔ لیکن ماموں نے کبھی برا نہیں مانا تھا۔ انہیں سعید ماموں کی کمزوری بھی پتہ تھی کہ ماموں ذرا ڈرپوک ہیں۔ لیکن اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا موقع کبھی نہ ملا تھا۔ پچھلے چند ماہ سے سعید صاحب کاروباری سلسلے میں ملک سے باہر گئے ہوئے تھے۔ اب بھی وہ صرف چند روز کے لئے آرہے تھے۔ لیکن عرفان اور زبیر اس پر بھی خوش تھے۔

ماموں سعید کو ائرپورٹ لینے کے لئے سب ہی جارہے تھے لیکن عرفان کی امی اور ابو کسی وجہ سے نہیں جا سکے تھے۔ البتہ اس کا چھوٹا بھائی ضرور ساتھ گیا تھا۔ رات کو عرفان کی امی اپنے بھائی سے ملنے آئیں۔

ماموں کے آنے پر سب بچے خوش تھے۔ لیکن جتنی خوشی عرفان اور زبیر کو ہوئی تھی اتنی کسی اور کو نہیں ہوئی تھی۔ دو ایک روز اسی طرح گزر گئے۔ عرفان اور زبیر نے سعید صاحب سے ڈھیروں باتیں کیں۔

ایک روز عرفان اور زبیر ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ "یار! میرا تو شرارت کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔" عرفان کہنے لگا۔

"سعید ماموں کے ساتھ؟" زبیر نے پوچھا۔

"ہاں تو اور کیا۔ ویسے ہی ماموں اتنے عرصے بعد تو آئے ہیں اور ہم نے اب تک ان کے ساتھ کوئی شرارت نہیں کی۔"

عرفان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو پھر کچھ سوچا تم نے؟"

"ہاں آئیڈیا ہے میرے ذہن میں ایک۔" عرفان نے کہا۔

"تو بتاؤ نا!"

زبیر نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

عرفان نے ایک لمحے کے لئے کچھ سوچا پھر بولا۔ "آج جب رات کو ماموں جان سونے کے لئے اپنے کمرے میں چلے جائیں اور جب سب گھر والے گہری نیند سو چکے ہوں گے تو ہم دونوں ماموں جان کے کمرے میں جائیں گے۔"

"..... ہیں! ..... یہ کیا بیوقوفانہ آئیڈیا ہے؟" زبیر نے اس کی بات کاٹ کر برا سا منہ بنایا۔

"ارے یار! میری بات تو پوری سن لو۔" عرفان بولا۔

"وہ جو تمہارے پاس پٹاخے والی پستول نہیں ہے۔ جو دیکھنے میں بالکل اصلی معلوم ہوتی ہے۔ ہم وہ پستول لے کر نقاب پہن کر ڈاکو بن کر ماموں

کے پاس جائیں گے۔ بس ذرا انہیں ڈرائیں گے۔ تھوڑی سی تفریح لیں گے پھر ہم ماموں کے سامنے اپنی نقاب اتار پھینکیں گے۔"

"واقعی یار! آئیڈیا تو شاندار ہے۔" زبیر نے اسے داد دی۔

اسی لمحے سعید ماموں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ ماموں کو دیکھ کر وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ دونوں کے چہروں پر شرارتی مسکراہٹ تھی۔

"کیا ہو رہا ہے بھئی؟" سعید ماموں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کیرم کھیلنے کا پروگرام ہے ماموں۔ ایک بازی ہو جائے۔" زبیر نے جواب دیا۔

"بھئی! میں تو خود یہی کہنے والا تھا۔" سعید ماموں بولے اور پھر وہ کیرم کھیلنے لگے۔

رات کے تقریباً ساڑھے بارہ بجے کا عمل ہو گا۔ سب گھر والے گہری نیند سو چکے تھے۔ لیکن زبیر اور عرفان ابھی تک جاگ رہے تھے۔ پروگرام کے مطابق وہ دونوں بالکل تیار تھے۔ پھر انہوں نے آہستگی سے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور ماموں کے کمرے کی جانب طرف آئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر زبیر نے آگے بڑھ کر نہایت آہستگی سے ماموں کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ اور ..... پھر دونوں اندر داخل ہو گئے۔ کمرے میں زیرو پاور کا بلب روشن تھا۔ پستول زبیر کے ہاتھ میں تھا۔ اور دونوں نے اپنے چہروں پر سیاہ نقاب پہن رکھے تھے۔ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بیڈ کے قریب آئے تاکہ ماموں کو اٹھا سکیں۔ اگلے ہی لمحے دونوں ٹھٹھک کر رک گئے۔ عرفان کے منہ سے ایک چیخ بلند ہوئی۔

سعید ماموں بستر پر بے سدھ پڑے تھے۔ ان کے سینے سے لال لال خون بہہ کر ادھر ادھر جم چکا تھا۔ ان کے قریب ہی پستول پڑا تھا۔ ماموں کو اس حالت میں دیکھ کر دونوں کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ زبیر کے ہاتھ سے پستول وہیں گر گیا۔ دونوں نے نقاب بھی اتار پھینکے اور گھبرا کر دروازے کی طرف لپکے لیکن آتے ہوئے..... ابو سے ٹکرا گئے۔ "کیا ہوا..... یہ چیخ کس کی تھی؟" انہوں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"وہ..... ابو..... سعید ماموں..... !!" زبیر کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

"کیا ہوا انہیں؟"

"وہ خالو..... سعید ماموں کے سینے سے خون بہہ رہا لگتا ہے..... کسی نے ان پر گولی چلائی ہے، ان کے قریب پستول بھی پڑا ہے۔" عرفان نے ڈرتے ڈرتے بتایا۔

"زبیر کے ابو تیزی سے کمرے میں داخل ہو گئے۔ اتنے میں زبیر کی امی بھی آگئیں۔ وہ بھی گھبرائی ہوئی تھیں۔ "کیا ہوا؟ اللہ خیر کرے۔" انہوں نے ماموں کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ اور اگلے ہی لمحے وہ بھی دھک سے رہ گئیں۔ "یہ سب کیسے ہوا؟" انہوں نے روتے ہوئے چیخ کر کہا۔ اب عرفان اور زبیر بھی اندر آچکے تھے

شرارت نمبر کے لئے ایک چٹکلہ

چور کی ڈاڑھی میں سونا

چور کی ڈاڑھی میں تنکا، یہ محاورہ آپ نے سنا ہو گا لیکن چور کی ڈاڑھی میں سونا کا مشاہدہ مدراس کے ہوائی اڈے کے کسٹم افسران نے اس وقت کیا جب ایک سردار جی اندر داخل ہوئے۔ ان کی لمبی اور بڑی ڈاڑھی بڑے قرینے سے سجی ہوئی تھی۔ یا یوں کہئے کہ سجائی گئی تھی۔ کسٹم کے افسران کو شک گزرا اور انہوں نے اس کی ڈاڑھی کی تلاشی لی تو ایک لاکھ مالیت کا سونا اور تین لاکھ کے ہندوستانی نوٹ برآمد ہوئے۔ اور یوں سردار جی کو گرفتار کر لیا گیا۔

(عابد انور۔ کراچی)

اور سر جھکائے کھڑے تھے جیسے عدالت کے کٹہرے میں مجرم کھڑے ہوتے ہیں۔

"تم دونوں یہاں کیا کرنے آئے تھے؟" زبیر کے ابو نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"وہ ابو ہم تو ماموں کے پاس ویسے ہی آئے تھے۔" زبیر نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ اس پر کپکپی سی طاری تھی۔ عرفان کی حالت بھی اس سے مختلف نہ تھی۔

"آپ ڈاکٹر کو بلائیں۔" اچانک زبیر کی امی بول پڑیں۔

"ڈاکٹر کو بلانے کی کوئی ضرورت نہیں آپا جان ....." اچانک سعید ماموں کی آواز ابھری۔ سب نے گھوم کر بیڈ کی طرف دیکھا۔ وہ بیڈ پر بیٹھے مسکرا رہے تھے۔

"کک ..... کیا مطلب ہے؟" امی سمیت زبیر اور عرفان بھی حیران رہ گئے۔ جب کہ زبیر کے ابو کے چہرے پر بھی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ جیسے انہیں سب کچھ پتہ ہو۔

"بھئی! بات دراصل یہ ہے کہ آج میرے بھانجوں نے میرے ساتھ شرارت کا پروگرام بنایا کہ یہ ڈاکو بن کر مجھ کو ڈرائیں گے۔ اب یہ آپ ان کی بدقسمتی کہئے کہ جب یہ ڈرائنگ میں بیٹھے پروگرام بنا رہے تھے تو.... اتفاق سے میں ادھر آنکلا اور میں نے ان کی تمام باتیں سن لیں۔ میں نے سوچا کیوں نہ میں بھی ان کے ساتھ شرارت کروں اور ان کی شرارت کا جواب شرارت سے دوں۔ اس کے لئے مجھے تھوڑے سے سرخ پانی کی اور ایک نقلی پستول کی ضرورت پڑی۔

ماموں نے بستر پر پڑے پستول کی طرف اشارہ کیا جو زبیر کے پستول کی طرح بالکل اصلی معلوم ہو رہا تھا..... "کیوں بھئی کیسی رہی؟" سعید ماموں نے مسکرا کر عرفان اور زبیر کی طرف دیکھا۔ دونوں کھسیانے ہو کر مسکرا دیئے۔ جب کہ زبیر کی امی بے چاری ابھی تک حیران کھڑی تھیں۔

میانداد کے بچپن کے دلچسپ شرارتی واقعات

مجھے یاد ہے وہ ذرا ذرا

جاوید میانداد کی شرارتوں کی کہانی خود ان کی زبانی

محمد عرفان احمد

بچپن کا دور بڑا معصوم، بھولا بھالا اور بے ضرر ہوتا ہے۔ ہر بچہ ایک پھول کی طرح نرم نازک اور خوبصورت لگتا ہے اگر اسے اچھا ماحول، اچھی فضا اور اچھی تعلیم و تربیت ملے تو وہ مستقبل کا ایک کامیاب و کامران انسان بنتا ہے۔

آج جب میں اس مقام پر پہنچ کر اپنے بچپن کی سرسبز و شاداب وادی پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے ایک بڑا ہی شریر، اور نٹ کھٹ لڑکا نظر آتا ہے۔ ہر وقت ہنستا اور مسکراتا ہوا۔ شوخی اور شرارت جس کی رگ رگ میں موجود ہے۔ اس کا سب سے محبوب مشغلہ خود ہنسنا اور دوسروں کو ہنسانا ہے۔ چھیڑ چھاڑ اس کی فطرت میں شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے خالی بیٹھا نہیں جاتا۔ اسے ابھی حرکت میں برکت کا صحیح مفہوم معلوم نہیں۔ اس کے باوجود وہ ہر وقت حرکت میں رہتا ہے۔ کھیلنا کودنا، پڑھنا لکھنا، شرارتیں کرنا، دوسروں کے کام آنا، جو کچھ وہ کر سکتا ہے، کرتا رہتا ہے، ست اور کاہل بچے اسے ایک دم پسند نہیں، جو خواہ مخواہ کہیں پڑے رہتے ہیں۔ کوئی کام نہیں کرتے، اپنے بڑوں کا کہنا نہیں مانتے، اسکول جانے سے بھاگتے ہیں، ہوم ورک کرنے سے جی چراتے ہیں، کیونکہ اس نے خود کبھی ایسا نہیں کیا۔ وہ تو کھیل کے میدان میں بھی اور پڑھنے لکھنے میں بھی سب سے آگے ہے۔

آپ سمجھ گئے ہوں گے یہ چست اور چاق و چوبند لڑکا کون ہے۔ یہ ننھا جاوید ہے..... سانولا سلونا رنگ، مسکراتی آنکھیں، ہنستے لب، چہرے پر ذہانت کی روشنی، رگ و پے میں جیسے بجلیاں بھری ہوں، یہ ہے میرے بچپن کی تصویر اور میرے بچپن کا روپ۔

اف میرے خدا! میں کتنا شوخ و چنچل تھا؟ خالی بیٹھنا تو میرے لئے سب سے دشوار کام تھا۔ میں شرارتیں ضرور کیا کرتا تھا۔ مگر اس بات کا بھی خیال رکھتا تھا کہ میری شرارت سے، کسی کو کوئی

جاوید اپنے والد میاں داد کے ساتھ۔

تکلیف نہ پہنچے، کسی کو دکھ نہ ہو۔ اس موقع پر میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں گھر میں سب سے لاڈلا تھا۔ اور کبھی بھی کوئی مجھے مارتا نہیں تھا۔ نہ امی نہ ابّو نہ بھائی اور نہ بہنیں۔ میں سب کو پیارا تھا۔ سب مجھ سے محبت کرتے تھے۔ مگر ایک دفعہ ایسا بھی ہوا جب میری زبردست "دھنائی" ہوئی۔

ہوا یوں کہ ایک دن گھر کے تمام بچے چھت پر سونے کے لئے گئے تو نہ جانے کس طرح ایک رضائی ہمارے چھجے پر جا گری۔ میری بہن بولیں۔ "جاوید! یہ رضائی لا دو گے؟" ہر حکم پر سر تسلیم خم کرنا میری عادت تھی لہٰذا فوراً اٹھ کر بولا۔ "ابھی لے کر آیا۔" آؤ دیکھا نہ تاؤ وہیں سے چھجے پر چھلانگ لگا دی۔ چھجا پرانا ہو گیا تھا۔ مگر اس کے بارے میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ اتنا کمزور ہو گا کہ میرا بوجھ برداشت نہیں کر پائے گا۔ اور "اڑاڑا دھم" کی آواز کے ساتھ پڑوس کی گیلری میں جا گرے گا۔ جی ہاں اس کے ساتھ ہی میں بھی گیلری میں موجود تھا۔ چونکہ اس میں رضائی پڑی ہوئی تھی اور رضائی پر میں برا جمان تھا اس لئے مجھے کوئی خاص چوٹ نہیں آئی۔ مگر چھت پر موجود سب لوگ گھبرا گئے اور "اللہ خیر" کی ڈری ڈری اور سہمی سہمی آوازوں کے ساتھ اوپر سے جھانکنے لگے۔ امی جان اس وقت نماز پڑھ رہی تھیں اور ابو سو رہے تھے۔ میں نے پڑوس کی گیلری میں رضائی میں دبکے دبکے سوچا یہ تو گڑبڑ ہو گئی۔ اب تو میری خیریت نہیں۔ اور جب میں پڑوس کے گھر سے اپنے گھر پہنچا تو امی نماز سے فارغ ہو کر میرا "استقبال" کرنے کو موجود تھیں۔

پھر جو ان کے ہاتھوں نے کارنامہ انجام دیا، مت پوچھیں، مجھے وہ پٹائی آج تک یاد ہے۔

"کم بخت! اگر تیرا ہاتھ پیر ٹوٹ جاتا تو....."

اور پھر دھما دھم ..... وہ بے تحاشہ مارتی جا رہی تھیں۔ اور میں حیران و پریشان ان سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ..... "امی! جب میرا ہاتھ، پیر ٹوٹا نہیں ہے تو پھر آپ انہیں کیوں توڑ رہی ہیں؟"

امی کے پٹائی کرنے اور چیخ و پکار سے ابو جاگ گئے۔ فوراً اوپر آئے اور مجھے امی کے "چنگل"

سے نجات دلائی۔ جب انہیں اصل واقعہ کا علم ہوا تو مجھے سمجھایا کہ اس طرح بغیر سوچے سمجھے چھلانگ نہیں لگانی چاہئے۔

آج بھی میں گراؤنڈ میں ہنستا ہنساتا رہتا ہوں۔ لوگ جہاں میرے کھیل سے محظوظ ہوتے ہیں وہیں میری شوخی و شرارت سے لطف بھی اٹھاتے ہیں۔ بچپن اور لڑکپن میں بھی میں اس عادت سے باز نہیں آتا تھا۔ کبھی بہنوں کو ستاتا، کبھی بھائیوں کو پریشان کرتا، کبھی امی سے شوخیاں کرتا۔ اگر کبھی امی مجھے اپنا پاؤں دبانے کو کہتیں تو میں بخوشی رضامند ہو جاتا۔ مگر اس شرط پر کہ خود میرے پیروں میں بھی بڑا درد ہے۔ دن بھر کھیل کر۔ اگر کوئی میرے پیر دبا دے (اپنی بہنوں کی جانب دیکھتے ہوئے) تو میں آپ کے پیر دبا دوں گا۔ میری بہنیں میری طبیعت سے واقف تھیں وہ غصہ تو ہوتیں۔ مگر میرے پیر دبا دیتیں۔ شرارتیں کئے بغیر مجھے چین نہیں آتا تھا۔ ایک مرتبہ پڑوس میں شادی تھی۔ بارات بس میں روانہ ہوئی تو میں ایک فقیر کا میک اپ کر کے اس بس میں چڑھ گیا۔ وہاں لڑکے اور لڑکیاں شوخ اور بھڑک دار لباسوں میں ملبوس تھے۔ مجھ جیسے "فقیر" کو دیکھ کر پہلے تو انہوں نے ناک بھوں کو چڑھایا اور پھر مجھے بس سے نکالنے کے لئے شور مچانے لگے۔ مگر میں فقیر تھا کچھ اور ہی طرح کا۔ گڑگڑا کر میں نے ان کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا۔ "بابا! اللہ کے نام پر۔ مجھ غریب کا بھی ذرا خیال کرو اللہ کے بندو!۔ مجھ بھوکے کو روٹی کے لئے ایک روپیہ دے دو۔ اللہ تمہارے ہاتھ بھی پیلے کرے۔ تمہارے سروں پر بھی سہرا سجے۔" بس میں سب ہی اڑوسی پڑوسی تھے۔ اور سب ہی مجھے اچھی طرح جانتے تھے مگر یہ کسی کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ فقیر کے بھیس میں میں ہوں گا۔ لہٰذا مجھ سے جان چھڑانے کے لئے لڑکیوں نے دھڑا دھڑ پرس کھولے اور میرے ہاتھ پر روپیہ دو روپے رکھنا شروع کر دیئے۔

بعد میں میں بس سے اتر گیا۔ اور نہا دھو کر جب دلہن کے گھر گیا اور دوستوں اور رشتہ دار لڑکیوں نے میری جیب میں خاصے نوٹ دیکھے تو بولے۔ "بڑے ٹھاٹھ ہیں۔ یہ اتنے روپے کہاں سے آئے؟" تب میں نے منہ ٹیڑھا کر کے اسی بس والے فقیر کی آواز نکالتے ہوئے کہا۔

"یہ سب اللہ کا کرم ہے بابا۔"

اس پر لڑکیوں نے دانتوں میں انگلی دبا کے کہا۔

"ہائے اللہ! وہ آپ تھے جاوید بھائی!"

ویسے شادیوں میں باراتیوں کی بس میں بس کنڈکٹر کے فرائض تو میں اکثر ہی انجام دیا کرتا تھا۔ دروازے پر کھڑا ہو کر آوازیں لگاتا ..... اور راہ گیروں کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیتا:۔

"لالو کھیت، لالو کھیت ..... صدر، ٹاور، ٹاور ....."

راستہ چلتے راہ گیر یہی سمجھتے کہ یہ روٹ نمبر ۶ کی بس ہے۔ لہٰذا لپک لپک کر اس پر چڑھنے کی کوشش کرتے۔ مگر جب پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے تو

باراتی عورتوں اور بچوں کو بیٹھا دیکھتے۔ اور کھسیانی ہنسی ہنس کر اتر جاتے۔

آج بھی جہاں کہیں مجھے موقع ملتا ہے میں شرارتیں کرتا رہتا ہوں۔ ٹیم کی کپتانی کرنا ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ مگر مجھے یہ کپتانی محض اس وجہ سے اچھی نہیں لگتی کہ کپتانی کرتے وقت مجھے سنجیدہ رہنا پڑتا ہے، اور سنجیدہ رہنا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میرے لئے کتنی تکلیف دہ بات ہے۔

میرے والد صاحب یوں تو بڑے سنجیدہ اور متین آدمی تھے مگر انہیں کبھی میری شوخی و شرارت سے کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ وہ ہنسنے ہنسانے کو برا نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شرارتیں اگر اخلاق کے دائرے میں ہوں اور ان سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے تو یہ صحت، تندرستی اور ذہانت کی پہچان ہوتی ہے۔

میں نے حتی الامکان کوشش کی کہ اپنے ابو کے بتائے ہوئے راستہ پر چلوں۔ ان کا ہر حکم مانوں۔ ان کا نام روشن کروں۔ ان کا سایہ سلامت تھا تو اس وقت بھی میں ان کی خواہشوں کا احترام کرتا تھا اور اب جب وہ ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں تب بھی میں اپنے کھیل میں شوخیوں، شرارتوں کے ساتھ ساتھ کامیابی حاصل کر کے ان کے خوابوں کو تعبیر دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

توبہ توبہ — آپ آئندہ چل کر کیا کریں گے۔ اتنی معمولی سی بات آپ کی سمجھ میں نہیں آرہی — چلئے صفحہ ۲۰۰ پر ڈھونڈیئے۔

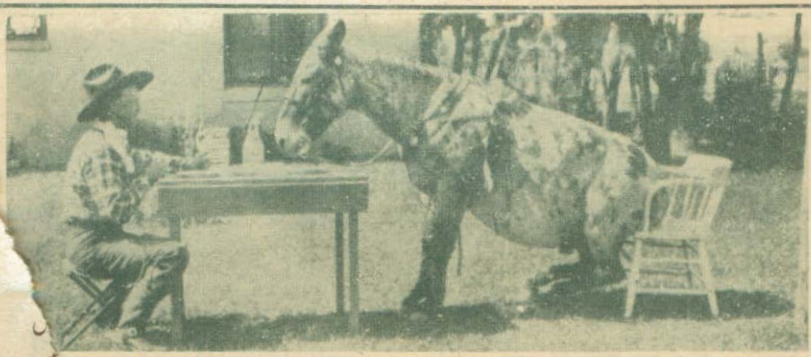

"آآآں ہاں۔ ٹھیک ہے۔ اب بتایئے ٹھنڈا چلے گا یا گرم!"

ہنستے ہنستے

ایک صاحب جنہیں شیخیاں بگھارنے کی بڑی عادت تھی، دعوت پر گئے۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد حسبِ عادت کہنے لگے۔

"ہمارا خاندان بہت پرانا ہے۔ بابر سے لے کر اب تک کا پورا شجرہ محفوظ ہے، پھر انہوں نے میزبان سے پوچھا۔

"آپ کا خاندان کتنا پرانا ہے؟"

میزبان بے حد شریر تھے۔ مسکرا کر بولے۔

"کہہ نہیں سکتا کیوں کہ ہمارے خاندان کا سارا ریکارڈ طوفانِ نوح میں بہہ گیا تھا۔"

مرسلہ:۔ طارق حسین اعوان، بھکر۔

ایک صاحب بس میں اپنے بچے کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ کنڈیکٹر نے بچے کا ٹکٹ مانگا تو صاحب نے کہا "اس کی عمر چار سال ہے اِس کا ٹکٹ نہیں ہو گا۔"

کنڈیکٹر نے بچے کا غور سے جائزہ لیا پھر بچے سے پوچھا "بیٹے! آپ کی عمر کتنی ہے؟"

"چار سال۔" بچے نے بتایا۔

"اور آپ پانچ سال کے کب ہوں گے؟"

"اس بس سے اترنے کے بعد۔"

بچے نے شرارت سے جواب دیا۔

مرسلہ ...... اطہر اقبال صدیقی، کراچی۔

ایک دوا فروش ہجوم میں اپنی دوا کی بڑی تعریف کر رہا تھا اس نے کہا۔ "حضرات! میں یہ دوا بیس سال سے فروخت کر رہا ہوں لیکن یقین کریں آج تک کسی نے نہیں کہا کہ دوا میں خرابی ہے۔"

ہجوم میں سے کسی شریر لڑکے نے آواز لگائی۔

"ظاہر ہے مُردے تو شکایت کرنے سے رہے۔"

مرسلہ ...... محمد علی، گوجرانوالہ کینٹ۔

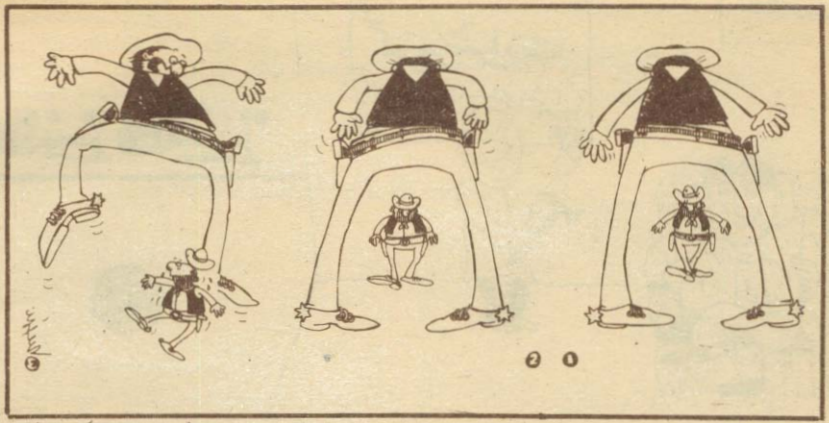

استاد: (شاگرد سے) "تم ہمیشہ دیر سے کیوں آتے ہو؟"

شاگرد: "جناب میں دیر سے نہیں آتا یہ بس ہی دیر سے آتی ہے۔"

استاد: "اچھا! اگر بس کل بھی دیر سے آئے تو اس سے پہلے آنے والی بس سے آ جانا۔"

مرسلہ..... فہد احمد شجراہ، کنڈھ کوٹ۔

"اس پر کیا الزام ہے؟" جج نے قیدی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"اغوا، جناب عالی!" وکیل نے مطلع کیا۔

"یہ جھوٹ ہے جناب عالی!" ملزم نے احتجاج کیا "میں تو صرف کوٹ چراتا ہوں۔"

"تو پھر یہ سمجھ لیں کے اس مرتبہ آپ کوٹ میں سے آدمی کو نکالنا بھول گئے تھے۔" مخالف وکیل اطمینان سے بولے۔

مرسلہ..... عفیفہ اطہر، حیدر آباد

محکمۂ تعلیم کے ایک آفیسر نرسری اسکول کے معائنے کے لئے گئے بچوں کو تعلیم دی بھی جا رہی ہے کہ نہیں وہ ایک کلاس میں گئے اور بچوں کا امتحان لینے کی غرض سے بولے "آپ میں سے کوئی بچہ مجھے ایک عدد بتائے میں اسے تختہ سیاہ پر لکھتا ہوں۔" ایک بچے نے ۳۵ کہا۔ آفیسر نے بلیک بورڈ پر اسے ۵۳ یعنی الٹا کر کے لکھ دیا کہ کوئی بچہ غلطی پکڑتا ہے یا نہیں۔ لیکن کلاس میں خاموشی رہی۔ آفیسر نے کہا "اچھا آپ کوئی اور عدد بتائیں۔" پیچھے سے آواز آئی۔ "جناب ۴۸۔" آفیسر نے پھر اسے الٹا کر کے ۸۴ لکھ دیا اور کلاس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے لیکن کلاس میں خاموشی رہی۔ اتنے میں ایک لڑکا بولا "جناب آپ ۲۲ لکھیں۔"

اس پر کلاس میں ایک زور دار قہقہہ پڑا اور آفیسر بچے کی اس شرارت پر جھینپ کر رہ گئے۔

مرسلہ..... محمد یوسف، ملتان

کیا آپ ایک پیالی پٹرول دے سکتے ہیں۔

ایک سردار صاحب درخت کی چھاؤں میں لیٹے آرام کر رہے تھے کہ وہاں سے ان کے ایک انگریز دوست گزرے اور انہیں اس حالت میں دیکھ کر بولے "اوہ! آر یو ریلیکسنگ" (RELA-XING) یعنی کیا آپ آرام کر رہے ہیں؟ سردار صاحب جھٹ سے گویا ہوئے۔

"نو نو! آئی ایم ناٹ ریلیکسنگ آئی ایم کرنیل سنگھ" (نہیں نہیں! میں ریلیکسنگ نہیں کرنیل سنگھ ہوں۔)

مرسلہ: محمد طیب یزدانی، لاہور۔

ایک شریر لڑکے کو فون پر رانگ نمبر ملانے کی عادت پڑ گئی۔ ایک دن اس نے فون گھمایا جو ایک جنرل اسٹور سے مل گیا۔ شریر لڑکے نے دکان کے مالک سے پوچھا۔

"شکر ہوگی آپ کے پاس؟"

"ہاں ہے"۔ دکان دار نے کہا۔

"سوجی؟"

"ہاں! وہ بھی ہے۔"

"گھی ہے؟"

"ہاں! وہ بھی ہے۔"

"تو پھر آپ حلوہ کیوں نہیں بنا لیتے۔"

شریر لڑکے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

مرسلہ..... دانش صدیق، کراچی۔

ایک شریر لڑکا ہانپتا ہوا ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں داخل ہوا اور سیلز مین سے کہا۔

"میرے دوست کے پیچھے ایک بھینس لگی ہوئی ہے آپ میری مدد کریں۔" سیلز مین نے حیرت سے کہا۔

"لیکن میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"شریر لڑکا بولا "بس آپ جلدی سے میرے کیمرے میں ریل ڈال دیں۔"

مرسلہ..... جویریہ قیوم، جوہر آباد۔

دو پہلوانوں کے درمیان ریسلنگ کا بڑا زبردست مقابلہ ہو رہا تھا۔ اچانک ریفری چیخ پڑا۔

"ٹانگ مروڑنی بند کرو۔"

"نہیں آج میں اسے توڑ کر ہی دم لوں گا۔" پہلوان نے غصے سے پھنکارتے ہوئے کہا۔

"بے وقوف! یہ تمہاری اپنی ٹانگ ہے۔" ریفری نے جواب دیا۔

مرسلہ: عاطف سعید، اسلام آباد۔

مجید لاہوری ایک عظیم شاعر اور دلچسپ انسان ہیں۔ ایک بار وہ ایک مشاعرے میں بیٹھے شعرا پر

پھبتی کس رہے تھے کہ ایک کہنہ مشق بزرگ شاعر کی باری آئی۔ مشاعرے میں بات کیا کیا، رات کیا کیا کی زمین پر اشعار پڑھے جا رہے تھے۔

بزرگ شاعر نے پہلا مصرع پڑھا:

یہ دل ہے، یہ جگر ہے، یہ کلیجہ

مجید لاہوری نے بے ساختہ شعر اس طرح مکمل کر دیا

قصائی دے گیا سوغات کیا کیا

یہ سن کر مشاعرے کے سارے شرکا ہنسنے لگے۔

مرسلہ..... محمد رضا چنگیزی، کوئٹہ

ایک دفعہ ایک سادہ لوح دیہاتی چڑیا گھر گیا جب وہ زیبرے کے پاس گیا تو اسے دیکھ کر کہنے لگا "انگریزوں کے بھی عجیب ہی کام ہیں انہوں نے تو گدھے کو بھی ماڈرن بنا دیا ہے۔"

مرسلہ..... خرم نذر وڑائچ، لاہور

جیل کے آفیسر نے قیدی سے پوچھا:

"تم یہاں کیوں لائے گئے ہو؟"

قیدی بولا "حافظے کی کمزوری کی وجہ سے۔"

انسپکٹر نے پوچھا "وہ کیسے؟"

"دراصل میں چوری کرتے وقت یہ بھول گیا تھا کہ اس گھر کے قریب تھانہ بھی ہے۔"

قیدی نے جواب دیا۔

مرسلہ..... راشد اشرف اعوان، حیدر آباد

مریض (سرجن سے) "ڈاکٹر صاحب میں جب بھی پیسوں والی کوئی بات سنتا ہوں تو بے ہوش ہو جاتا ہوں۔"

سرجن: "علاج کافی پیچیدہ ہے میری فیس چار ہزار روپے ہوگی۔"

"کیا؟؟" سرجن نے دیکھا مریض بے ہوش ہو چکا تھا۔

مرسلہ..... نعمان طارق، اٹک

استاد: (شاگردوں سے) "زندگی میں کوئی بھی کام کرنے کے لئے ابتدا ہمیشہ نیچے سے ہی کرنی پڑتی ہے۔"

ایک شاگرد: "کیا تیرنے کے لئے بھی جناب!"

مرسلہ..... جنید اختر، کراچی

استاد: بتایئے ۵۰۰ قبل مسیح سے ۴۲۰۰ قبل مسیح کو تاریک دور کیوں کہا جاتا ہے؟"

شاگرد: "جناب! اس وقت بجلی ایجاد نہیں ہوئی تھی۔"

مرسلہ..... نازش اختر، کراچی۔

انعامی مقابلہ

امتحان ہے آپ کی ذہانت کا

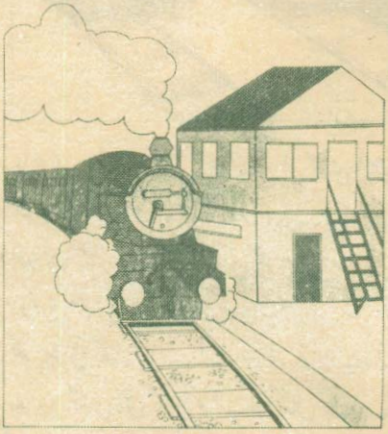

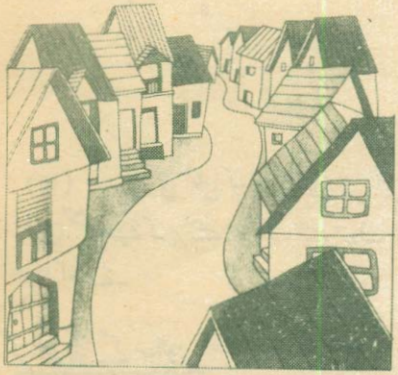

(۱) ایک ٹرین اسٹیشن A سے اسٹیشن H تک سفر کرتی ہے۔ سفر کے درمیان پڑنے والے چھ اسٹیشنوں یعنی B, C, D, E, F, G پر وہ قیام کرتی ہے۔ واپسی پر رکتی ہے اگر ہم A کو پہلا اسٹیشن فرض کریں تو بتایئے کہ اگر ٹرین اسی طرح A سے A تک بار بار سفر کرتی رہے تو اس کا ۲۵۰۰ واں اسٹیشن کون سا ہو گا؟

(۲) کولمبو میں گھروں پر نمبر اس طرح لگائے گئے ہیں کہ جفت نمبر یا طاق نمبر والے مکانات کبھی بھی سڑک کے ایک جانب نہیں پڑتے۔

اگر ایک گلی میں مکانات کے نمبر ایک سے شروع ہوں اور کل مکانات پچیس سے کم ہوں اور اس گلی میں طاق نمبر والے مکانات کی کل تعداد جفت نمبر والے مکانات سے نصف ہو تو بتایئے کہ اس گلی میں واقع مکانات کی کل تعداد کیا ہے؟

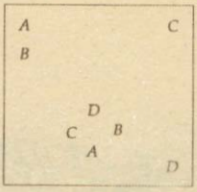

(۳) دی گئی شکل کو چار حصّوں میں اس طرح تقسیم کیجئے کہ ہر حصّے میں ایک جیسے حروف کا جوڑا آجائے۔

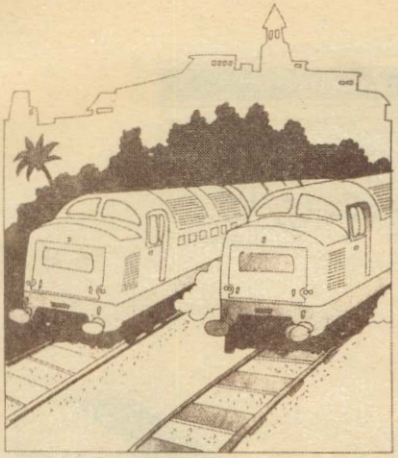

(۴) ایک اسٹیشن سے ایک ریل گاڑی ساٹھ کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے روانہ ہوئی۔ پانچ منٹ بعد اسی اسٹیشن سے ایک دوسری گاڑی اسی سمت میں دوسری متوازی لائن پر روانہ ہوئی۔ اس کی رفتار ستّر کلو میٹر فی گھنٹہ تھی۔ آپ ذرا یہ تو بتایئے کہ دوسری گاڑی پہلی گاڑی کو کب اور کہاں جا پکڑے گی؟

گزشتہ ماہ کے سوالوں کے درست جوابات:۔

۱۔ ۶ مرتبہ کاٹنا پڑے گا۔

۲۔ ۳۰۔

۳۔ ڈیوڈ۔

۴۔ ٹی وی سیٹ کی قیمت = ۴۵۰ روپے
ریڈیو سیٹ کی قیمت = ۲۵۰ روپے
الیکٹرک کُکر کی قیمت = ۱۵۰ روپے
فلور پالشر کی قیمت = ۳۵۰ روپے

قرعہ اندازی کے ذریعے انعام حاصل کرنے والے خوش نصیب:۔

منور حسین قریشی، رحیم یار خان۔

بالکل درست جواب دینے والے ساتھی:۔

سید مظہر علی، حسان صدیقی، سید عاصم علی، شہزاد احمد، فاروق بشیر، سمن زہرہ، احسن علی، محمد عبد

الواحد، تیمور قریشی، سید دانش متین، مصحف رسول، ریاض اسرار بیگ، صباحت حبیب خان، محمد عالم تسلیم، شارق جمیل، طارق جمیل، حنا جمیل، شجاع الحسنین، درثمین، نازیہ اسلم، صائمہ اسلم، کراچی۔ انتساب زاہد، ایبٹ آباد۔ محمد طارق آرائیں، محمد خالد آرائیں، نواب شاہ۔ ارم فاطمہ، سکھر۔ کاشف متین، آصف متین، اسلام آباد۔ انٹی حسنات، ساجد کمالوی، کمالیہ۔ ذیشان سرور، سرگودھا۔ روپ چند، حیدر آباد۔ وکرم، حیدر آباد۔ محمد عاطف شیخ، عالیہ صدف، کراچی۔ بہاولپور۔ نوید فاروق، نصیرہ۔ عبدالسلام شیخ، میرپور خاص۔ محمد طاہر اختر، اسلام آباد۔ محمد فیصل ضیا، کراچی۔ محمد طٰہٰ امین شیخ، کراچی۔ بلال احمد، کراچی۔ محمد امتیاز، کوہاٹ۔ عمر فاروق تلہ، سرگودھا۔ محمد عظیم قریشی، محمد عمر قریشی، محمد اختر قریشی، نسیمہ اختر قریشی، ثنا اختر قریشی، اسلام آباد۔ شہناز قمر، افتخار قمر، ریاض قمر، ارشد قریشی، اسلام آباد۔ علی جان، شکارپور۔ محمد عمیر شہاب، کراچی۔

ایک غلطی کرنے والے ساتھی:۔

یامین بیگ، انعام الٰہی، کاشف شرافت، نجم الحسین، کوثر پروین، عافیہ بکر، کراچی۔ نعمان غوری، نواز افتخار بیگ، ذیشان نصرت خان، نفیس اختر، مولا بخش بلوچ، حسن مصطفیٰ انصاری، آغا ظفر احمد، کنور فہیل احمد، کنور نبیل احمد، رضوان فہیم الدین، راؤ حامد علی، کراچی۔ اختر منیر عقاب، مردان۔ فخر عباس، سرگودھا۔ محمد شفیق سلیم، گجرانوالہ کینٹ۔ نعیم رضا، لاہور۔ محمد ہارون، اسلام آباد۔ محمد کامران کریم شیخ، سکھر۔ حمیرا تبسم، ٹھٹھہ۔ انوار خورشید، لبنیٰ سعدیہ، اسما جبیں، افتخار بیگ نواز، کراچی۔ محمد علی خرم صدیقی، حیدر آباد۔ احمر فرقان، ملتان۔ سید راحت حسین نقوی، سلیمان، کراچی۔ محمد حسن سروش، نواب شاہ۔ اظفر تنویر، ملتان۔ فہمینہ برڑو۔ فہمد عمران فردوس، محمد الہام لودھی، کراچی۔ سید عرفان علی، حیدر آباد۔ نعمان احمد خان، کراچی۔ ارسلان احمد پراچہ، غریب وال۔ نزھی سیف، گوجرانوالہ۔ سید اسد علی شاہ، اسلام آباد۔ اشفاق علی پرنس، مردان۔ محمد جبران عبدالقیوم، حیدر آباد۔ محمد اختر، اسلام آباد۔ حفصہ ودود، حیدر آباد۔ شہلا آصف، نوشہرہ کینٹ۔ ایم ایم میمن، سکھر۔

ایک سے زائد غلطیاں کرنے والے ساتھی:

نیر سلطانہ، بہاول پور۔ وسیم احمد خان، سیدہ حنا نورین کاظمی، صابر بھنبرو، کراچی۔ مسعود احمد سومرو، گڈو سندھ۔ گرداری لعل، ٹنڈو آدم۔ عبدالقدیر انڈھڑ پنوعاقل۔ محمد ریحان، اسلام آباد۔ شہلا سومرو، صائمہ منصور، کراچی۔ طیبہ عرفان، اسلام آباد۔ سبھاش چندر، لاڑکانہ۔ ہرجیت سنگھ، مردان۔

محمد عامر، ٹنڈو محمد خان۔ جویریہ بشیر قائم خانی، شجرۃ الزہرا قائم خانی، حیدر آباد۔ شنید محمود، حیدر آباد۔
محبوب الٰہی میمن، ٹنڈو آدم۔ شمائلہ جبیں، شبانہ جبیں، مردان۔ افضال احمد خان، اسماجمیل، کراچی۔

ان کے علاوہ سینکڑوں ساتھیوں کے نام ڈاک تاخیر سے موصول ہونے کی وجہ سے مقابلے میں شامل نہ ہو سکے۔ قارئین سے گذارش ہے کہ جوابات جلد از جلد ارسال کر دیا کریں۔ (ادارہ)

انعام پانے والے کارٹون

مقابلہ شرارتی کارٹون میں سینکڑوں ساتھیوں نے دلچسپ شرارتی کارٹون ارسال کیے۔ تمام ساتھیوں نے اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ منصفین کے فیصلے کے مطابق درج ذیل تین ساتھی انعام کے حقدار قرار پائے۔

۱۔ فرقان وہاب کراچی ۲۔ عبدالوارث کراچی ۳۔ طارق محمود راولپنڈی خصوصی انعام: سیدہ نیتہ آفاق راولپنڈی

ادارہ انعام حاصل کرنے والے ساتھیوں کو مبارک باد پیش کرتا ہے۔ اچھے اچھے مزیدار شرارتی کارٹون بھیجنے والے بقیہ ساتھیوں کے نام شائع کیے جا رہے ہیں۔ بہت سے ساتھیوں کے نام اس وجہ سے شائع نہیں ہو سکیں گے کہ وہ اپنی تخلیقات پر نام پتہ لکھنا بھول گئے۔ آئندہ وہ اس بات کا خیال رکھیں!!

زاہد علی روبی، ملتان۔ مہرین سلطانہ، عشرت اقبال، فرحین طاہر شمسی، کراچی۔ ضیاء القمر، راولپنڈی سید محمد تمیم، محمد خالد، سیدہ آصفہ خاتون، آغا ظفر احمد، کراچی۔ طارق محمود، راولپنڈی۔ محمد منیر حسین، مصطفیٰ رسول، کامران غوری، نازیہ غوری، کراچی۔ مسعود احمد سومرو، گدو سندھ۔ یاسر منسوب، ہری پور۔ شیر نواز گل، پشاور۔ راجہ سجاد رضا علی راجپوت، گجرات۔ نسیم احمد چغتائی، کوئٹہ کینٹ۔ محمد شبیر احمد خان، محمد آصف اقبال، محمد اصغر خان، محمد سعید احمد خان، عائشہ محبوب، صفیہ محبوب، رضوانہ محبوب، ریحانہ محبوب، کراچی۔ ملک طارق محمود اعوان، گولارچی۔ جواد مصدق، لاہور۔ منوج کمار بچانی، سندھ۔ عطاء الغفار ناصر، ربوہ۔ راج کماری جے رام داس، حیدر آباد۔ عمران سہیل بوبی، اوکاڑہ۔ وارث وہاب، کراچی۔ خالد حماد فیاضی، شیخوپورہ۔ سیف الرحمٰن ڈوگر، لاہور۔ منیر عبدالشکور، نوید احمد، سیدہ حنا نورین کاظمی، کراچی۔ نادیہ میمن، حیدر آباد۔ عاکف نذیر مون، حیدر آباد۔ زرتاش مسعود، مون ظوئے، لاہور۔ طلحہ مسعود علی بیگ، نوابشاہ۔ راجہ عمران یوسف، راولپنڈی۔ حماد الدین، کراچی۔

ادارہ

عکس ادھورے کیجیے پورے

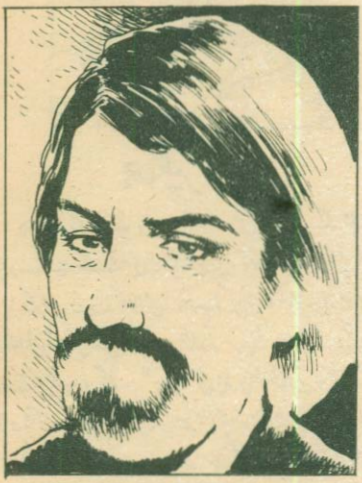

اِس مقابلے میں ہم ہر ماہ کسی ایک شعبے سے تعلق رکھنے والی، دُنیا کی دو معروف شخصیات کے ادھورے خاکے شائع کرتے ہیں۔ آپ کو ان شخصیات کو پہچاننا ہے اور ان کی وجۂ شہرت بتانا ہے۔ آپ کی معلومات میں اضافے کے لیے آئندہ ماہ ہم صحیح جوابات کے ساتھ ان لوگوں کے مختصر حالاتِ زندگی بھی شائع کریں گے۔ بالکل صحیح جواب دینے والے ساتھی کو ایک سال کے لیے ماہنامہ آنکھ مچولی مفت ارسال کیا جائے گا۔ ایک سے زیادہ درست حل موصول ہونے کی صورت میں فیصلہ بذریعہ قرعہ اندازی کیا جائے گا۔ مقابلے میں شرکت کی شرائط مندرجہ ذیل ہیں۔

- جوابات الگ کاغذ پر صاف صاف تحریر کیے جائیں۔
- ہر ماہ کی دس تاریخ تک ادارہ کو موصول ہو جائیں۔
- جوابات کے ساتھ بھیجنے والے کا مکمل پتا ضرور ہو۔

ان تین شرطوں میں سے کسی ایک بھی شرط کے پُورا نہ ہونے پر جوابات کو مقابلے سے خارج کر دیا جائے گا!

پتا: انچارج انعامی مقابلہ "عکس ادھورے کیجیے پُورے"
ماہنامہ آنکھ مچولی، ۱۔ پی آئی بی کالونی کراچی ۷۵۸۰۰

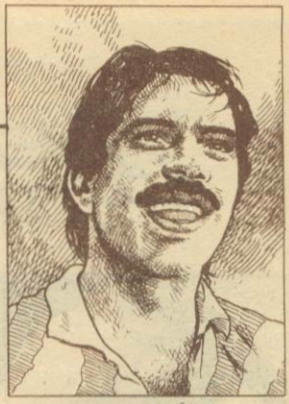

جہانگیر خان

جہانگیر خان نے دسمبر ۱۹۶۳ء میں کراچی کے ایک چھوٹے سے علاقے ایبی سینیا لائن میں آنکھ کھولی۔ اسکواش کی دنیا کے اس لیجنڈ کھلاڑی نے اپنے کیریئر کا آغاز ورلڈ جونیئر اسکواش چیمپئن شپ میں اس شاندار طریقے سے کیا کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ "ہرنیا" کی پیلری کا شکار یہ نو عمر لڑکا جسے ڈاکٹر نے اسکواش کھیلنے سے منع کیا ہوا تھا چھپ چھپ کر اسکواش کھیلتا تھا۔ جب اسی عہد ساز شخصیت کے عظیم والد سابق برٹش اوپن چیمپئن روشن خان کو بیٹے کے شوق کے بارے میں علم ہوا تو انہوں نے جہانگیر کے اس شوق کو اور جلا بخشی اور مکمل ٹریننگ دے کر عالمی اسکواش سرکٹ میں روشناس کرایا۔ ۱۸ سال جہانگیر نے ۱۹۸۲ میں برٹش اوپن کے فائنل میں ہم وطن ہدایت جہاں کو شکست دے کر نہ صرف کم عمری میں جیتنے کا اعزاز حاصل کیا بلکہ اسکواش میں اپنی فتوحات کا نہ رکنے والا طوفان کھڑا کر دیا۔ جس کے آگے بڑے بڑے کھلاڑی ریت کا ڈھیر ثابت ہوئے، جہانگیر نے لگاتار دس بار برٹش اوپن جیت کر وہ عظیم الشان ریکارڈ بنایا ہے جو، اب شاید ہی ٹوٹ سکے۔ کمر کی تکلیف اور بڑھتی ہوئی عمر کے باعث اسکواش کے اس لیجنڈ کھلاڑی نے اب ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیا ہے۔

جان شیر خان

جان شیر نے ۱۹۷۶ء میں ایک ایسے گھر میں آنکھ کھولی جہاں اسکواش کا کھیل لوگوں کے خون میں رچا بسا تھا۔ ان کے بڑے بھائی محب اللہ بھی سابق ورلڈ چیمپئن رہ چکے ہیں۔ اپنے گھر والوں کو اسکواش کھیلتا دیکھ کر جان شیر خان کو بھی شوق ہوا۔ سب سے پہلے وہ انڈر ۱۶ کے چیمپئن رہے پھر انہوں نے پاکستان جونیئر چیمپئن شپ اور ورلڈ جونیئر چیمپئن شپ جیتی۔ ۱۹۸۷ء میں انہیں پہلی بار پاکستان کی نمائندگی کا موقع ملا۔ اور اسی سال انہوں نے اپنے ہم وطن عظیم کھلاڑی جہانگیر خان کو ہرا کر پہلی بار برٹش اوپن اسکواش چیمپئن شپ جیتی۔ ۱۹۸۱ء کے بعد کسی پاکستانی کھلاڑی کے ہاتھوں جہانگیر خان کی شکست کا یہ پہلا موقع تھا۔ پھر ۱۹۸۹ء میں بھی جان شیر نے جہانگیر کو ہرا کر برٹش اوپن جیتی۔ ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۳ء تک بھی جان شیر برٹش اوپن چیمپئن رہے۔ اس کے علاوہ قطر اوپن، آسٹریلین اوپن اور پاکستان اوپن بھی جیتنے کا اعزاز جان شیر کو حاصل ہے۔ ورلڈ اوپن اسکواش چیمپئن شپ میں جان شیر ۹۲، ۹۰، ۸۹ اور ۱۹۸۷ء میں فاتح رہ چکے ہیں۔ جان شیر خان کی عمر بھی ابھی کم ہے اور وہ مکمل فارم میں ہیں۔ اس لئے امید ہے کہ وہ جہانگیر کی کمی محسوس نہ ہونے دیں گے۔

قرعہ اندازی کے ذریعے انعام حاصل کرنے والے خوش نصیب

اختر منیر، عقاب، مردان۔

بالکل درست حل بھیجنے والے ساتھی۔

شمائلہ نیاز، رحیم یار خان۔ بینش حسن، شاہد الیاس، محمد نواز بلوچ، منیر عبدالشکور، کراچی۔ سید عطاء الرحمٰن، فہیم رضا، کوئٹہ۔ سید صولت علی جعفری، تزئین خانم، محمد عامر، صفیہ علی بخاری، سجاد احمد خان، حیدر آباد۔ طارق محبوب میمن، دادو۔ محسن علی سومرو، نواب شاہ۔ عائشہ انجم صدیقی، صوفیہ سلطان، صائمہ ڈار۔ عظمیٰ سلیم، منہاج احمد خان، وسیم احمد خان، سید دانش رضا زیدی، کراچی۔ محمد مدثر احمد صدیقی، جیکب آباد۔ موہن لال، عمر کوٹ۔ ہریش کمار، ڈیون داس، عمر کوٹ۔ ثروت بدر فاروقی، شکیل، نورین عادل، سید محمد احسن، سید یحیٰی حسینی، ملک حق نواز، سید محمد صبیح زیدی، کراچی۔ نادیہ منظور، محمد عاطف، محمد عاصم، کوٹری۔ محمد ہارون، اسلام آباد۔ عائشہ عثمان، ریحان احمد، محمد عروج الحسن خان، ولی اللہ کاشان بخاری، لیاقت علی پروانہ، آصف نصر اللہ، مدیحہ بخاری، عمران شاہد، کراچی۔ ریاض احمد سولنگی، کوٹری۔ عابد انور، عشرت یوسف، جمشید یوسف، میاں محمد کاشف سعید، یامین بیگ، تسلیم سلطان، سید سلمان حیدر جعفری، سید مبشر، مریم انیس قریشی، سید عاطف علی، کاشف شرافت، کراچی۔ عظمت خان اورکزئی، ہنگو۔ المرسل غلام ربانی، نازیہ غوری، کامران غوری، شازیہ غوری، عبیدالرحمٰن، سارہ مسعود، ریحان اللہ خان، صائمہ شاد، خرم ذیشان، سنبل خان، کراچی۔ راؤ شاہد اقبال بہادر، نواب شاہ۔ فخر عباس، سرگودہا۔ میاں عبدالرازق، ملتان۔ راشد اشرف اعوان، حیدر آباد۔ احمد مسعود، عامر اقبال، فوزیہ ناز، نعمان احمد خان، سید راحت حسین نقوی، کراچی۔ جاوید اقبال کنہوروی، حیدر آباد۔ عاقب سعید، عمران نذیر، رحیم یار خان۔ عماد سلیم، گجرانوالہ کینٹ۔ انیلا ملک سکھر، ریاض اسرار بیگ، عائشہ گل، آغا ظفر احمد، شازیہ عزیز، زاہد اختر، ثروت جلال خان، کراچی۔ راجکماری جیرام داس، حیدر آباد۔ شاہد شیخ، خیر پور۔ محمد راحیل بن یحییٰ، حیدر آباد۔ عبدالکریم، کشمور۔ فرح نعمان، محمد آصف نور، شنزاد غفار، کراچی۔ فوزیہ صابر حسین شیخ، حیدر آباد۔ نایافت، آغا ظہیر احمد، فہد اقبال، عبدالخالق، کراچی۔ طلحٰہ احمد طاہر، سرگودھا۔ ماریہ علیم، حیدر آباد۔ محمد نوید، رفعت سبحان، حیدر آباد۔ سید مظہر علی، حسان صدیقی، انعم صدیقی، سید عاصم علی، عرشان بیگ، ناصر بیگ، کراچی۔ راحیلہ طلعت، سکھر۔ بسام وحید، محمد عقیل فاروق، کراچی۔ ویدو یاس جی لوہانہ، میرپور۔ یسریٰ نیاز، نواب شاہ۔ فرحان جمال غوری، بہاولپور۔ کاشف احمد صدیقی، حیدر آباد۔ وسیم شوکت، گوجرانوالہ۔ گل زرین مغل، ہزارہ۔ ناظم محمد اشرف، کراچی۔ اختر منیر عقاب، مردان۔ ابتسام ساجد، کمالیہ۔ عرفان بشیر کراچی۔ امیر عالم مرزا مغل، بہاولپور۔ محمد شکیل بھٹو، دادو۔ عمران ملک محمد حارث مسلم، لاہور۔ مبارک منیر، صائمہ اسلم، نتازیہ اسلم، کراچی۔ محمد جمشید اسلم، لاہور۔ سبھاش چندر، لاڑکانہ۔ عمران داؤد، یاسر کامر، کراچی۔ فرحان سعید، فیروز پور۔ راولپنڈی۔ علی محمد، اقبال احمد صدیقی، زینب طاہر، کراچی۔ قرۃ العین فخر، ہری پور۔ مظہر اقبال، سرائے عالمگیر۔ یاسر حبیب، نواں کوٹ۔ ساجد کمالوی، کمالیہ۔ ناہید غنی، گوجرانوالہ۔ برہان لطیف بٹ، گوجرانوالہ۔ وردہ جاوید، ملتان۔ انثیٰ حسنات، کمالیہ، منوج کمار بچانی (؟) سید عاطف علی، عبدالرؤف بلال، کراچی۔ سید عمران حیدر شاہ، بھکر۔ لیاقت علی آرائیں، گڈو کالونی۔ برکت علی ہزارہ، سانگھڑ نعیم رضا، لاہور۔ شاہد رضا، در شہوار رضوی، اسما ہارون، کراچی۔ انتساب زاہد، ایبٹ آباد۔ محمد علی، پرنس ملک سرفراز احمد، ہمایوں سعید، فیصل مختار، محمد عثمان خان، لبنیٰ کنول، ملتان۔ فاروق حسنی، امان احمد رانا، لاہور۔ عبداللہ عرف شہزادہ گل، پشاور۔ محمد عثمان نعیم بٹ، وحید اسلم،

لاہور۔ محمد عمر فاروق، پشاور۔ طاہر زمان، مردان۔ سمیع اللہ، کوہاٹ۔ لبنیٰ مبین، محمد عابد قلبی، عزیز احمد، اسرہ حسن، کراچی۔ صباحت حبیب خان، کراچی۔ اجمل خان، مردان۔ انیلہ کریم، سہیل احمد ثاقب، سید تابش کریم، سید دانش کریم، ارجمند آرا گڑیا، سعدی میاں، محمد بشیر کراچی۔ عادل خالق قریشی، عامرہ خالق قریشی، محمد رفیق قریشی، محمد عبدالخالق قریشی، ایبٹ آباد۔ سیدہ قمر بتول ہمدانی، سیدہ رضوانہ بتول ہمدانی، سیدہ ریحانہ بتول ہمدانی، سید اسد عباس ہمدانی، سید شکیل ہمدانی، سیدہ رباب ہمدانی، سید مختار ہمدانی، سید حسنین عباس ہمدانی، سید توقیر عباس ہمدانی، راولپنڈی۔ راشد منہاس، لاڑکانہ۔ سیدہ حنانورین کاظمی، ثنا تنویر، اسما جبیں، کراچی۔ رخسانہ پروین، اسلام آباد۔ وسیم انجم، ملتان۔ سجاد جان قریشی، ٹنڈو آدم۔ فیاض احمد شیخ، حیدر آباد۔ حنا یحییٰ، عالیہ صدف، کراچی۔ نعمان رشید، بینش میمن، نادیہ میمن، حیدر آباد۔ ارم ناز، نسرین اختر، فرزانہ کوثر، اسلام آباد۔ محمد عمران امین، حیدر آباد۔ سلیمان، کراچی۔ فیض محمد ملک، بہاولپور۔ محمد یامین آرائیں، حیدر آباد۔ حمیرا تبسم، ٹھٹھہ۔ محمد جبران عبد القیوم، حیدر آباد۔ عبدالقدیر انڈھڑ، پنوعاقل۔ راؤ محمد اویس راجپوت، افتخار حسین تاج، دادو۔ محمد علی خرم صدیقی، حیدر آباد۔ صولت رضا، کراچی۔ شازیہ شیخ، نواب شاہ۔ زورین قریشی، حیدر آباد۔ نوید احمد، ذوالفقار علی میمن، فہد عمران فردوس، زاہدہ عبد الرشید، محمد عاطف شیخ، ابو یامین، محمد اسماعیل عبدالرحمان، کراچی۔ رب نواز کھٹی، حق نواز کھٹی، ناہید کھٹی، بدین۔ احب نینوی جعفری، سکھر۔ محمد کلیم ولی، ٹنڈو آدم۔ شہباز قمر، محمد عمر اختر قریشی، نسیمہ اختر قریشی، محمد اختر قریشی، ثنا اختر قریشی، اسلام آباد۔ عدیل احمد جلیل، حیدر آباد۔ لعل بخش شیخ، جعفر آباد۔ محمد فہیم ضیا، محمد فاروق، بہاولپور۔ فہمینہ برڑو، ٹھٹھہ۔ منصور احمد سومرو، گڈو سندھ۔ محمد حسن سروش، نوابشاہ۔ نیر سلطانہ، بہاولپور۔ تنزیل الرحمن، لبنیٰ سعدیہ، کراچی۔

"ارے بابا ہر شعر کا پہلا لفظ اپنی کاپی پر لکھتے جایئے۔ ایک جملہ بن جائے گا۔ یہی راز ہے۔ بھاگ لو میاں نومی!"

نعیم مشتاق نومی

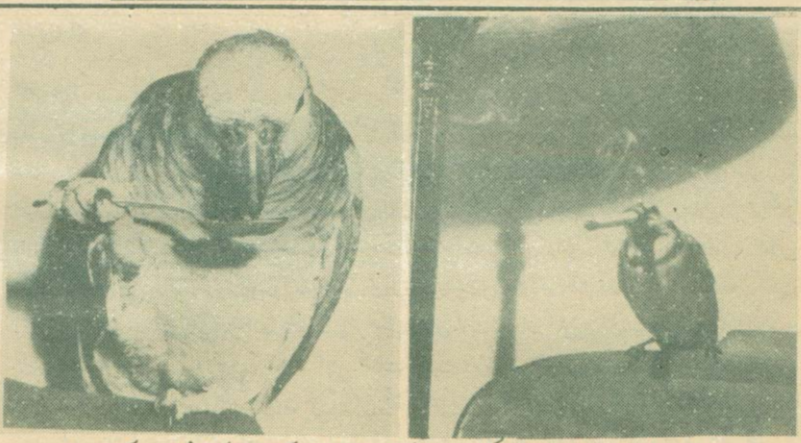

سگریٹ بڑے شوق سے پیتا ہوں... لیکن پھر دوائی بھی پیتا ہوں کیونکہ تمباکو نوشی صحت کیلئے مضر ہے

(عقل مند ۹۰۔ طوطا)

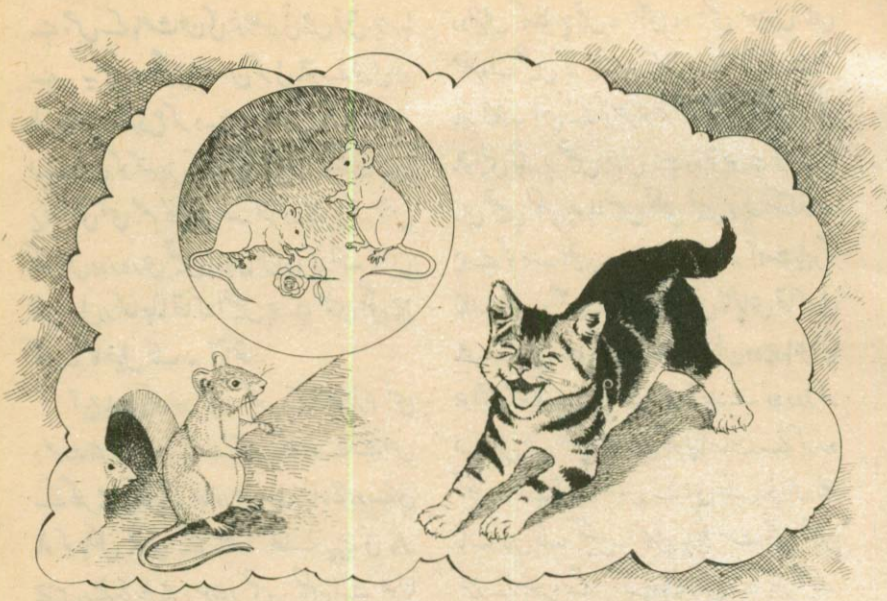

شرارتی نیکی

محمد فاروق دانش

بی مانو پریشانی کے عالم میں ادھر سے ادھر ٹہل رہی تھیں۔ وہ سخت غصے میں تھیں۔ بات یہ تھی کہ گذشتہ ایک گھنٹے سے ایک چوہے نے انہیں بے حد ستایا ہوا تھا۔ وہ اسے پکڑنے کے لئے سخت جدوجہد کر رہی تھیں مگر چوہا تھا کہ ہاتھ آنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ بی مانو تھک کر کرسی کے نیچے آکر بیٹھ گئیں۔ وہ آرام کرنا چاہ رہی تھیں لیکن ان کی نظریں بدستور اس بل پر لگی ہوئی تھیں جہاں سے وہ چوہا باہر آتا تھا۔ بی مانو کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ اس چوہے کو کچا چبا ڈالتیں۔ حالانکہ بی مانو ان دنوں "ڈائٹ کنٹرول" میں مصروف تھیں اور گوشت سے ان کا سخت پرہیز چل رہا تھا۔ بی مانو کی ایک

سہیلی نے انہیں بتایا تھا کہ ان کا وزن برابر بڑھ رہا ہے جس کے باعث ان کی خوبصورتی میں فرق پڑ رہا ہے۔ یہ حیرت انگیز بات سن کر بی مانو نے فوری وہ طریقے اپنانا شروع کر دیئے تھے جس کے باعث وہ اپنے وزن کو کنٹرول کر سکتی تھیں۔ گوشت سے پرہیز بھی اسی مہم کا ایک حصہ تھا اور پھر یہ کہ جس گھر میں وہ رہ رہی تھیں، وہاں ان کی خوراک کا اس قدر خیال رکھا جاتا تھا کہ انہیں چوہے جیسی ہلکی چیز کھانے کا خیال تک نہ آتا تھا۔

آج بات کچھ اور تھی۔ گھر کے تمام افراد کسی دعوت میں شرکت کے لئے باہر گئے ہوئے تھے اس لئے گھر میں کچھ پکانہ تھا اور اہل خانہ جاتے ہوئے بی مانو کو بالکل بھول گئے تھے۔ کھانے پینے کی کچھ چیزیں ریفریجریٹر میں موجود تھی۔ لیکن اسے کھولنا ان کے بس کی بات نہیں تھی ۔ بی مانو نے سوچا کہ آج وہ فاقہ کریں گی اس طرح ان کا وزن مزید گھٹ جائے گا۔ یہ سوچ کر وہ مطمئن تھیں لیکن برا ہو اس چوہے کا جو، ان کے سامنے باہر آگیا اور خالی گھر دیکھ کر ادھر سے ادھر پھدکنے لگا۔ بی مانو کو کیسے گوارا ہوتا کہ کوئی ان کی حکومت میں مداخلت کرتا پھرے۔ بس وہ لگ گئیں اس کے پیچھے پھر جب چوہے نے انہیں تنگ کیا تو روایتی دشمنی بی مانو پر غالب آگئی اور انہوں نے سوچ لیا کہ آج کا لنچ وہ اسی چوہے کو کھا کر کریں گی۔

بی مانو اپنے آپ پر بڑی مشکل سے قابو پائے ہوئے تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ غصہ زیادہ کر کے اپنے بلڈ پریشر کو بڑھائیں اور پھر ان کو ناپسندیدہ دوائیاں کھانا پڑتیں۔ ابھی وہ انہی سوچوں میں مصروف تھیں کہ سامنے کے بل سے چوہے نے سر باہر نکالا۔ اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ بی مانو ایسی جگہ پر تھیں جہاں سے وہ تو چوہے کو دیکھ پا رہی تھیں لیکن چوہا انہیں قطعی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

چوہے کو جب یقین سا ہوا تو وہ آہستہ آہستہ باہر کو نکلا۔ ابھی وہ صحن کے درمیان میں پہنچا ہی تھا کہ بی مانو نے کرسی سے نکل کر جھپٹا مارا لیکن وہ چوہا ہی کیا جو اتنی آسانی سے بلی کے ہاتھ آجائے۔ وہ دوڑ کر اپنے بل میں گھس گیا۔ بی مانو اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔ اب کی بار انہوں نے اپنی جگہ بدلی اور پھر تاک میں لگ گئیں۔ کوئی پانچ منٹ بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ چوہا پھر بل سے باہر آیا۔ اب کی بار اس نے بی مانو کو اپنے قریب بھی آنے کا موقع نہیں دیا اور دوبارہ بل میں گھس گیا۔ اگلے پانچ منٹوں میں وہ دوبار اور نکلا لیکن اپنی پسندیدہ جگہ کی طرف رخ نہ کر سکا اور دوبارہ بل میں گھسنے پر مجبور ہو گیا۔

جب بی مانو خاصی پریشان ہو گئیں تو وہ اس چوہے کو نصیحت دینے کے بارے میں سوچنے لگیں۔ انہیں اس قدر تنگ کبھی کسی نے نہیں کیا تھا۔ آخر ان کے ذہن میں ایک ترکیب آگئی وہ اس بل کے سامنے جا کر بیٹھ گئیں۔ کچھ ہی لمحوں میں پھر چوہے نے سر باہر نکالا اور جیسے ہی اس نے بی مانو کو سامنے بیٹھے ہوئے دیکھا، دوبارہ اندر گھس

گیا۔ اس آنکھ مچولی سے چوہا پریشان ہو یا نہ ہو۔ بی مانو بے حد پریشان تھیں۔ اب وہ بل کے بالکل قریب پہنچ گئیں اور اس کی دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئیں۔ اب ان کا خیال تھا کہ جیسے ہی چوہا سر باہر نکالے گا وہ اسے دبوچ لیں گی اور وہ لمحہ اس چوہے کی زندگی کا آخری دن ہو گا۔

وہ انہی سوچوں میں گم دیوار سے سر ٹکائے بیٹھی تھیں۔ اب کچھ دیر سے چوہے نے سر باہر نہیں نکالا تھا۔ بی مانو حیران تھیں کہ چوہا باہر کیوں نہیں نکلا؟ کیا اسے اندازہ ہو گیا کہ میں اس کے بالکل سر پر پہنچ چکی ہوں؟ وہ انہی خیالات میں غرق تھیں کہ انہیں اندر سے سرگوشیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ بی مانو کے کان کھڑے ہو گئے اور انہوں نے کان کو دیوار سے اور دبا کر لگا دیا تاکہ اندر سے آنے والی آوازوں کو وہ صاف طور پر سن سکیں۔ وہ اس میں خاصی کامیاب بھی رہی تھیں۔ اندر سے چوہیا کی رندھی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ چوہے سے مخاطب تھی۔

"اجی، میں نے..... کہا..... میرا درد بڑھ رہا ہے۔ کچھ کیجئے!"

"بیگم، میں تو کوشش کر ہی رہا ہوں۔ لیکن وہ آفت کی پرکالی....."

"آفت کی پرکالی کا خطاب سن کر بی مانو جذباتی ہو گئیں۔ وہ اپنے پنجے زمین پر کھرچنے لگیں۔

"کیا ہوا اس آفت کی پرکالی کو؟" چوہیا نے سوال کیا۔

"وہ میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی ہوئی ہے۔" چوہا روہانسا ہو کر بولا۔ "میں جیسے ہی باہر نکلتا ہوں، وہ مجھ کو کھانے کو دوڑتی ہے اور مجبوراً مجھے بل کے اندر آنا پڑتا ہے۔"

"مگر میرا کیا بنے گا؟" چوہیا کرب زدہ لہجے میں بولی۔

"تم یہ بھی تو سوچو کہ اگر میں باہر نکلا تو میرا کیا بنے گا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ آفت کی پرکالی آخر ہماری ہی جان کی دشمن کیوں بنی رہتی ہے۔" چوہیا شدید مایوسی سے بولی۔

"ایسا لگتا ہے کوئی پرانا خاندانی حساب رہتا ہے۔" چوہا فلسفیانہ انداز میں بولا۔ "جبھی تو یہ بلیاں آج تک ہم چوہوں کو مار کر بدلہ چکاتی رہتی ہیں۔"

"ہاں، کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔"

"اب تم خود ہی سوچو، اس ازلی دشمن کے سامنے بھلا میں کیسے جانے کی ہمت کر سکتا ہوں۔"

"کیا اس خاندانی دشمنی کو ختم کرانے کی کوئی کوشش نہیں کی جا سکتی؟" چوہیا بولی۔

"میرا خیال ہے، میں اس کے آگے پر امن بقائے باہمی کا منصوبہ رکھ دیتا ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ یہ بات مان لے۔" چوہے نے جل کر کہا۔ "کہو تو کل کے کھانے پر اس آفت کی پڑیا کو بلا لوں۔"

شرارت کیجئے مگر احتیاط سے

میں نے بھی شرارتیں کی ہیں۔ اور یہ سبق حاصل کیا ہے کہ

(۱) شرارت ایسی ہو جو کسی کی ناک کے حدود کے اندر نہ ہو یعنی آزادی کی طرح شرارت کی حد بھی وہیں پر ختم ہو جاتی ہے جہاں کسی دوسرے کی ناک کی حد شروع ہو جائے۔

(۲) شرارت کسی کو نقصان پہنچانے والی نہ ہو ورنہ پھر یہ شر انگیزی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

(۳) کوئی دوسرا شرارت کر رہا ہو تو اس وقت مقام شرارت سے کم از کم دو گز دور رہیں ورنہ اس کی زد میں آپ بھی آسکتے ہیں۔

(۴) شرارت کسی کی بے ادبی، بے حرمتی، بے عزتی اور دل شکنی کا باعث نہ ہو ورنہ پھر وہ شرارت نہیں گناہ ہے۔

(۵) آخری نکتہ یہ ہے کہ اتنی شرارتیں نہ کرو کہ شرارتی کے لقب سے پہچانے جاؤ ورنہ پھر "بد اچھا بدنام برا" کی طرح ہر شرارت تمہارے حساب میں لکھ دی جائے گی چاہے شرارت کسی نے بھی کی ہو۔

(مرسلہ ..... ممتاز حبیب صابر، کراچی۔)

"تم تو ناراض ہونے لگے۔ میرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا۔" چوہیا نے چوہے کے طنز کو سمجھ لیا۔

"بات خوش ہونے کی تو نہیں ہے۔" چوہا چڑ کر بولا۔ "ہم مظلوم بھی ہیں اور مجبور بھی ہمیں تو لب کھولنے تک کی اجازت نہیں ہے۔ اس سے دوستی کی بات کرنے کی جرأت کون کرے گا۔"

بی مانو، اپنی شان میں گستاخانہ الفاظ سن سن کر پیچ و تاب کھا رہی تھیں۔ "ان کی یہ مجال، مجھے اس قدر کوسنے دے رہے ہیں۔ بس! ایک بار میرے ہاتھ لگ جائیں تو مزہ چکھا دوں گی۔" انہوں نے اپنے آپ سے کہا اور پھر اندر کی باتوں کی طرف توجہ کر دی۔ اندر اب بالکل خاموشی تھی۔ کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ ایسے میں چوہیا کے تڑپنے کی آواز آنے لگی۔

"سُنئے ..... میرے پیٹ میں شدید درد اٹھ رہا ہے ....." وہ ہکلاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "اب ..... اگر ..... مجھے ..... گلاب کی پتیاں نہ مل ..... سکیں تو .....

"تمہیں کچھ بھی نہیں ہو گا بیگم! میں ابھی مر نہیں گیا۔" چوہا شدید جذباتی ہو کر بولا۔

"تم مرے تو نہیں ہو، لیکن باہر نکلتے ہی وہ تمہیں ضرور مار دے گی۔" چوہیا شدید کرب میں بولی۔

"مجھے اس کی پروا نہیں، میں تمہیں تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔" چوہے نے یہ کہا اور بل کے منہ کی طرف بڑھا۔

"مت جایئے سرتاج!" چوہیا نے اسے روکا۔ "میری خاطر آپ کیوں اپنی جان دیتے ہیں۔"

"مجھے تمہارے درد کا حل تو کرنا ہی ہو گا۔" یہ کہہ کر چوہے نے بڑی دلیری سے سر باہر نکالا اور

قدم باہر رکھنا ہی چاہتا تھا کہ موت کو اپنے سامنے دیکھ کر ساری بہادری بھول کر اندر کو ہو گیا۔

"وہ آفت کی پر کالی یہیں موجود ہے نا!" چوہیا نے سمجھتے ہوئے کہا۔

"اس نے تو ہماری بالکل ناکہ بندی کر رکھی ہے بیگم!" چوہا گھبراہٹ زدہ لہجے میں بولا۔ "کیسی ظالم ہے یہ بلی! اسے کسی کی تکلیف کا کوئی احساس نہیں ہے۔" وہ روسا دیا۔

"ظالم کب کسی کی تکلیف کا احساس کرتے ہیں۔" چوہیا پر درد لہجے میں بولی۔ "وہ ہر احساس سے عاری ہے۔ خدا کرے کہ اسے ......

"نہیں بیگم، کسی کو بد دعا نہیں دیتے۔ بس دعا کرو کہ خدا تمہاری تکلیف دور کرے۔ چوہے نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔" "تمہاری بد دعا سے خدا اور ناراض ہو جائے گا۔"

چوہیا نے جب بی مانو کو ظالم کا خطاب دیا تو بی مانو کو نہ جانے کیا ہوگیا۔ اس کے سارے اعصاب میں ایک لہر سی دوڑ گئی تھی۔ وہ بل کے پاس سے اٹھ آئی اور سوچنے لگی کہ میں اس قدر لائق نفرت بھی ہو سکتی ہوں، یہ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ وہ کمرے سے نکل کر باہر لان کی طرف آ چکی تھیں۔

وہ نہیں چاہتی تھیں کہ کوئی ان کی بے حسی کی وجہ سے مارا جائے اور یہ ناکردہ خون ان کے حصے میں لکھا جائے۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھیں کہ اس گھرانے کے اتنے افراد جب اسے بے حد چاہتے ہیں تو کوئی بل ایسا بھی ہو جہاں اس کے لئے نفرت کے جذبات پائے جاتے ہوں۔ بی مانو نے گلاب کے گملے پر پہنچ کر دو چار پتیاں توڑیں اور دوڑتی ہوئی بل کے پاس آگئیں اور وہ پتیاں کے بل کے اندر سرکا دیں۔ بی مانو نے دیکھا کہ چوہیا نے پتیاں کھا لی تھیں اور کچھ ہی دیر بعد وہ مسرور نظر آ رہی تھی۔ وہ لوگ حیران پریشان تھے کہ گلاب کی پتیاں بل میں کیسے پہنچیں؟ چوہیا نے سوالیہ نظروں سے چوہے کی طرف دیکھا تو وہ اپنے محسن کو دیکھنے کے لئے بل سے باہر نکلا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ ہمدری کس نے کی ہے؟ وہ صحن میں پہنچا ہی تھا کہ بی مانو نے شرارت کرنے کے لئے ایک جست لگائی اور اسے واپس بل میں پہنچا دیا۔ چوہا دل ہی دل میں بی مانو کو کوستا ہوا اندر چلا گیا اور بی مانو اس حرکت پہ مسکرا رہی تھیں، وہ نہیں چاہتی تھیں کہ انہوں نے جو چھوٹی سی نیکی کی ہے اس کے بدلے کے طور پر کسی قسم کا شکریہ وصول کریں۔

سائنسی معلومات کا کالم

سوال..... زلزلے کیسے آتے ہیں؟ ان سے بچاؤ کیسے ممکن ہے ؟ تفصیل سے بیان کریں۔

محمد خباب امین، لاہور۔

جواب..... زمین کی بالائی پرت کے ٹوٹنے اور آپس میں رگڑ کھانے سے جو زبردست ارتعاشات ہوتے ہیں انہیں زلزلہ کہا جاتا ہے۔ زلزلے بے اندازہ قوت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ یوں لگائیے کہ ایک بڑے زلزلے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی توانائی ہزاروں جوہری بموں کی توانائی سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔

اگر ہم پہلے جوہری بم کی مثال لیں تو اس کے مقابلے میں کوئی دس ہزار گنا زیادہ۔

لیکن یہ زمین کی بالائی پرت کیا ہے؟ یہ کیسے آپس میں رگڑ کھاتی ہے؟ یہ جاننے کے لئے ہمیں زمین کی بناوٹ کو سمجھنا ہوگا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ زمین کا اندرونی حصہ پگھلے ہوئے مادے پر مشتمل ہے۔ شروع میں پوری زمین کا یہی حال تھا۔ پھر آہستہ آہستہ یہ ٹھنڈی ہوتی گئی اور ایک

سخت خول سا بن گیا جس پر ہم اور آپ رہتے بستے ہیں۔ اس کے بعد نیچے کا حصہ سرد ہوا اور اس عمل کے نتیجے میں اس کا حجم کم ہو گیا اور ٹھوس مادے کی جگہ ایک وسیع و عریض خلا پیدا ہو گیا۔ کم دباؤ کی وجہ سے یہ حصہ زمین پر ابھرنا شروع ہو گیا اور اس طرح پہاڑی سلسلے وجود میں آئے۔ عظیم الشان ہمالیہ اس سلسلے میں ایک مثال ہے۔ یہ دراصل سمندر کی تہہ تھی جو کم دباؤ کی وجہ سے ابھر کر پہاڑ بن گئی۔

زمین کی اندرونی کیفیت اس طرح تغیر پذیر یعنی

لمحہ بہ لمحہ بدلنے والی ہے۔ زیر زمین کچھ حصوں میں خصوصیت کے ساتھ یہ عمل جاری ہے۔ یہ کمزور پرتوں والے علاقے ہیں یہاں پرتوں کے ٹکرانے اور آپس میں رگڑ کھانے سے وہ زبردست گڑگڑاہٹ اور ارتعاش پیدا ہوتا ہے کہ سطح زمین پر ایک بڑے حصے میں تباہی آجاتی ہے۔

آپ نے زلزلوں سے بچاؤ کی بات پوچھی ہے۔ تو بھائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے ان کی پیش گوئی کرنا خاصا مشکل کام ہے۔ حال ہی میں مصنوعی سیاروں کے ذریعے زلزلوں کی پیشن گوئی کے سلسلے میں کچھ پیش رفت ہوئی ہے۔ امید ہے کہ اس سلسلے میں کوششیں بار آور ثابت ہوں گی۔

س ..... ٹیوب لائٹ کی روشنی کا سایہ کیوں نہیں بنتا؟

علی اصغر سیال۔ نوابشاہ

ج ..... ٹیوب لائٹ سے نکلنے والی روشنی کا مخرج منتشر ہوتا ہے لہٰذا اس کی روشنی میں بننے والا سایہ واضح نہیں ہوتا۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھ لیجئے کہ ٹیوب لائٹ میں سے نکلنے والی روشنی کسی ایک مخصوص مقام سے نہیں نکل رہی ہوتی اس لئے سامنے رکھی ہوئی شے پر مختلف زاویوں سے روشنی پڑتی ہے جس سے واضح سایہ نہیں بننے پاتا۔ بلب کی روشنی سے بننے والا سایہ نسبتاً صاف بنتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے نکلنے والی روشنی ایک مخصوص مقام سے نکلتی ہے۔ یہی صورت دن کے وقت پیش آتی ہے۔ آپ نے غور کیا ہوگا کہ ایسے کمرے میں جہاں براہ راست دھوپ نہ آرہی ہو، دیوار یا کسی اور شے پر بننے والا سایہ واضح نہیں ہوتا۔ اگر غور نہ کیا ہو تو آزما کر دیکھ لیجئے۔ یہاں بھی وہی وجہ ہے کہ روشنی ایک مخصوص سمت سے نہیں آرہی بلکہ مختلف سطحوں سے منعکس ہونے کے بعد آپ تک پہنچ رہی ہے۔

س: کیا وجہ ہے کہ ہمیں سردیوں میں سردی اور گرمیوں میں گرمی لگتی ہے؟

احمر فرقان۔ ملتان۔

ج: احمر صاحب! ایسا تو ہونا ہی چاہئے۔ سردیوں کے موسم میں درجہ حرارت گر جاتا ہے تو سردی کا احساس ہونا لازمی سی بات ہے۔ گرمیوں میں چونکہ فضا کا درجہ حرارت بڑھ جاتا ہے تو ہمیں تپش اور حدت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ تو ایک قدرتی بات ہے۔ آپ یہ پوچھئے کہ ہمیں یہ احساس کیسے ہوتا ہے کہ موسم سرد ہے کہ گرم؟ تو بھائی، کراچی کا حال تو یہ ہے کہ ۳۲ درجہ سینٹی گریڈ درجہ حرارت اگر مئی جون میں ہے تو لازمی بات ہے کہ گرمی کا موسم ہے اور اگر یہ درجہ حرارت دسمبر جنوری میں ہو تو ظاہر ہے کہ کڑاکے کی سردی پڑ رہی ہے۔ یہ تو خیر ایک مذاق کی بات تھی بات دراصل یہ ہے کہ وہ اعصاب جو سردی یا گرمی کو محسوس کرتے ہیں جلد ہی بہت قریب واقع ہوتے ہیں۔ اور اعصاب کے ذریعے سے ماحول کی درجہ حرارت میں ردوبدل کی

پل پل کی خبر ہمارے دماغ تک پہنچتی ہے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ ہمارا جسم تمام موسمی حالات میں ایک خاص درجہ حرارت برقرار رکھتا ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ بیرونی درجہ حرارت میں کمی کا مقابلہ کرنے کے لئے جسم اضافی حرارت پیدا کرے۔ اسی اضافی حرارت کو پیدا کرنے کے لئے سردیوں میں بھوک کھل جاتی ہے۔ اور ہم معمول سے زیادہ خوراک استعمال کرتے ہیں۔ گرمیوں میں درجہ حرارت کے بڑھ جانے کا تدارک پسینے کی آمد سے ہوتا ہے جس کے نتیجے میں ہمارا جسم معمول سے زیادہ گرم نہیں ہونے پاتا۔ اسی لئے گرمیوں میں خوب پیاس لگتی ہے تاکہ جسم میں پانی کی کمی نہ رہے۔

س: ٹرانسسٹر کیا ہوتا ہے؟

عدید حیدر شاہ، حیدر آباد۔

ج: یہ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ برقی رو کو گزارنے کے لئے کوئی بھی موصل درکار ہے۔ مثلاً تانبے کا تار۔ لیکن برقیات میں برقیوں کا بہاؤ صماموں (VALVES) ٹرانسسٹرز اور شعائی نلیوں کے ذریعے ہوتا ہے صمام ایک پرانے دور کی بات ہو گئی۔ ابھی بھی اگر آپ کے گھر میں پرانے دنوں کی یادگار ریڈیو رکھا ہو تو عین ممکن ہے کہ یہ صماموں سے چلنے والا ریڈیو ہو۔ صمام یہاں پر کئی کام کرتے ہیں مثلاً ایک صمام بدلتی رو اے سی کو براہ راست او ڈی سی میں تبدل کرتا ہے جبکہ ایک اور صمام ایک کمزور اشارے کو بڑھانے کا کام کرتا ہے۔

یہ تو پرانے دور کی بات ہوئی۔ شیشے کے خول پر مشتمل صماموں کا زمانہ ختم ہوا اور ان کی جگہ ٹرانسسٹروں نے لے لی۔ یہ ٹرانسسٹر حجم میں بہت چھوٹے ہوتے ہیں لیکن کام صمام کے جتنا ہی کرتے ہیں بلکہ کئی لحاظ سے اس سے بڑھ کے۔ ٹرانسسٹر نیم موصل قلموں مثلاً سلیکون وغیرہ سے مل کر بنتے ہیں۔ نیم موصل سے مراد یہ ہے کہ نہ تو یہ بہت اچھے موصل مثلاً تانبہ کی خصوصیت رکھتے ہیں اور نہ ہی بیڑی کی طرح غیر موصل ہوتے ہیں۔ یہ کم قوت پر کام کرتے ہیں اور اس طرح بجلی کا خرچ بھی کم ہوتا ہے۔ ان کی اور خصوصیت یہ ہے کہ فوراً گرم تو ہو جاتے ہیں اور اسی لئے ٹرانزسٹر ریڈیو کا بٹن دباتے ہی جلنے لگتا ہے۔ اس کے برعکس صماموں کو گرم ہونے میں کچھ وقت لگتا ہے خاص بات یہ ہے کہ یہ فوراً گرم تو ہو جاتے ہیں لیکن ایک خاص حد سے زیادہ گرم نہیں ہوتے۔ صماموں کے دور میں ریڈیو سیٹ بہت بڑے بڑے ہوتے تھے جو زیادہ بجلی کھاتے تھے اور گرم بھی جلدی ہو جاتے تھے۔ ٹرانزسٹروں کی آمد نے برقیات کی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ جیسی ریڈیو کی آمد ٹرانسسٹرز ہی کی مرہون منت ہے۔

وہ کیا راز تھا؟

محمد عمر احمد خان

قسط نمبر ۲

چیخ کی آواز نے جواد کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ اس کے بھائی کی چیخ تھی جو کالے رنگ کی ایک بدہیت مکڑی کو دیکھ کر ڈر گیا تھا اور اسے جھاڑو سے مارنے جا رہا تھا۔ جواد نے اسے روکا اور پھر چھوٹے بھائی کے ہاتھوں میں دستانے دیکھ کر اسے جھٹکا سا لگا۔ دستانے دیکھ کر اسے پچھلے سال پہلے کے پُر اسرار واقعات یاد آ گئے جو دارالحکومت میں اس کے ساتھ پیش آئے تھے۔

ایک انٹرویو کے سلسلے وہ بذریعہ ٹرین، اسلام آباد جا رہا تھا۔ دورانِ سفر اس کی ملاقات ایک پُر اسرار شخص سے ہوئی جو آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے ہاتھوں میں دستانے پہنے ہوئے تھا۔ جواد نے اس کی آنکھیں دیکھ لیں جو عجیب پُر اسرار سی تھیں۔ اس شخص نے جواد کو اسلام آباد میں ٹھہرنے کے لئے ایک ہوٹل کا کارڈ دیا۔ جواد نے ہوٹل فون کیا تو صرف پانچ منٹ کے مختصر نوٹس پر آٹھ پہیوں والی ایک عجیب و غریب گاڑی اسے لینے اسٹیشن پہنچ گئی۔

(اب آپ آگے پڑھئے)

جواد حیرت سے ہوٹل اسپا سے بھیجی جانے والی گاڑی کو دیکھ ہی رہا تھا کہ گاڑی کا دروازہ کھلا اور سفید وردی میں ملبوس سیاہ رنگت کا ایک نوجوان اس کے قریب چلا آیا۔ "میرے خیال میں آپ ہی جواد شاہ ہیں۔" اس نے بڑی متانت سے کہا اور جواد کی گردن کا خفیف سا اشارہ پاتے ہی سفری بیگ ہاتھ سے لے لیا۔ "پلیز! تشریف لے چلئے۔" جواد سحر زدہ انداز میں اس کے پیچھے چلتا ہوا گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس کے سیٹ پر بیٹھتے ہی گاڑی چل پڑی۔ گاڑی اندر سے نہایت آرام دہ تھی اور اس کا ٹمپریچر سردی کو شکست دے رہا تھا۔

جواد نے سیٹ پر بیٹھتے ہی نوٹ کیا کہ نہ صرف ہوٹل کے میزبان نے سیاہ چشمہ پہنا ہوا ہے بلکہ ڈرائیور نے بھی کالا چشمہ لگایا ہوا تھا۔ دونوں دستانے بھی پہنے ہوئے تھے۔ ایک اور بات جو جواد کے ذہن میں کھٹک رہی تھی وہ یہ تھی کہ صرف پانچ منٹ کے مختصر نوٹس پر گاڑی ہوٹل سے اسٹیشن کیسے پہنچ گئی؟

"کیا میں آپ سے ایک سوال پوچھ سکتا ہوں؟" جواد نے بالآخر پوچھ ہی لیا۔

"ایک نہیں آپ دس سوال پوچھ سکتے ہیں جناب!" میزبان نے بڑی متانت سے شگفتہ لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے اب دس سوال ہی پوچھوں گا۔" جواد نے دل میں سوچا۔ پھر اس نے پوچھا۔

"ہوٹل اسپا دارلحکومت میں کس مقام پر واقع ہے؟"

"پہلے تو آپ اس بات کی تصحیح کر لیں ..... ہوٹل اسپا نہیں ہوٹل اسپائیڈر....." میزبان نے ہولے سے مسکرا کر کہا۔ "ہوٹل اسپائیڈر؟" جواد نے الجھے ہوئے لہجے میں دہرایا۔ "جی ہاں جناب! ہوٹل اسپائیڈر..... ہمارے ہوٹل کا مکمل نام "ہوٹل اسپائیڈر" ہے لیکن کارڈ پر ہم صرف "ہوٹل اسپا" چھاپتے ہیں۔" میزبان نے تفصیل بتائی۔ "اس کی وجہ؟" "کوئی وجہ نہیں جناب۔"

"اچھا..... یہ نام کچھ عجیب سا نہیں.....!!" جواد نے "عجیب" پر زور دیا۔

"عجیب تو دنیا کی ہر چیز ہے جناب!" میزبان نے بڑی متانت سے کہا۔ "کائنات عجوبات کا گھر ہے۔ ہر چیز اپنی جگہ عجوبہ ہے اگر آپ غور کریں تو ..... ہر ایک کا اپنا نظام ہے جو "دوسری آنکھ" ہی دیکھ سکتی ہے..... اب فرض کیجئے آپ اپنی آنکھوں سے اپنے آس پاس کی چیزوں کو دیکھ سکتے ہیں لیکن ..... اپنے اندر کی کائنات کو نہیں دیکھ سکتے جو کھانا کھا رہے ہیں وہ نظر تو آرہا ہے۔ لیکن آپ اس کھانے کو ہضم ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے دوسرے لفظوں میں آپ اپنے جسم کو اندر سے نہیں دیکھ سکتے ماسوائے اس کہ آپ کے پاس دوسری آنکھ موجود ہو۔" میزبان کی الجھی ہوئی گفتگو سے جواد الجھ سا گیا تھا اور پھر جو سوال وہ پوچھنا چاہ رہا تھا وہ پس

منظر میں رہ گیا تھا۔

اصل سوال تو میں پوچھنا.....

ہی بھول گیا۔" جواد نے کہا تو میزبان نے بڑی متانت سے کہا۔ "ضرور پوچھئے!"

"پہلی بات تو یہ کہ کیا ہوٹل کا کرایہ واقعی سو روپے "یومیہ" ہے؟"

"جی ہاں جناب!"

"جواد اصل سوال پھر گول کر گیا تھا۔ سوچنے لگا پوچھوں کہ نہ پوچھوں بالآخر پوچھ ہی لیا۔

"ہم ہوٹل کتنی دیر میں پہنچ جائیں گے؟"

"اگر جلدی ہے تو پلک جھپکتے میں اور اگر جلدی نہیں تو آدھ گھنٹے میں۔" میزبان کا لہجہ کچھ شوخ سا ہو گیا۔

"اس کا مطلب ہے اسٹیشن سے ہوٹل تک کا راستہ آدھے گھنٹے کا ہے لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی....."

"کون سی بات جناب؟"

"یہی کہ..... میرے فون کرنے پر ہوٹل سے گاڑی آدھے گھنٹے کے بجائے صرف پانچ منٹ میں کس طرح اسٹیشن پہنچ گئی۔"

"گڈ.....!" میزبان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ خاصے ذہین لگتے ہیں۔ یہ بات تو ہمارے ذہن میں بھی نہیں آسکی۔" پھر اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "اصل میں ہم اسٹیشن پہلے سے آئے ہوئے تھے۔ آپ نے جب ہوٹل فون کیا تو ہمارے منیجر صاحب نے ہمیں فون کیا کہ جواد شاہ نامی ہمارے معزز مہمان اسٹیشن کے قریب فلاں مقام پر موجود ہیں انہیں وہاں سے پک کر لیا جائے..... ہمارے پاس موبائل فون ہر وقت موجود رہتا ہے دیکھئے!" جواد نے دیکھا میزبان کے ہاتھوں میں موبائل فون موجود تھا۔

"اوہ!....." ایک گہرا سانس جواد کے منہ سے نکل گیا۔

آدھے گھنٹے بعد ہی گاڑی "ہوٹل اسپائیڈر" پہنچ گئی۔ یہ شکر پڑیاں کے مقام سے کوئی ڈیڑھ میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ سنہری رنگ کی محل نما شاندار عمارت۔ "کیا واقعی! اس ہوٹل کا کرایہ سو روپے... ہے؟" جواد اتنے شاندار ہوٹل کو دیکھ کر چلّا اٹھا۔ "جی ہاں جناب!" میزبان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "حیرت ہے مجھے تو ابھی تک یقین نہیں آرہا۔" جواد واقعی حیرت زدہ تھا۔

جب وہ ہوٹل کے بڑے دروازے سے اندر داخل ہونے لگے تو جواد نے دیکھا ہوٹل کی دیواروں اور ستونوں پر مختلف جانوروں کی برنگ برنگی تصویریں بنی ہوئی ہیں اور ایک بڑی سی کالے رنگ کی مکڑی کا پورٹریٹ مرکزی گیٹ کے اوپر آویزاں ہے۔

"میرے پیچھے چلے آیئے۔" میزبان نے کہا۔ جواد نے محسوس کیا کہ ہوٹل کے اندر دھیمے سروں میں موسیقی نشر ہو رہی ہے۔ میزبان مزید دو راہداریوں سے گزرا اور ایک بڑے سے خوبصورت استقبالیہ پر پہنچ کر رُکا۔ استقبالیہ پر ایک ادھیڑ عمر

لیکن سرخ و سفید صاحب کالا چشمہ لگائے بڑی محویت کے عالم میں چھت کی طرف تک رہے تھے۔ جواد نے بھی نظریں چھت کی طرف دوڑائیں اور پھر اسے یہ دیکھ کر حیرت کا ایک ہلکا سا جھٹکا لگا کیوں کہ چھت پر ایک بڑا سا نہایت خوبصورت فانوس لٹکا ہوا تھا اور اس میں نہایت ہی دلفریب اور رنگ برنگ روشنیوں والے بلب جل رہے تھے۔ فانوس کی شکل البتہ مکڑی سے مشابہ تھی یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی مکڑی اپنے جالے سے پھسل کر لٹک رہی ہو۔ "سر! یہ جواد شاہ ہیں ہمارے مہمان اور یہ ہمارے منیجر ہیں عثمان صاحب۔" میزبان نے بڑی مؤدب انداز میں تعارف کا فریضہ سر انجام دیا۔

"آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔ آپ کو ہمارا ہوٹل یقیناً..... پسند آئے گا۔" منیجر نے اپنی سیٹ سے اُٹھ کر جواد سے نہایت گرمجوشی کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ اس کے ہاتھ میں بھی سفید دستانے تھے۔

"آپ کا نام رجسٹر میں لکھ لیا گیا ہے۔ جواد شاہ آپ کا نام ہے..... دارلحکومت آپ کس سلسلے میں آئے ہیں؟" منیجر نے رجسٹر میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "انٹرویو کے سلسلے میں.....!!" جواد نے بتایا۔

"ٹھیک..... انٹرویو کب ہے آپ کا؟"

"کل..... گیارہ بجے۔"

"ٹھیک..... ہمارے گاڑی آپ کو گیارہ بجے سے پہلے انٹرویو کے مقام پر چھوڑ دے گی۔" منیجر نے بڑی انکساری سے کہا تو اس سے کہیں زیادہ انکساری سے جواد نے شکریہ ادا کیا۔

پھر منیجر نے کسی کو آواز دی۔ "عاطف ادھر آؤ۔" سفید وردی میں ملبوس ایک مسکین صورت ولا نوجوان قریب آیا۔

"جی سر!"

دیکھو! یہ ہمارے مہمان ہیں جواد شاہ۔ ان کا سامان اُٹھالو اور انہیں ان کے کمرے میں پہنچا دو۔"

"جی بہتر سر!"

نیا میزبان جواد کا سفری بیگ اُٹھا کر چلنے لگا تو منیجر نے کہا۔ "ٹھہرو!" پھر اس نے دراز سے چابی نکالی اور جواد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ آپ کے کمرے کا نمبر آٹھ ہے اور یہ رہی اس کی چابی۔"

جواد نے ہاتھ بڑھا کر چابی تھامنی چاہی تو اس کے ہاتھ سے نیچے فرش پر بچھے قالین پر گر گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے اُٹھاتا عاطف نامی میزبان نے خود جھکتے ہوئے چابی نیچے سے اُٹھائی اور چابی والا ہاتھ جواد کی طرف بڑھا دیا۔

جواد کی آنکھیں اس کا ہاتھ دیکھ کر حیرت سے کچھ پھیل گئیں۔ پہلی بار اسے کچھ خوف محسوس ہوا۔ اس نے دیکھا عاطف نامی میزبان کے ہاتھوں کی انگلیاں پانچ نہیں آٹھ تھیں.....!! (جاری ہے)

مزید پُراسرار واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں.....!!

بنامِ آنکھ مچولی

قارئین کے مُنتخب خطوط

محمد آصف اقبال خان، کراچی۔ جنوری کا شمارہ اپنی مثال آپ تھا۔ "سنہرے حروف" ماہ رواں کی پہلی بات" دو ٹوک فیصلہ اور "ہاں میں کوشش کروں گا" جیسی تحریروں نے بہت متاثر کیا۔ **علی رشید، عبدالرؤف، ملتان۔** جنوری۔ کا شمارہ خوبصورت سرورق کے ساتھ ملا۔ بہت اچھا لگا۔ "بچاؤ" کی بارہویں قسط پسند آئی۔ **تسنیم سلطان، کراچی۔** شمارہ دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ سرورق غضب کا تھا۔ ہمیں تو سردی لگنے لگی۔ "سچا جھوٹ" "ہم صرف بچے ہیں" "حساس" "وائرس کا پیغام" اور "وہ کیا راز تھا" بہترین کہانیاں تھیں۔ مضامین میں "تیرتی مسجد" بازی لے گیا۔ امجد اسلام امجد صاحب کا گیت پسند آیا۔ **عمرانہ جبیں، کراچی۔** "سنہری حروف" "ماہ رواں کی پہلی بات" اور نئے سال کے حوالے سے "ہاں میں کوشش کروں گا" نے بے حد متاثر کیا۔ قلم دوست کی ساری کہانیاں اچھی لگیں۔ **عابد انور، کراچی۔** جنوری کا آنکھ مچولی اپنی تمام تر رنگینیوں کے ساتھ ملا۔ تمام سلسلوں کے نئے عنوانات پسند آئے۔ "حمد باری تعالیٰ" "انتظار" "سالگرہ کی تیاری" اور "بارش نہیں ہوئی" بہترین نظمیں تھیں۔ بلا عنوان اور محاورہ کہانی کا مقابلہ اچھا سلسلہ ہو گا۔ **عشرت یوسف، جمشید یوسف، کراچی۔** نئے سال کا شمارہ خوبصورت کلینڈر کے تحفے کے ساتھ ملا۔ بے حد پسند آیا۔ انکل! ہم نے آپ کو ایک عدد تحریر بھیجی تھی جو آپ نے نہیں چھاپی لیکن ہم ناراض نہیں ہیں اگر آپ ہماری ایک ہزار تحریریں بھی نہ چھاپیں۔ تب بھی ہم آنکھ مچولی پڑھنا اور خط لکھنا نہیں چھوڑیں گے۔ **منہاج احمد خان، کراچی۔** جنوری کے شمارے میں "تیرتی مسجد" اور "بیبو اور ٹنکی" بے حد پسند آئیں۔ **طارق محبوب میمن، دادو۔** جنوری کا آنکھ مچولی دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ "وائرس کا پیغام" کی آخری قسط نہایت دلچسپ تھی۔ لطیفے بھی پسند آئے۔ **سید یحییٰ حسینی، کراچی۔** جنوری کا شمارہ دلفریب بلکہ بہترین تھا لیکن میرا خط بنام آنکھ مچولی میں شامل نہیں تھا۔ **برکت علی ہزارہ، سانگھڑ۔** جب سے پڑھا ہے کہ فروری میں خاص نمبر آرہا ہے دل کی عجیب حالت ہے۔ دل چاہ رہا ہے کہ گھنٹے، ہفتے، پلک جھپکتے

ایک خط ایک مسئلہ

جناب ایڈیٹر صاحب!

اس خط کے ذریعے میں سب کی توجہ ایک اہم اور سنگین مسئلے کی طرف دلانا چاہتا ہوں اور وہ مسئلہ ہے شب برات پر پھلجڑیاں پٹاخے چھوڑنے کا۔ عبادت کی رات اللہ تعالیٰ کی بندگی میں گزارنے کے بجائے بچے اسے پٹاخے چلانے میں گزارتے ہیں اور بڑے بھی انہیں منع نہیں کرتے۔ آتش بازی سے ہر سال کہیں نہ کہیں آگ لگ جاتی ہے اور انسانی جانوں کا نقصان ہوتا ہے۔ میری والدین سے گزارش ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اس فضول اور نقصان دہ "شرارت" سے بچائیں..... میری حکومت کے ذمہ داران سے بھی درخواست ہے کہ آتش بازی پر مکمل پابندی لگائی جائے تاکہ انسانی جانیں نقصان سے بچ سکیں.....!!

(کاشف اعجاز، میرپور خاص)

میں گزر جائیں۔ اور "خاص نمبر" میرے ہاتھوں میں ہو۔ ○ ..... انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور یہ لیجئے خاص نمبر آپ کے ہاتھوں میں.....!! ثمینہ ناز، کراچی۔ کیا آپ صرف خاص بچوں کو ہی جواب دیتے ہیں؟ ○ ..... بھئی! تمام جواب طلب خطوں کے جواب دیئے جاتے ہیں۔ شہربانو بخاری، رحیم یار خان۔ کیا آپ ہمارے شہر سے صرف ایک ہی خط چھاپتے ہیں؟ ○ ..... بھئی ہم خط کبھی گن کر نہیں چھاپتے۔ علی فرہاد حمید، لاہور۔ حال ہی میں مجھے شمالی علاقہ جات جانے کا اتفاق ہوا جو اپنی خوبصورتی کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ اب یہ تباہی کے دہانے پر کھڑے ہیں۔ درختوں کی دھڑا دھڑ کٹائی اور مختلف جانوروں کے بے تحاشہ شکار کی وجہ سے اس علاقے کا حسن تباہ ہو رہا ہے۔ خاص کر کاغان، سوات، کالام اور جھیل سیف الملوک کا علاقہ شدید متاثر ہے۔ خدارا! قدرت کے ان حسین عطیات کو یوں برباد نہ کیجئے۔ ایم اعجاز احمد، کراچی۔ جنوری کے آنکھ مچولی میں اپنی نظم دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ جاوید سعید، مکران۔ "میرا کوئی تحریر آنکھ مچولی میں نہیں چھپا....." ○ ..... بھائی! اسی لئے نہیں چھپا.....!! ساجد الرحمن، کراچی۔ میری تحریر "حقدار" کا کیا بنا۔ کچھ لطائف بھی بھیج رہا ہوں۔ ○ ..... برادر! آپ کی تحریر دسمبر کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے۔ لطائف معیاری اور دلچسپ بھیجئے۔ محمد مقیم جلبانی، رتو ڈیرو۔ انکل! قلمی دوستی کا سلسلہ بند کر کے آپ نے ہمارا نازک سا دل توڑا ہے۔ کوئی بھی سمجھدار بچہ ایسا نہیں ہوگا جو ہیرنگ خطوط لکھ کر دوستوں کو پریشان کرے۔ مجھے تو آنکھ مچولی ہی کی وجہ سے اچھے دوست ملے ہیں۔ اسرا حسن، کراچی۔ پہلی دفعہ آنکھ مچولی کی محفل میں حاضر ہو رہی ہوں۔ اس بار "ماریہ مسکرانے لگی" اور "مٹھو میاں" جیسی تحریروں کا مرکزی خیال پرانا تھا۔ اس کے علاوہ "سانگرہ کی تیاری" اور "بچاؤ" دو دفعہ پڑھنے کے بعد بھی نہ سمجھ سکی.....!! عامرہ خالق قریشی، ایبٹ آباد۔ انکل! اب کی بار ہمارے چچا، ابو اور دادا جان بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ پلیز! انہیں بھی شامل کر لیجئے اور ہاں انکل..... نئے سال کا کلینڈر بہت ہی پسند آیا۔ کیا اس کو قسطوں میں دینے کا ارادہ ہے؟ ○ ..... آپ کے چچا، ابو اور دادا جان ہمارے بھی بزرگ ہیں۔ ہم انہیں اس محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں..... چار مہینوں کے کلینڈر کو آپ استعمال تو کریں۔ اگلی مرتبہ بھی مل ہی جائے گا۔ درثمین، کراچی۔ میں نے کئی بار آپ کو خطوط لکھے، کئی بار انعامی سلسلوں میں حصہ لیا لیکن ہر بار ناکام رہی ○ ..... ہمت سے کام کرنے والے کبھی ناکام نہیں ہوتے۔ طیبہ

عرفان، اسلام آباد۔ شرارت نمبر کا بے چینی سے انتظار ہے۔ ○ ..... لیجئے! انتظار ختم ہوا۔ **عمران داؤد، کراچی۔** آنکھ مچولی معلوماتی رسالہ ہے اگر اس کی قیمت ۳۰، روپے بھی ہو تو ہم اسے خریدیں گے۔ **ابتسام ساجد، کمالیہ۔** دسمبر ۱۹۹۳ء کے آنکھ مچولی کے مقابلے "امتحان ہے آپ کی ذہانت کا" میں مجھے انعام دینے کا اعلان تھا لیکن انعام ابھی تک نہیں ملا۔ ○ ..... بھائی! دفتری کاروائی کے بعد آپ کا انعام روانہ کیا جا رہا ہے۔ **صائمہ شاد، کراچی۔** میں خط لکھ لکھ کر تنگ آچکی ہوں لیکن آپ خط نہیں چھاپتے۔ ○ ..... بھئی! آپ کے خط میں کوئی توجہ طلب بات ہی نہیں ہوتی۔ **طاہر زمان مجیدی مروان۔** مجھے آنکھ مچولی اتنا پسند ہے کہ تحریریں نہ چھپنے پر ناغہ بھی ہو جاؤں تو اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ **محمد ندیم، راولپنڈی۔** میری دعا ہے کہ آنکھ مچولی ترقی کرتا رہے، آمین!

عالیہ صلاح الدین، کراچی۔ یادگار شام کی تقریب میں میرے نام کی جگہ میری بہن کا نام لکھ دیا گیا ہے شاید رپورٹ لکھنے والے صاحب سے غلطی ہوگئی!! ○ ..... جی ہاں! ان کی جگہ ہم معذرت کر رہے ہیں۔

حمیرا تبسم، مکلی ٹھٹھہ۔ شرارت نمبر موٹا تازہ ہونا چاہئے ○ ..... آنکھ مچولی کے شرارت نمبر کو تو "موٹا" بنا دیا ہے لیکن ہم خود دبلے ہو گئے ہیں..... ! **محمد سلیم، چکوال۔** انکل! میں نے آپ کو ایک لطیفہ بھیجا تھا کیا آپ کو پسند نہیں آیا؟ ○ ..... بھئی آپ جلدی سے مزیدار قسم کے لطائف ارسال کیجئے۔ **محمد اسحاق ورگ، پشاور۔** آپ میری نظم چھاپ دیں ورنہ ..... ورنہ میں دوسری نظم بھیج دوں گا۔ ○ ..... شاباش! آپ دوسری نظم بھیج دیجئے۔ **عامر خالق قریشی (؟)۔** جب سے میری تحریر آنکھ مچولی میں چھپی ہے، میرے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے ہیں ○ ..... اب آپ کا خط چھپ رہا ہے ..... کہیں آپ اڑ ہی نہ جائیں ہوا میں۔ **اکمل شاکر، پسنی مکران۔** اپنا نام "مزید محنت کی ضرورت ہے" میں دیکھا تو بہت خوشی ہوئی۔ ○ ..... ارے! یہ کیا کہہ رہے ہے آپ ..... ! **ریاض عادل، اسلام آباد۔** میری تحریر "اور وہ پکڑا گیا" کے بارے میں آگاہ فرمائیں۔ ○ ..... بھئی! اسے تو ردی کی ٹوکری نے پکڑ لیا ہے اب آپ کاپی قلم پکڑ کر کوئی اور اچھی سی دلچسپ تحریر بھیج دیجئے۔ **سید یحییٰ حسینی، کراچی۔** کیا اپنا خط شائع ہونے کی امید رکھوں؟ ○ ..... دیکھ لیجئے! ہم آپ کی امید پر پورا اترے ہیں۔ **عبدالرزاق، ملتان۔** اس جیسا رسالہ میں نے آج تک نہیں دیکھا ○ ..... ہمیں معلوم ہے آپ ..... **طسین خان نیازی، فیصل آباد۔** آپ نے میری تحریریں کیوں نہیں چھاپیں؟ ○ ..... ناقابل اشاعت ہونے کی وجہ سے۔ **مدیحہ ارم، بہاولپور۔** میں نے ایک کہانی "سکون" بھیجی تھی، اس کا کیا بنا؟ ○ ..... آپ کوئی اور دلچسپ سی تحریر ارسال کیجئے۔ **عنایت اللہ اعوان، کندھ کوٹ۔** حسب عادت اپنا نام "مزید محنت کی ضرورت ہے" میں دیکھنے کے لئے ایک اور تحریر روانہ کر رہا ہوں۔ ○ ..... بری بات ..... اتنا مایوس نہیں ہوتے۔ **محمد رضا چنگیزی، کوئٹہ۔** آپ نے اگر میری تحریر شائع نہ کی تو میں ناراضگی کی دھمکی نہیں دوں گا۔ ..... کیوں کہ دھمکیاں وہ دیتے ہیں جنہیں اپنے آپ پر بھروسہ نہیں ہوتا۔ ○ ..... شاباش! **نبیل نذر شیخ، جھنگ صدر۔** ہم آنکھ مچولی باقاعدگی سے پڑھ رہے ہیں۔ ○ ..... اور ہم آپ لوگوں کے خطوط ..... وہ بھی دھمکیوں سے بھرے!! **ماجد لطیف، لاہور کینٹ۔** آپ نے میرا لطیفہ شائع نہیں کیا، نہ ہی میرا خط ..... میں آپ سے ناراض ہوں ..... یہ میرا آخری خط ہے۔ ○ ..... اچھے بچے ناراض نہیں ہوتے۔ ○ ..... **مہوش سکندر رائے، راولپنڈی۔** ملائشیا کی ایک دلچسپ لوک کہانی ارسال کر رہی ہوں امید ہے پسند آئے گی۔ ○ ..... بھئی! کہانی واقعی دلچسپ ہے۔ **محمد سلیمان کھوسہ، ڈیرہ غازی خان۔** کئی خطوط لکھے۔ لیکن آپ نے ایک بھی خط شائع نہیں کیا ○ ..... پیارے بھائی! ڈاک والوں کی "شرارت" کی وجہ سے ہمیں

آپ کا صرف ایک ہی خط ملا ہے۔ صفدر احمد، چکوال۔ پرچہ روز بروز سکڑ رہا ہے۔ آپ نے اسے ڈائٹنگ تو نہیں کرانی شروع کر دی؟ احمر فرقان، ملتان۔ آپ نے انعامی لطیفوں کا سلسلہ بند کیوں کر دیا ہے؟ ○ ...... مزے دار لطائف کی کمی کی وجہ سے۔ ثروت جبیں، شائستہ جبیں، مردان۔ انکل! جلدی سے رمیز حسن راجہ کا انٹرویو شائع کریں۔ محمد شکیل بھٹو، دادو۔ آپ نے میری تحریر شائع نہیں کی۔ جائیے...... میں آپ سے نہیں بولتا۔ ○ ...... اب تو بولیں گے خط جو شائع ہو گیا ہے۔ حنا احمد، راولپنڈی۔ میں چاہتی ہوں کہ میرا نام اس رسالے میں آئے۔ جمشید الحسن جمیل، ڈیرہ غازی خان۔ مجھے وہ الفاظ نہیں مل رہے جس سے میں رسالے کی تعریف کر سکوں...... !! غلام مصطفیٰ، لاہور ملتان۔ میں نے آپ کو ایک کہانی "استاد کا احترام" بھیجی تھی کیا آپ اسے رسالے میں جگہ دینا پسند کریں گے؟ ○ ...... بھائی! آپ کوئی اور دلچسپ سی کہانی ارسال کیجئے۔ بلال افضل ملک، خوشاب۔ انکل! پہلی دفعہ خط لکھ رہا ہوں امید ہے مایوس نہیں کریں گے۔ ○ ...... بھئی! ہم تو کسی کو بھی مایوس نہیں کرتے۔ ضماد بن اعجاز، ملتان۔ اس دفعہ سرورق نہایت لاجواب تھا۔ کہانیاں سب پسند آئیں۔ عرفان حیدر، صادق آباد۔ جاوید میانداد کے انٹرویو کا بے چینی سے انتظار ہے۔ ○ ...... پہلے آپ ان کی شرارتیں تو پڑھ لیجئے۔ اظہر ملک، راجن پور۔ میری دعا ہے کہ آنکھ مچولی دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے۔ محمد کاشف سعید، کراچی۔ "بچاؤ" بہت اچھی جا رہی ہے۔ محمد اسماعیل سرسانہ، ملتان۔ انکل! اگر آپ ہمیں محفل میں جگہ نہیں دینا چاہتے تو بتا دیں تاکہ ہم آپ کو خط لکھ کر تنگ نہ کریں ○ ...... آپ خوش رہا کریں بھائی!! محمد حنیف قریشی، ایبٹ آباد۔ اس بار لفظوں کی کئی غلطیاں نوٹ کیں۔ ○ ...... جی ہاں کبھی کبھار پروف پڑھنے میں غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ آئندہ خیال رکھا جائے گا۔ پرنس عمر ریاض ساگری، جہلم۔ اس دفعہ بھی شمارہ دلچسپ اور انوکھا تھا۔ درشہوار جارچوی، کراچی۔ آنکھ مچولی میں پہلی بار شرکت کر رہی ہوں امید ہے جگہ دیں گے۔ فہد آفتاب، کراچی۔ آپ نے میری تحریروں کے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں ○ ...... بھائی! آپ کی تحریریں ناقابل اشاعت ہیں...... آپ کوئی اور مختصر اور دلچسپ تحریر ارسال کیجئے۔ سید محمد عابد حسن، پرانا سکھر۔ آنکھ مچولی بے مثال ہے۔ میری دعا ہے یہ مزید ترقی کرے۔ شائستہ نورین، جھنگ صدر۔ نومبر کے شمارے میں اڑن طشتریوں پر مضمون بے حد پسند آیا۔ ساجد حبیب عزیز، کراچی۔ میری تحریر "پرانا دوست" کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ ○ ...... بھائی! کسی نئے خیال پر کوئی اچھوتی اور دلچسپ سی کہانی لکھئے۔ "پرانا دوست" کے لئے معذرت۔ جمشید احمد، لاہور۔ آپ نے میری تحریر اور خط شائع نہ کیا تو میں آئندہ کوئی تحریر نہیں بھیجوں گا۔ وقار افتخار بیگ، کراچی۔ ماہِ رواں کی پہلی بات نے بہت متاثر کیا۔ رضوان کریم، گلگت۔ آپ تحریروں کے ساتھ مصنفوں کی تصویر بھی شائع کریں اور ان کے پتے بھی۔ عمران خان یوسف زئی، پشاور۔ "انتظار فرمائیے" کے نام سے ایک کالم شروع کریں، جس میں قابل اشاعت تحریروں اور ان کے مصنفین کے نام ہوں۔ ملیحہ ثانیہ سحرش، واہ کینٹ۔ انکل! میری نظم دیکھ کر ردی کی ٹوکری کے منہ میں پانی تو نہیں آرہا ہے ناں؟ محمد ذیشان آغا، پاک پتن۔ آنکھ مچولی کے انعامی سلسلے بہت عمدہ ہیں۔ عمر بشیر تبسم، آزاد کشمیر۔ میں نے آپ کو پہلے بھی ایک خط لکھا تھا لیکن لگتا ہے کہ آپ نے وہ ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیا۔ ○ ...... نہیں بھئی! وہ خط ہمیں نہیں ملا۔ زاہد قریشی، آزاد کشمیر۔ رنگین صفحات کی تعداد بڑھا کر آپ نے آنکھ مچولی کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ ثقلین حسن شہریار، جھنگ صدر۔ میں سمجھتا ہوں آنکھ مچولی ہر فن مولا ہے۔ محمد یوسف جوہر، پسنی مکران۔ آپ نے آنکھ مچولی میں میرا نام چھاپ دیا۔ بے حد شکریہ! سیف الرحمن کریم، شیخ سکھر۔ پہلی بار آپ کی محفل میں شرکت کر رہا ہوں۔ ○ ...... بھائی! خوش آمدید......

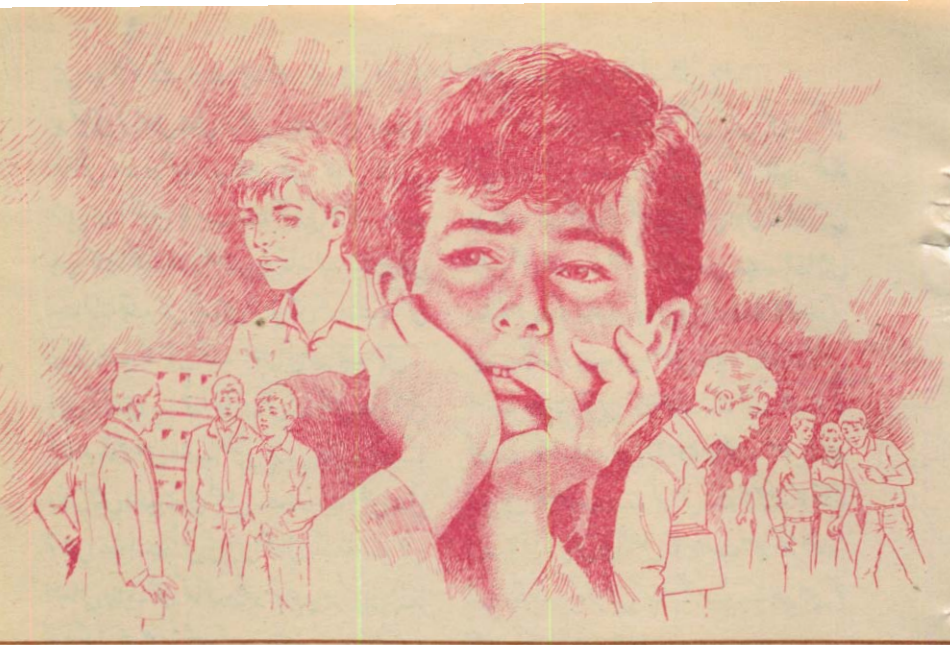

تمھیں پتہ ہے؟

مُنیر احمد راشد

ککڑی!!!

یہ پہلا لفظ تھا جو میں نے کلاس روم میں داخل ہوتے ہی سنا۔ غیر ارادی طور پر میری نظر اُس طرف اٹھ گئی جدھر سے یہ آواز آئی تھی۔ اتنا تو میں بھی سمجھ رہا تھا کہ یہ آوازہ مجھ ہی پر کسا گیا ہے۔ کیونکہ میں جسمانی طور پر بہت دُبلا پتلا اور لمبا سا ہوں۔ میں نے ایک رنج اور غصے کی کیفیت میں اس لڑکے کی جانب دیکھا جس نے کلاس میں پہلے ہی دن میری یہ چڑ نکالی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میرا سارا غصہ پانی کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ وہ بہت خوبصورت لڑکا تھا۔ گورا رنگ، سنہری ریشمی بال، سیاہ چمکدار اور ذہین آنکھیں، پتلے پتلے گلابی ہونٹ جن پر ایک شریر مسکراہٹ تیر رہی تھی۔ بے داغ استری شدہ سفید یونیفارم۔ پہلی ہی نظر

میں وہ لڑکا مجھے بہت اچھا لگا۔ اور میں اس کی بدتمیزی کو بھول بھال کر اس سے دوستی کرنے کا خواہش مند ہو گیا۔ یہ فیصل تھا۔ کلاس کا ذہین ترین اور اسکول کا سب سے شرارتی لڑکا۔ بڑے باپ کا بیٹا تھا۔ ناز و نعم میں پلا تھا۔ اللہ نے ہر خوبی سے نوازا تھا۔ بس ایک یہی خرابی تھی کہ اسے ہر کسی کی چڑ بنانے کا شوق تھا۔ جنون کی حد تک شوق۔ ذہین تو تھا ہی..... فوراً کوئی برمحل اور چبھتی ہوئی پھبتی کستا جو بالآخر اس طالب علم کی چڑ بن جاتی۔ بعد کے دنوں میں جب میری فیصل سے ذرا بے تکلفی ہوئی تو میں نے اسے اُس کی اِس خرابی کے بارے میں احساس دلایا۔ اور کہا کہ دیکھو تم جو یہ ہر کسی کی چڑ بنا کر اسکول بھر میں مشہور کر دیتے ہو..... یوں لوگوں کا دل دکھتا ہے۔ اور اپنے کسی بھائی کا دل دکھانا نہایت ہی بُری بات ہے۔ لیکن میری باتوں کا اس پر کچھ اثر نہ ہوا..... بلکہ اس نے مجھے مولوی گکڑی کہہ کر پکارنا شروع کر دیا۔ مجھے اس کی اس ہٹ دھرمی پر بہت ہی غصہ آیا۔ لیکن میں نے ضبط کرتے ہوئے اسے آخری بار سمجھانے کی کوشش کی۔ "دیکھو فیصل تم بہت اچھے لڑکے ہو..... تمہارے منہ سے ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں..... سوچو اگر کوئی تمہیں چڑائے تو تمہیں دکھ نہیں ہو گا؟"

"کوئی مجھے کیسے چڑا سکتا ہے..... میری تو کوئی چڑ ہے ہی نہیں۔" فیصل نے بے پرواہی سے کہا اور ہاتھ میں پکڑی آئس کریم کون کو چوستا ہوا اسکول کے گیٹ کی طرف چل پڑا۔

فیصل سے میری کوئی دشمنی نہیں تھی۔ لیکن اس دن میں نے سوچا کہ اس کو سبق سکھانا چاہئے۔ میں بھی کچھ کم ذہین نہیں ہوں۔ اور حسِ مزاح بھی اللہ نے اچھی خاصی دی ہے۔ لہٰذا میں نے فیصل کے جملے ہی کو اس کی چڑ بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ اگلے روز جب میں اسکول پہنچا تو دیکھا کہ فیصل حسب عادت نویں جماعت کے ایک لڑکے کو گھیرے کھڑا ہے۔ وہ ذرا موٹا سا تھا۔ فیصل اسے فٹ بال کا خطاب دے کر اس کے لڑھکنے کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ پاس ہی فیصل کا دوست امجد کھڑا تھا۔ میں نے بلند آواز میں سلام کرنے کے بعد امجد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ارے امجد تمہیں پتا ہے..... فیصل کی کوئی چڑ ہی نہیں ہے؟"

"ہاں..... تو اس میں بتانے والی کون سی بات ہے؟"

"نہیں ایسے ہی بس..... ویسے کمال ہے..... فیصل کی کوئی چڑ ہی نہیں ہے۔" میں خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا..... اور فیصل میرے منصوبے اور اپنے مستقبل سے بے خبر اپنی مخصوص شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھتا رہا۔

کلاس روم میں پہنچنے کے بعد میں نے سر کے آنے سے پہلے پہلے تقریباً ہر لڑکے کو مخاطب کر کے یہ اطلاع دی کہ فیصل کی کوئی چڑ ہی نہیں ہے۔ پہلے چند لڑکوں تک تو بات کسی کی سمجھ میں نہیں آئی۔

لیکن آٹھویں جماعت کے لڑکے اتنے کم عقل بھی نہیں ہوتے کہ اتنی سی بات نہ سمجھ پاتے کہ بار بار دہرایا جانے والا یہ جملہ دراصل فیصل کی چڑ بن چکا ہے۔ اب میرے علاوہ بھی دوسرے کئی لڑکے کلاس میں داخل ہونے والے ہر نئے لڑکے کو بتا رہے تھے کہ فیصل کی کوئی چڑ ہی نہیں ہے۔

سر کلاس روم میں داخل ہوئے اور حاضری لے چکے تو حسبِ عادت انہوں نے ہمارا حال پوچھا۔

"ہاں بھئی سب خیریت سے ہوناں! اور کوئی نئی تازی؟"

"جی سر..... آج تو ایک تازی تازی ہے۔" میں نے کہا۔

"ہوں..... اچھا..... کیا ہے بھئی..... ہمیں بھی تو پتا چلے۔"

"سر آپ کو پتا ہے..... فیصل کی کوئی چڑ ہی نہیں ہے۔" میں نے گویا انکشاف کیا۔ میرے اس جملے پر پوری کلاس قہقہوں سے گونج اٹھی۔ فیصل بھی کھسیانا سا ہو رہا تھا۔ میں نے پہلی بار اس کے چہرے پر خجالت اور غصہ کے آثار دیکھے تھے۔

سر نے مسکراتے ہوئے فیصل کی طرف دیکھا اور پھر موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے لڑکوں کی توجہ دوسری طرف مبذول کرا دی۔

"ہاں بھئی..... تو ہم کل کیا پڑھ رہے تھے؟"

اور لڑکے فیصل کو بھول کر کتابوں میں کھو گئے۔

جو لوگ فیصل کی شرارتوں کا نشانہ بن چکے ان کے لئے انتقام لینے کا یہ سنہری موقع تھا۔ اور انہوں نے اس موقعے سے پورا فائدہ اٹھایا۔ دو دن کے اندر اندر پورے اسکول میں یہ بات مشہور ہو چکی تھی کہ فیصل کی کوئی چڑ ہی نہیں ہے۔ وہ جہاں جہاں سے گزرتا، لڑکے اپنے قریبی ساتھی کو مخاطب کر کے بلند آواز میں کہتے۔ "ارے تمہیں پتا ہے .....!!!" اور اگلا جملہ کہنے یا سننے سے پہلے ہی دونوں زور دار قہقہہ لگاتے۔ شروع شروع میں تو فیصل نے اسے ہنسی میں اڑانے کی کوشش کی۔ مگر آہستہ آہستہ وہ اس بات سے سچ مچ چڑنے لگا۔ اور کئی بار نوبت تلخی تک جا پہنچی۔ اب فیصل مجھ سے کٹنے لگا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میری ہی وجہ سے وہ لوگوں کے مذاق کا نشانہ بن رہا تھا۔ حالانکہ پہلے دن کے بعد شاید ہی میں نے اسے چڑایا ہو۔

اُس دن بھی جب پہلی بار میرا خط آنکھ مچولی میں چھپا تو میں فیصل کو یہ خبر دینے کے لئے بے چین تھا۔ کیونکہ میری طرح وہ بھی آنکھ مچولی شوق سے پڑھتا تھا اور اس میں لکھتا بھی تھا۔ میں اسکول پہنچا اور فیصل کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ وہ لان میں ایک طرف بینچ پر اکیلا بیٹھا تھا۔ خط چھپنے کی خوشی میں مَیں یہ دیکھنا بھی بھول گیا کہ فیصل کا موڈ سخت خراب ہے۔ میں تیزی سے چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور خوشی سے بھرپور لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

"فیصل..... فیصل..... تمہیں پتا ہے.....؟"

"ہاں مجھے پتا ہے!!!" میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی فیصل پھٹ پڑا۔

"مجھے سب پتا ہے مردود کہیں کا..... یہ سب تمہاری وجہ سے ہو رہا ہے۔" اس نے غصے سے کپکپاتے ہوئے مجھے خوب بُرا بھلا کہا اور پھر بستہ گھما کر پورے زور سے میرے کندھے پر دے مارا۔ میں چوٹ کھا کر زمین پر گرا تو فیصل میرے سینے پر چڑھ بیٹھا اور میرے چہرے اور جسم پر مکوں کی بارش کر دی۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ میں درد کے مارے چیخ پڑا مگر فیصل کا غصہ کسی طرح بھی کم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ تو اللہ نے مدد کی کہ ہیڈ ماسٹر صاحب کی گاڑی اسی وقت گیٹ سے داخل ہوئی۔ اور انہوں نے یہ سارا ہنگامہ دیکھ لیا۔ وہیں سے ڈانٹ کر فیصل کو منع کیا تو میری جان چھوٹی۔ مگر اب ایک دوسرا خوف جان کو لاحق ہو رہا تھا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب نے ہم دونوں کو لڑتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ ویسے ہی نظم و ضبط کے بہت سخت پابند تھے۔ اسکول میں ذرا سی بد نظمی برداشت نہیں کرتے تھے۔ فوراً آدمی کو چلتا کر دیتے تھے۔ ہمارا اسکول شہر کے بہت اچھے اسکولوں میں سے تھا۔ یہاں داخلہ بھی بڑی مشکل سے ملتا تھا۔ کسی طالب علم کا اس اسکول سے نکالا جانا اس کی زندگی کا سب سے بڑا نقصان ہوتا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے ہمیں دفتر میں حاضر ہونے کا حکم دیا تھا اور ہم دونوں ڈرتے کانپتے آفس کی طرف جا رہے تھے۔ فیصل کا تو مجھے پتا نہیں۔ البتہ میری حالت یہ تھی کہ مارے خوف کے جان نکلی جا رہی تھی۔

"نجانے ہیڈ ماسٹر صاحب کیا کہیں، کیا سزا دیں؟ ایک پچھتاوا بھی تھا کہ لو دیکھو شرارت کا مزا۔ اور نکالو چڑ..... بڑی ذہانت کا مظاہرہ کیا تھا کہ فیصل جیسے لڑکے کی چڑ نکالی تھی۔ اب پتا چلے گا..... آج تو میرا قصور نہیں تھا..... میں تو پٹ رہا تھا۔ اور ویسے بھی فیصل ہی نے جھگڑا شروع کیا تھا۔ میں نے تو اسے کچھ بھی نہیں کہا تھا..... شاید وہ سمجھتا ہے کہ میں نے ہی اس کی چڑ نکالی ہے جس کی وجہ سے اس کا مذاق اڑایا جا رہا تھا..... لیکن میں نے تو خود کبھی بھی اسے نہیں چھیڑا..... اگر لوگ چھیڑتے ہیں تو بھلا اس میں میرا کیا قصور..... اور پھر وہ بھی تو زمانے بھر کی چڑیں نکالتا پھرتا ہے..... ہیڈ ماسٹر صاحب نے اگر مجھ سے پوچھا تو میں تو سب کچھ بتا دوں گا سچ سچ..... لیکن اگر انہوں نے میری بات نہ سنی اور اسکول سے خارج کر دیا تو....." میری کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ ہیڈ ماسٹر کے کمرے میں داخل ہوا۔ فیصل میرے پیچھے تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب غصے کے عالم میں کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ ہمارے آتے ہی انہوں نے غضب ناک نظروں سے ہمیں گھورا..... ایک دو لمحے یہ عمل جاری رہا..... پھر وہ اپنی نشست پر جا بیٹھے اور کڑک کر فیصل سے پوچھا۔

"کیا ہو رہا تھا یہ؟" مگر فیصل کے منہ سے کوئی جواب نہ نکلا۔

"تم بتاؤ راشد؟"

میں خود کوئی بات کہنے کے قابل نہیں تھا۔ انہوں نے ایک بار پھر فیصل سے سختی سے پوچھا۔

"میں پوچھتا ہوں یہ کیا ہنگامہ تھا...... کیوں وحشیوں کی طرح اس لڑکے کو مار رہے تھے تم...... کیا تم اسکول کو کشتی کا اکھاڑا سمجھتے ہو...... ہیں؟ تمہارے خلاف پہلے بھی مجھے بہت سی شکایات ملی ہیں۔ تم نے اسکول کو تھیٹر بنا رکھا ہے۔ ہر کسی کی چڑ نکالتے رہتے ہو...... بتاؤ تم آخر سمجھتے کیا ہو اپنے آپ کو...... ہیں؟" وہ شاید فیصل کو اور بھی ڈانٹ پلاتے کہ میں نے دیکھا فیصل پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا...... رونے کے دوران وہ ہیڈ ماسٹر صاحب سے میری شکایت بھی لگا رہا تھا۔

"سر اس کی وجہ سے میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا...... میرا جینا دوبھر ہو گیا ہے...... میں گلی محلے اور اسکول میں آتے جاتے ڈرتا ہوں...... لوگ آسیب کی طرح میرے پیچھے لگے رہتے ہیں، میں سکون سے سو نہیں سکتا سر...... صرف اس شخص کی وجہ سے...... صرف اس کی وجہ سے سر...... لوگ مجھے چھیڑتے ہیں۔ میرا مذاق اڑاتے ہیں...... مجھے چڑاتے ہیں سر۔"

"جھوٹ بولتے ہو تم!" ہیڈ ماسٹر صاحب نے سختی سے اس کی بات کاٹی۔

"لوگ تمہیں کیا چڑائیں گے...... تم تو خود سب کو چڑاتے رہتے ہو...... اور پھر میں نے تو سنا ہے کہ تمہاری کوئی چڑ ہی نہیں ہے۔"

انہوں نے بے ساختہ کہا اور میں کوشش کے باوجود بھی اپنے قہقہے کو ضبط نہ کر سکا۔

حیرت انگیز مطالعے کی میز

یہ ننھے جونی کے گھر کے عقب میں واقع ایک ستونی میز ہے۔ جس پر جونی پرسکون انداز میں محو مطالعہ ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ زمین سے جس قدر بلندی پر مطالعہ کیا جائے، خیالات اتنے ہی بلند ہو جاتے ہیں۔

مزید محنت کی ضرورت ہے

ناقابلِ اشاعت تحریریں ضائع کر دی جاتی ہیں۔ تحریر بھجواتے وقت اس کی ایک نقل اپنے پاس ضرور رکھیں!
(ادارہ)

"حمد" صفدر حسین انصاری، کراچی۔ "ضد کا انجام" محمد یونس حسین، کراچی۔ "سات بھائی" زاہد ابن اکبر، کراچی۔ "دکھی بچے" (نظم) احمد جابر، کامرہ۔ "ابن خلدون" محمد سلیم، چکوال۔ "آنکھ مچولی جادوگر" ندیم محی الدین، چکوال۔ "مجاہد" محمد سلیم، چکوال۔ "درخواست" (نظم) عابد انور، کراچی "نظم" ساگر صدیقی، کراچی "حضرت امام بخاری" سید عبدالسلام رضوان، ربوہ۔ "خطرناک مذاق" محمد اشفاق کامران، بھکر۔ "شیر میسور ٹیپو سلطان" افیشن کریم، پشاور۔ "وہ کون تھا؟" سید جوبی علی، خانیوال۔ "ایک الو" مستجاب علی، خانیوال "بچو امتحان آیا" (نظم) "جواں مرد سپاہی" "علم"، "علامہ اقبال" محمد عظیم قریشی، اسلام آباد "گھڑی کا چور" عبدالکریم قریشی، بہاول نگر۔ "خدمت کی دولت،" "جیسی کرنی ویسی بھرنی" "ہمارا وطن" (نظم) منصور احمد سومرو، گڈو بیراج (سندھ) "بچے" اکمل شاکر، مکران۔ "دولت" آمنہ امین، خیر پور میرس۔ "ڈرامہ" محمد حسن، لاہور "سبق" نظام الدین فاروقی، کراچی۔ "ایڈیسن" سمیعہ ملک، لاہور۔ "خواہش ناتمام" غزالہ یاسمین، راولپنڈی "ستمبر کی جنگ ایک نظر میں" حمیرا سلیم خان، جھنگ۔ "سپاہی اور بونے" مصباح صدف، خوشاب "شہزادہ اور چڑیل" ثناور (؟) "آدھا کمبل" عمران فاروق، پشاور۔ "برے پھنسے (ڈرامہ) عمران محمد خان، پشاور۔ "میرا دوست" فرید ساجد مغل، بھکر۔ "اے کاش اب بھی" محمد کامران علی کامی، جھنگ صدر۔ "آرزو" فیصل عبدالعزیز تمیمی، لاہور۔ "یہ میرے دیس کا حسن و جمال" محمد سلیم، سرگودھا۔ "میری امی" سعدیہ بنت علی، کراچی۔ "جگنو" نازیہ غوری، کراچی۔ "کیسے کیسے" نگہت غیاث، کراچی۔ "آنکھ مچولی" صائمہ دلدار، جھمرہ سٹی۔ "پاکستان" نوید انور (؟) "خواہش" ایم سکندر، نواب شاہ۔ "الیکشن، ووٹ اور نئی حکومت" سعدیہ جہانگیر، ایبٹ آباد۔ "دھوکے باز وزیر" بدر ابراہیم خان، لاہور۔ "ندامت" فاروق احمد انصاری، کراچی۔ "شیطان" ندیم مغل، گھارو۔ "یوم دفاع" ج الف انصاری، کراچی۔ "درخواست" عابد انور، کراچی۔ "پاکستان ہمارا ہے" محمد عاطف جمیل، وہاڑی "کشمیر کے راج دلارو" عرفان حیدر بخاری، صادق آباد۔ "بہادر اسکاؤٹ" عبدالمجید دانش، تربت، "مرغا اور بلی" "جس کا کام اسی کو ساجھے" فوزیہ ناز، اوکاڑہ۔ "قلعہ روہتاس" محمد شہزاد احسان ساگری، جہلم۔ "تلاش" عبدالرشید فاروقی، جھنگ صدر۔ "دنیا کے سات عجائبات" شیخ محمد عاکف حمید، کامونکے۔ "لکیروں کا کمال" نثار احمد ہاشمی کراچی۔ "بوسنیا" (تین مضامین) غلام عباس، جھنگ۔ "زندہ دل" یاسمین رحمت، ساہیوال۔ "میں اور بھائی جان" فرحین، کراچی۔ "ٹیوشن" علی فرہاد حمید، لاہور۔ "چراگاہ کی بہادر ننھی بہنیں" محمد ریحان اسلام آباد۔ "ملاجی نے گدھا خریدا" سید زعیم اختر" شاہ پور۔ "ڈولفن مچھلی" محمد عمر قریشی، اسلام آباد "لیٹر بکس" "دعا گو میرے لئے ہیں" محمد عاشق حسین نیازی تلہ گنگ۔ "کھوٹا پیسہ" محمد عمر قریشی، اسلام آباد۔ "احمد نے شرارت چھوڑ دی" "ندا کی واپسی" (؟) "قیمت" محمد فاروق حسین کراچی۔

پورب کی ہوا

الف خان

پُورب سے پچھم کو چلنے والی ہوا بے حد شریر تھی، جتنا شریر "ٹوٹو" تھا، باجی کو ربر کے بنے ہوئے لال بیگوں اور چھپکلیوں سے ڈراتا تھا اور جتنے شریر گھروں کی گھنٹیاں بجا کر بھاگنے والے بچّے ہوتے ہیں، ان سے کہیں زیادہ۔

ہوا ابھی چھوٹی تھی لیکن ...... زیادہ چھوٹی بھی نہیں ......!! جب وہ بارہ سال کی ہو گئی تو اس کے امی ابو نے اسے اسکول میں داخل کرا دیا...... لیکن ہوا کو پڑھنے لکھنے کا شوق نہیں تھا۔ اسے کھیلنے کودنے اور شرارتیں کرنے میں مزا آتا تھا۔ جماعت میں سب سے کُند ذہن بچّوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ بڑی مشکلوں سے دھکے لگا لگا کر اسے تیسری جماعت میں بھیجا گیا تھا پر اسے کچھ نہ آتا تھا۔ سائنس سے اس کی جان نکلتی تھی، حساب میں

وہ زیرو تھی اور اُردو..... اُردو تو وہ پڑھ ہی نہ سکتی تھی۔ پہلی جماعت کا قاعدہ جو ننھے بچے فرفر پڑھتے ہیں، ہوا اٹک اٹک کر پڑھتی تھی اور اتنا اٹکتی تھی ..... کہ اس کے ہر بار اٹکنے پر مس کا دل چاہتا تھا اسے ڈنڈے لگائیں..... لیکن مس بہت اچھی تھیں، مارتی نہیں تھیں، بہت پیار و محبت سے پڑھاتی تھیں۔ مس کی محبت ہی کی وجہ سے وہ پڑھ رہی تھی حالاں کہ اسے پڑھنے لکھنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ اسکول جانے کا سن کر اسے بخار چڑھ جاتا اور کبھی پیٹ میں درد ہونے لگتا تھا۔

ایک صبح جب وہ دیر تک سوتی رہی تو اس کی امی نے چادر کھینچ کر اسے اُٹھایا۔ "کیوں! کیا آج اسکول جانے کا پروگرام نہیں ہے۔ آٹھ بج چکے ہیں..... چلو اُٹھو..... اسکول جاؤ۔" ہوا آنکھیں ملتی ہوئی اُٹھ بیٹھی۔ اسکول جانے کا بالکل ارادہ نہیں تھا کیوں کہ آج حساب کی کاپیاں چیک ہونا تھیں اور ہوا نے حساب کا کام نہیں کیا تھا۔ اسے حساب کے مضمون سے سخت چڑ تھی۔ حساب..... حساب سے سر میں درد ہونے لگتا تھا..... یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں..... پانچ کیوں نہیں ہو سکتے بھلا!!" "چلو! بستر چھوڑو اور منہ دھولو اتنا سونا ٹھیک نہیں ہے۔" امی کی یہ بات سُن کر ہوا نے بہانہ بنایا۔ "امی! میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔ آج نہیں میں..... میں کل چلی جاؤں گی۔"

"روز تمہارا یہی بہانہ ہوتا ہے۔"

"بس امی آج اور.....!!"

"آج کی بچی!..... کہاں ہے میری جوتی؟" امی نے ہوا کی بات کاٹ کر کہا اور کمرے میں جوتی ڈھونڈنے لگیں جس سے وہ ہوا کی پٹائی لگاتی تھیں۔ امی کو غصے میں دیکھ کر ہوا جلدی سے اُٹھ گئی اور منہ ہاتھ دھو کر جلدی جلدی تیار ہونے لگی..... صبح ہی صبح اس کا جوتیاں کھانے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔

اُلٹا سیدھا ناشتہ کر کے ہوا نے زبردستی بوجھ (بستہ) اپنے بائیں کاندھے پر لٹکایا اور امی کو سلام کر کے نہ چاہتے ہوئے بھی اسکول جانے کے لئے گھر سے نکل پڑی۔ راستے میں باغ پڑتا تھا۔

"آج میں اسکول نہیں جاؤں گی۔" خوبصورت مناظر دیکھ کر ہوا نے اپنے کاندھے پر پڑے بوجھ (بستے) کو اُچھالا اور بستہ ایک درخت کی شاخ میں اُلجھ گیا۔

"اب مزا آئے گا۔" ہوا پھونکیں مار مار کر تتلیوں کو اُڑانے لگیں۔ "اے! تتلیوں کو کیوں تنگ کر رہی ہو؟" گلاب کے پھول نے ہلکے سے جیسے اسے ڈانٹا۔ ہوا نے یہ سنا تو پلٹ کر گلاب کے گلابی گال پر کاٹ لیا۔ "بدتمیز!" گلاب چیخا۔ "میں تمہاری امی سے تمہاری شکایت کروں گا۔" "باپ رے باپ!" ہوا وہاں سے بھاگی۔ بھاگتے بھاگتے اس نے دیکھا نرگس کا پھول شاخ پر سر نکائے گہری نیند سو رہا ہے۔ "ہیں! یہ ابھی تک سو رہا ہے۔" ہوا شرارت سے اس کے کان

میں جا کر زور سے چیخی۔

"ہوں..... اوں!!" نرگس کا پھول آنکھیں ملتا ہوا ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ "کک..... کک..... کون..... کون.....؟" "ملاجی کی توند۔" ہوا اس کی گھبراہٹ سے محظوظ ہو کر بولی اور ہنستی ہوئی آگے بڑھی پھر کلیوں کو چٹکیاں بھرتی..... پھولوں کے بال بگاڑتی اور ان کے پیٹ میں گدگدی کرتی ہوئی وہ باغ سے باہر ایک پگڈنڈی پر نکل آئی۔ سامنے سے ایک بچہ سر پر لال رنگ کا کیپ پہنے اور کاندھے پر ایک رنگ برنگ بیگ لٹکائے بڑے مزے مزے سے سائیکل چلاتا ہوا چلا آرہا تھا۔

"تم بہت اچھے لگ رہے ہو!" ہوا نے بچے کے کان میں سرگوشی کی لیکن بچے نے سُنا ہی نہیں "تم کہاں جارہے ہو؟" ہوا نے پھر پوچھا لیکن بچہ مزے سے ہلکی دُھن پر سیٹی بجاتا رہا۔ "تم ایسے نہیں بتاؤ گے کہ کہاں جارہے ہو؟" ہوا نے سوچا پھر اس کی ناک کے ذریعے پھیپھڑوں میں پہنچی اور پھر دل کے قریب جا کر اس کے دل کی بات معلوم کر لی اور پھر ہوا کو بے حد غصہ آیا کیوں کہ وہ بچہ تو اسکول جا رہا تھا۔ "دھت ترے کی..... یہ تو پڑھاکو بچہ ہے۔" ہوا بچے کی سانس سے باہر نکل آئی۔ "تم میری طرح کُند ذہن کیوں نہیں ہو۔"

ہاتھ مار کر ہوا نے بچے کا لال کیپ گرا دیا لیکن بچے کو پتہ ہی نہ چلا۔ وہ اپنے خیالوں میں مگن سائیکل چلاتا رہا۔

پیچھے سے ایک موٹا سا بے ڈول بدتمیز آدمی چلا آرہا تھا۔ اس نے ٹوپی گرتے ہوئے دیکھی تو بچے کی طرف اپنی بھونپو آواز میں چیخا۔ "او افلاطون! ٹوپی اُٹھالو اپنی..... نیچے گر پڑی ہے۔"

بچے نے آواز سُن کر سائیکل روک دی اور سائیکل سے اُتر کر اپنی کیپ اٹھانے لگا۔ "بے وقوف! کیا تمہیں اپنا ہوش نہیں اگر میں نہ بتاتا تو ٹوپی کوئی اور لے جاتا۔" موٹے آدمی نے فضول میں رعب جمایا۔

بچے نے کیپ اٹھا کر جھاڑا اور اپنے سر پر رکھ لیا پھر غصیلی نظروں سے موٹے آدمی کی طرف دیکھا۔ لیکن کچھ نہیں کہا البتہ ہوا کو..... غصہ آیا تو اس نے موٹے آدمی کے سر سے اس کی ٹوپی گرا دی لیکن یہ کیا..... موٹے آدمی کے سر کے بال بھی ٹوپی کے ساتھ نیچے گر پڑے۔ "ہیں..... اچھا تو اس نے نقلی بال سر پر لگائے ہوئے تھے۔" ہوا نے سر ہلایا۔ مشرق سے سورج کی کرنیں موٹے آدمی کی گنجی ٹنڈ پر پڑیں تو چمکتی ہوئی چندیا بلب کی طرح چمکنے لگی۔ ہوا نے شرارت سے ایک چپت گنجی ٹنڈ پر لگائی تو موٹے کو احساس ہوا کہ اس کا بھی کچھ گرا ہے۔ پھر اس نے بچے کی طرف دیکھا جو دانت نکالے کھی کھی ہنس رہا تھا۔ "اے! کیوں ہنس رہا ہے؟"

"انکل! وہ..... ائرپورٹ..... وہ..... وہ..... رن وے....."

"کیا؟"

"آپ کی ٹنڈ....." بچہ پھر ہنسنے لگا۔ "کھی کھی کھی..... !!" اب ہوا بھی ہنسنے لگی۔ موٹے نے گھبرا کر اپنے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر بڑبڑایا۔ "اُف! وگ پہننا تو میں بھول ہی گیا۔" وہ واپس گھر کی طرف مڑا۔ بچہ شوخی سے چلّایا۔

"انکل! کہاں جا رہے ہیں؟ اپنے بال تو اٹھا لیں۔" تب موٹے کو یاد آیا کہ نقلی بال تو وہ گھر سے لگا کر نکلا تھا۔ "ہیں! پھر بال گر کیسے گئے؟" اس نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر اسے اپنے نقلی بال زمین پر پڑے نظر آ گئے۔ اس نے جلدی سے جُھک کر اُنہیں اٹھانا چاہا تو ہوا نے ٹھوکر مار کر نقلی بالوں کو آگے کر دیا۔ موٹا آدمی جیسے ہی نقلی بالوں کے قریب پہنچتا، ہوا ٹھوکر مار کر بالوں کو آگے پہنچا دیتی۔ تھوڑی ہی دیر میں موٹا ہانپنے لگا۔ آخر ہوا کو ترس آیا تو "وِگ" اس کے ہاتھ میں پکڑا ہی دی۔

موٹے نے جلدی سے وِگ سر پر اوڑھ لی۔ بچے نے سائیکل پر بیٹھتے ہوئے زور سے کہا۔ "انکل! آج جمعرات ہے..... گنجوں کی بارات ہے۔"

"ٹھہر!! ابھی تجھے بتاتا ہوں۔" موٹا چیخا تو اس کا..... جسم کسی مرکھنی بھینس کی طرح ہِل اُٹھا۔ بچے کی ہنسی نہیں رُک رہی تھی۔ "گ..... گگ..... گگ..... وہ بُری طرح ہنس رہا تھا اور الفاظ اس کے منہ میں ٹوٹ رہے تھے پھر ہنستے ہوئے بڑی مشکل سے اس نے یہ جملہ ادا کیا۔ گنجے پٹیل..... تیری کھوپڑی میں میل.....!!"

"مذاق اڑاتا ہے پاجی!!" موٹا بیل کی طرح ڈکرایا تو بچہ سائیکل پر بیٹھ کر بھاگ نکلا۔ ہوا دور تک بچے کے ساتھ گئی۔ "تم بہت شریر ہو۔" اس نے پیار سے بچے کے بال بگاڑ دیئے جو اصلی تھے۔

بچہ اسکول میں چلا گیا تو ہوا آگے بڑھ گئی۔ اب جس جگہ وہ پہنچی وہاں بڑی بڑی کوٹھیاں تھیں۔ خوبصورت مکانات تھے۔ ایک بڑی سی کوٹھی سے بچّوں کے شور و غُل کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہوا اسی کوٹھی میں اُتر گئی۔ اس نے دیکھا کہ پانچ چھ موٹے تازے سُرخ و سفید بچّے اپنی طرح کی موٹی تازی ایک رنگ برنگ گیند سے کھیل رہے ہیں۔ ایک بچے نے گیند کو کِک لگائی تو وہ ہوا کے سر سے ٹکرائی اور ہوا گرتے گرتے بچی۔ "شریر!" پھر ہوا کو بھی شرارت سوجھی تو اس نے گیند کے اندر کی ہوا نکال دی۔ "پھُس..... پھُس.....!! تھوڑی ہی دیر میں موٹی گیند مرا ہوا چوہا بن گئی۔ "اوہ!" بچے چلّائے۔ ایک بہت موٹا بچہ آگے بڑھا اور مرے ہوئے چوہے کو پھلانے لگا۔ "پھُوں پھُوں پھُوں۔" "تم تو خود گیند ہو رہے ہو۔" ہوا نے موٹے بچے کے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔ "ہی ہی ہی..... یہ..... یہ..... کک..... کک..... کون میرے پیٹ میں گُدگُدی کر رہا ہے؟" "ارے! تمہیں بھی گُدگُدی ہوتی ہے۔" پھر تو تمام بچے موٹے بچے کے پیٹ میں گُدگُدیاں مچانے لگے۔

"ہی ہی ہی ..... پھُوں پھُوں ..... ہی ہی ہی۔" موٹے بچّے کے منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکلنے لگیں۔ "یہ کیا ریل کے انجن کی طرح منہ سے آوازیں نکال رہے ہو مسٹر پھُوں پھُوں!!" ہوا نے موٹے بچّے کے بال بگاڑ کر کہا اور پھر دوسرے بچوں کے پیٹ میں گُدگُدیاں مچا کر وہاں سے بھاگ نکلی۔

"ہی ہی ہی ..... !!" بچّوں کی ہنسی نے دور تک اس کا پیچھا کیا۔

"ہوا مکانوں سے دور نکل آئی۔ اب جس علاقے سے وہ گزر رہی تھی وہاں کچے مکانات بنے ہوئے تھے۔ پھر جب وہ ایک کچے سے مکان کے پاس سے گزری تو اسے بہت سارے بچوں کے چیخنے چلانے کی آواز آئی۔ "امی پہلے مجھے ..... امی پہلے مجھے ..... !!"

ہوا ٹھٹھک کر رُک گئی اور پھر کچے مکان میں اُتر گئی۔ اس نے دیکھا ایک کمزور سی عورت چولہے کے پاس بیٹھی روٹیاں پکا رہی ہے اور اس کے گرد تقریباً ایک درجن بچے جمع ہیں۔ کالے کلوٹے ننگ دھڑنگ۔ کسی کی ناک بہہ رہی ہے تو کوئی کان کھُجا رہا ہے۔ کسی کے آگے پلیٹ ہے تو کوئی چمچے سے پلیٹ بجا رہا ہے۔ سب بھوکے ہیں اور کھانا مانگ رہے ہیں۔ "ارے نامرادو! دے رہی ہوں کھانا ..... کیا مجھے کھاؤ گے۔" ماں نے ڈوئی ہوا میں لہرا کر غصے سے کہا تو بچے سہم گئے لیکن ایک بچہ نہیں سہما۔ مزے سے پلیٹ بجاتا رہا۔ "ٹن ٹن ٹن ..... !!" "او نامراد ..... او ڈھولچی ..... بند کر اپنا طبلہ ..... !!" ماں چلّائی تو طبلچی بچّے نے ڈر کر جلدی سے چمچہ زمین پر رکھ دیا اور پلیٹ اوندھی کر دی نہ کرتا تو ماں اسے اوندھا کر دیتی۔

بچے کچھ خاموش ہوئے ہی تھے کہ فضا میں ایک زور دار چیخ اُبھری۔

"اوں آں ..... اوں آں ..... !!"

"ہیں! یہ کون ہے؟" ہوا نے گردن گھما کر دیکھا۔ مکان کے کچے صحن میں بیچوں بیچ ایک چارپائی پڑی تھی۔ چارپائی کے پایوں کے درمیان ایک میلی سی چادر جھولے کی طرح لٹکی ہوئی تھی اور اس میں ایک بہت ہی چھوٹا اور بہت ہی پیارا بچّہ حلق کا پورا زور لگا کر رو رہا تھا۔ "اوں آں ..... اوں آں ..... !!"

"ارے منّھی! دیکھ اپنے بھائی کو ..... کم بخت! اُٹھ گیا ہے ..... منہ میں نپل دے اس کے۔" ماں کی آواز سن کر ایک بارہ تیرہ سال کی بچّی اپنا سر کھُجاتی منہ بناتی بچّوں کے جمگھٹے سے نکلی اور منّے بھائی کے منہ میں نپل دے کر جھولا دینے لگی۔

"سو جا منے سو جا ..... سو جا منے سو جا۔" لیکن منا سویا نہیں، نپل منہ سے نکال کر زور زور سے چلّانے لگا۔ "اوں آں ..... اوں آں ..... !!"

"خاموش ہو جاؤ ورنہ تمہارا منہ تمہارے چہرے سے بڑا ہو جائے گا۔" ہوا نے منّے کے کان میں سرگوشی کی لیکن منّے نے اپنا منہ اور بڑا کر لیا تب ہوا گھبرا گئی۔ گھبرا کر اوپر اُٹھی اور اُڑتی ہوئی

بادلوں کے پاس پہنچ گئی اور پھر کسی کی ناک پکڑی کسی کا کان۔ کسی کو مُرغا بنایا کسی کو چڑیا کسی کو بلّی تو کسی کو ہاتھی۔ منے بچّے نے نئی نئی شکلوں کے جانور آسمان پر دیکھے تو رونا دھونا بھول کر خوشی سے کلکاریاں مارنے لگا۔

"اماں اماں! مُنّا ابھی رو رہا تھا اور اب خود بخود ہنس رہا ہے۔" ننھی حیرت سے چلّائی۔ "چل اسے ہنسنے دے..... تو ادھر آجا..... کھانا کھالے۔ ورنہ کھانا ختم ہو جائے گا۔" ماں نے آواز لگائی تو ننھی فوراً کھانا کھانے چلی گئی جہاں اس کے بھوکے بہن بھائی کھانے پر ٹوٹے پڑے تھے۔

منا بچّہ کلکاریاں مارتے مارتے سو گیا تو ہوا وہاں سے کھسک لی۔ آج اسکول کی چھٹی کر کے گھومنے پھرنے اور نت نئی چیزیں دیکھنے میں بے حد مزا آرہا تھا۔

وہ گھومتی پھرتی ایک بڑی سی بلڈنگ کے قریب سے گزری جس پر ایک جوکر کا بڑا سا بورڈ لگا ہوا تھا۔ جوکر کو دیکھ ہوا کو ہنسی آگئی۔ کیونکہ اس کی ناک پکوڑا ہو رہی تھی۔ جوکر ایک کتاب پکڑے ہوئے تھا جس پر کچھ لکھا ہوا تھا لیکن ہوا کو پڑھنا نہ آتا تھا اس لئے پڑھ نہ سکی۔ اس نے دیکھا کچھ بچّے ہنستے مسکراتے خوش خوش اس بلڈنگ کے اندر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر جا رہے ہیں۔ "کیا یہ اس جوکر سے ملنے جا رہے ہیں؟" ہوا نے سوچا پھر خود بھی بچّوں کے پیچھے ہو لی۔ بلڈنگ کے اندر دیواروں پر بڑی بڑی خوبصورت تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ایک تصویر میں ایک لمبی داڑھی والا بادشاہ اپنے ایک ہاتھ میں گلہری لئے تخت پر بیٹھا تھا۔ اور ایک حلوائی خرگوش بڑے سے تھال میں بادشاہ کو دو ہنستے پُرانے گلاب جامن چمکیلے ورق لگا کر پیش کر رہا تھا جب کہ ایک دوسرا خرگوش بڑی حسرت سے گلاب جامنوں کو دیکھ رہا تھا۔ دوسری تصویر میں ایک بہت پیاری سی بچّی پھولوں کے درمیان بیٹھی گلدستہ بنا رہی تھی اور اس کی بلّی اس کے پاؤں کو سہلا رہی تھی۔ ایک اور تصویر بڑی مزے دار تھی۔ اس میں ایک مینڈک کا بچّہ سائیکل چلا رہا تھا۔ ہوا نے اس کی سائیکل کی ہوا نکال دی تو مینڈک پٹ سے نیچے گر پڑا۔

بچّے ہنستے مُسکراتے تصویریں دیکھتے باتیں بناتے سیڑھیاں چڑھ کر ایک کمرے میں داخل ہو گئے۔ ہوا بھی بچّوں کے پیچھے کمرے میں چلی آئی جہاں بڑی سی میز کے کونے میں ایک گورے چٹے صاحب کرسی میں دھنسے کچھ لکھ رہے تھے۔ ان کے سامنے بہت سارے کاغذ پھیلے ہوئے تھے۔ "یہ تو کوئی بہت پڑھا کو صاحب معلوم ہوتے ہیں۔" ہوا نے منہ بناتے ہوئے سوچا۔

"پلیز! آپ لوگ تشریف رکھیں۔" انہوں نے اپنی کرسی سے اُٹھتے ہوئے بچّوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا تو ہوا جلدی سے سامنے پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ ایک موٹا سا بچّہ اس پر بیٹھ گیا۔ "افوہ!" ہوا نے اسے پٹخ دیا۔ "ارے ارے! دیکھ کر بھئی!" گورے چٹے صاحب بوکھلا کر بولے تو ہوا

گھبرا کر سی سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور موٹا بچّہ جلدی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ "آپ گر کیسے گئے؟"

انہوں نے پوچھا تو بچّہ جھینپ گیا۔ اس کے ایک ساتھی نے کہا۔ "ایڈیٹر انکل! اصل میں یہ موٹا بہت ہے اس لئے ..... !! کرسی اسے پسند نہیں کرتی۔" یہ سن کر ایڈیٹر انکل نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا تو ان کے سفید دانت جھانکنے لگے۔ "کہیں یہ کاٹ تو نہیں لیں گے؟" ہوا ڈر گئی۔ ادھر ایڈیٹر صاحب بچّوں سے کہہ رہے تھے۔"ہماری شرارتی کتاب کیسی لگی آپ لوگوں کو؟"

ایک بچّی نے کھڑے ہو کر کہا۔ "بہت ہی اچھی۔ آپ نے اتنی اچھی اچھی شرارتیں اس میں لکھوائی ہیں کہ پڑھ پڑھ کر ہماری تو ہنسی چھوٹ رہی ہے۔ سچ انکل! آج سے پہلے کسی نے ہماری شرارتوں کو اس طرح بنا سنوار کر پیش نہیں کیا تھا۔ پہلے تو کوئی ہمیں شرارت بھی نہیں کرنے دیتا تھا لیکن اب تو گھر کے بڑے بھی کبھی کبھی ہمارے ساتھ شرارت کر لیتے ہیں۔"

"شرارتی کتاب واقعی لاجواب ہے۔" ایک دوسرے بچّے نے کہا۔ تمام بچّے شرارتی کتاب کی تعریفیں کر رہے تھے۔ ہوا کو تجسّس ہوا تو سامنے میز پر پڑی شرارتی کتاب کے ورق پلٹنے لگی۔ بڑی خوبصورت تصویریں تھیں..... کہانیاں بھی تھیں۔ "کیا لکھا ہو گا؟" ہوا نے سوچا۔ "مزے مزے کی شرارتیں ....." لیکن مجھے تو پڑھنا ہی نہیں آتا کاش! میں محنت سے پڑھتی تو آج یہ مزے دار شرارتی کتاب میرے پاس ہوتی۔

موٹا بچّہ جو ابھی تک خاموش بیٹھا اپنی جھینپ مٹا رہا تھا بڑی مشکل سے کرسی سے اُٹھا۔ پتلون کی جیب سے مڑا تڑا ایک کاغذ نکالا۔ اسے سیدھا کیا اور ایڈیٹر انکل کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "انکل! میں آپ کے رسالے کے لئے ایک زبردست موٹی سی ..... سوری اچھی سی کہانی لکھ کر لایا ہوں آپ پڑھ کر بتایئے کیسی ہے؟ رسالے میں چھپ بھی سکتی ہے یا نہیں۔"

اس سے پہلے کہ ایڈیٹر صاحب اس کاغذ کو ہاتھ میں پکڑتے، ہوا نے بیچ سے ہی کاغذ جھپٹ لیا اور کمرے سے باہر بھاگی۔ "ارے! ہوا لے جا رہی ہے، اسے پکڑو..... پکڑو....." ایڈیٹر صاحب نے شور مچا دیا۔

"ارے! انہوں نے تو مجھے پہچان لیا۔ حالاں کہ میں نظر نہیں آتی ہوں۔" ہوا گھبرا گئی۔ سامنے اسٹول پر پٹھان چوکیدار بیٹھا مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ ایڈیٹر صاحب کی آواز سن کر ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ اس کی لال آنکھیں اور بڑی بڑی مونچھیں دیکھ کر ہوا کی تو جان ہی نکل گئی۔

"او خانہ خراب کی بچّی! کدھر جاتی ہے۔ ام تم کو نئیں چھوڑے گی۔"

چوکیدار ہاتھ میں ڈنڈا لے کر ہوا کے پیچھے دوڑا۔ "اس نے بھی مجھے پہچان لیا ہے۔" ہوا کے تو پسینے چھوٹ گئے۔ پیچھے بڑی بڑی مونچھوں

والا چوکیدار........، چوکیدار کے پیچھے بچے اور بچوں کے پیچھے ایڈیٹر صاحب۔ سب شور مچاتے ہوئے اس کے پیچھے بھاگے چلے آرہے تھے۔ ہوا دھڑ دھڑ کرتی ہوئی سیڑھیوں سے نیچے اُتری۔ گھبرا کر ریلنگ سے پھسلی اور بلڈنگ کے گیٹ پر آکر گرتے گرتے بچی۔ کاغذ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ موٹے بچے کی کہانی وہیں چھوڑ کر ہوا گلی میں بگٹٹ بھاگی بالکل ایسے ہی جیسے شریر بچے گھروں کی گھنٹیاں بجا کر گھبراہٹ میں بھاگتے ہیں۔

کافی دور آکر اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان مُڑ کر دیکھا تو بلڈنگ کے گیٹ پر چوکیدار، بچے اور ایڈیٹر صاحب نظر آئے۔ ایڈیٹر صاحب کہہ رہے تھے۔ "یہ سب ہوا کی کارستانی ہے۔"

بھوت نگر سے انکل مائیکل   لے کر آتے انجن سائیکل

جادوئی کھیلوں کی کتاب

کتاب جادوئی کھیل میں تمام تصویروں کو ڈائی کٹنگ کے ذریعے کاٹا گیا ہے آپ جس تصویر کو نکالنا چاہیں ذرا سا دبائیے سے وہ تصویر کتاب سے باہر نکل آئے گی۔ یہ چاروں کھیل بعض سائنسی اصولوں پر مبنی ہیں انہیں کھیلنے کے ساتھ ساتھ آپ ان سائنسی اصولوں کو بھی دریافت کر سکیں تو ہمیں خوشی ہوگی۔

۱۔ ایتھلیٹ کی چاروں تصویریں کتاب سے باہر نکال لیں۔ تصویر میں دکھاتے گئے طریقے پر تصویروں کو درمیان سے موڑ لیں۔

(۱) ایتھلیٹ کھڑے ہوئے

(۲) جمپ لگاتے ہوئے

(۳) ہوا میں

(۴) زمین پر بیٹھے ہوئے

۲۔ اب تصویروں کو پشت پر اس ترتیب سے گوندے جوڑ لیں۔

ایتھلیٹ اِن ایکشن

جوڑتے ہوئے درمیان میں پنسل یا سرکنڈے کی ڈنڈی پھنسا لیں۔

۳۔ جب کارڈ پنسل سے اچھی طرح چپک جائیں اور گوند سوکھ جائے تو اپنے دوستوں کو بلائیے اور دکھائیے کہ ایتھلیٹ کس طرح ورزش کرتا ہے بس پنسل کو دونوں ہتھیلیوں کے درمیان رکھ کر گھمائیے۔

جادوئی پہیّہ

۱۔ کتاب سے جادوئی رنگین پہیہ کو باہر نکال لیں۔

۲۔ پہیہ میں بنے ہوئے دو سوراخوں سے گتہ نکال دیں۔

۳۔ تقریباً ۲۸ انچ دھاگا لے کر تصویر کے مطابق پہیے کے سوراخوں میں ڈال کر گرہ لگا دیں۔

۴۔ اب پہیہ کو پھرکی کی طرح گھمائیں۔

۵۔ جب پہیہ تیزی سے گھومنے لگے گا تو آپ دیکھیں گے کہ پہیہ کس طرح رنگ بدلتا ہے اور اگر آپ زیادہ تیزی سے گھمائیں گے تو پہیہ آپ کو سفید نظر آنے لگے گا۔

گھومنے والا سانپ

۱۔ سانپ کو کتاب سے باہر نکالیں اور احتیاط سے
سانپ کی کنڈلی (کوائل) کے جوڑ بھی کھول لیں۔

۲۔ سانپ کی دم میں دیئے گئے سوراخ میں ایک
دھاگہ باندھ لیں۔

۳۔ اب دھاگے کے دوسرے سرے کو پکڑ کر سانپ کو ٹیبل لیمپ کے
اوپر لے جائیں (جیسا کہ تصویر میں دکھایا گیا ہے) دیکھئے سانپ
کس طرح گھومنے لگتا ہے۔

قیدی مچھلی

۱۔ مچھلی اور پیالے والا کارڈ کتاب سے باہر نکال کر
درمیان سے موڑ لیں اور سامنے دکھائے
گئے سوراخ سے بھی دبا کر کارڈ نکال لیں۔

۲۔ اب باریک الاسٹک ربڑ لے کر نیچے دیئے گئے طریقے کے
مطابق سوراخوں میں پرو لیں اور گرہ لگائیں۔

۳۔ دونوں جانب الاسٹک کو مخالف سمت میں بل دیں۔

۴۔ اب کارڈ کو چہرے کے سامنے لا کر الاسٹک کے سروں کو تان
کر پکڑ لیں۔ الاسٹک کے بل کھلیں گے اور کارڈ تیزی سے
گھومے گا۔ آپ دیکھیں گے کہ مچھلی پیالے میں قید ہو گئی ہے۔

قلم دوست

ان کی تحریریں جو ادیب بنانا چاہتی ہیں

غافل مچھلیاں

ایک بزرگ کے حالات میں لکھا ہے کہ آپ مچھلیاں پکڑ رہے تھے اور آپ کے ساتھ آپ کی چھوٹی لڑکی بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ آپ جو بھی مچھلیاں پکڑتے اپنی بیٹی کو دے دیتے لیکن بیٹی اپنے والد سے مچھلیاں لے لے کر پھر دریا میں ڈالتی جاتی۔

حضرت جب فارغ ہو کر اٹھے تو لڑکی سے فرمایا! "بیٹی مچھلیاں کہاں ہیں؟" تو وہ بولی "ابا جان! میں نے تو ان سب کو پھر دریا میں ڈال دیا ہے۔"

حضرت نے فرمایا "تم نے یہ کیا کیا؟ ساری محنت برباد کر دی۔" تو وہ بولی "آپ ہی نے تو بتایا تھا کہ جو مچھلی اللہ کے ذکر سے غافل ہو جاتی ہے وہی جال میں پھنستی ہے تو آپ جس مچھلی کو پکڑتے تھے میں سمجھ لیتی تھی کہ یہ مچھلی اللہ کے ذکر سے غافل ہو گئی جبھی تو پکڑی گئی ہے۔ اس خیال سے کہ غافل مچھلیاں کھا کر ان کی صحبت سے ہم بھی کہیں غافل نہ ہو جائیں اس لئے میں نے وہ ساری مچھلیاں پھر دریا میں ڈال دیں ہیں۔"

مرسلہ: ملک طارق محمود اعوان، گولارچی

تیرے بیٹے زندہ ہیں

سید علی رضا

طوفانی رات تھی۔ سرد ہوا کے تھپیڑے جسم کو جیسے کاٹ رہے تھے۔ علی نے مضبوطی کے ساتھ دانتوں پر دانت جمائے ہوئے تھے۔ اس کے سامنے کشمیر کے فلک بوس پہاڑی علاقے تھے جہاں بزدل دشمن کے سپاہیوں نے قبضہ کیا ہوا تھا اور ...... نہتے کشمیریوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رہے تھے۔

علی کی بڑی خواہش تھی کہ وہ دشمن کے سپاہیوں سے لڑتا ہوا شہید ہو جائے اور کشمیر کی آزادی کے لئے خون کے نذرانے دینے والوں میں اس کا خون بھی شامل ہو۔

وہ مجاہدین کے اس گروپ میں شامل تھا جو دشمن سپاہیوں پر اچانک شب خون مارتے اور آناً فاناً انہیں موت کی نیند سلا کر چھلاوے کی طرح غائب ہو جاتے۔

اس طوفانی رات بھی جب موسم بے حد خراب تھا اور بھارتی فوجوں کا ایک بڑا قافلہ ابھی اپنے اپنے خیموں میں دبکا ہوا تھا، علی اور اس کے ساتھی طوفان سے ٹکراتے ہوئے طوفانی رفتار سے بھارتی خیموں کی طرف بڑھے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے بموں کے دھماکوں اور گولیوں کی بوچھاڑ کا وہ طوفان اٹھا کہ بھارتی سپاہی کچھ بھی نہ کر سکے، موت کی نیند سلانے والے خود موت کی نیند سو گئے۔

اپنی کاروائی مکمل کرنے کے بعد مجاہدین تیزی سے واپس ہوئے اور اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر ساتھیوں کا جائزہ لیا تو بارہ میں سے پانچ ساتھی کم ہو گئے تھے۔ ان کا سب سے دلیر اور لڑاکا مجاہد علی بھی میدان میں کام آ چکا تھا۔

"ہمیں مزید نفری کی ضرورت ہے۔" گروپ لیڈر نے ساتھیوں سے کہا۔ "سر! نفری کی فکر نہ کریں۔" ایک مجاہد نے کہا پھر اس نے دوسرے مجاہد کو اشارہ کیا تو وہ دس بارہ نوجوان لے کر حاضر ہو گیا۔ ان میں سے ایک نوجوان علی کی شکل میں مل رہا تھا۔ مجاہد نے کہا۔

"سر! یہ علی کا بھائی سمیع ہے اور یہ سمیع کے دوست ہیں جو علی کے مشن کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔" "تمہیں اپنے بھائی کی موت کا دکھ نہیں؟" کمانڈر نے سمیع سے پوچھا۔ "میرا بھائی مرا نہیں ہے وہ تو شہید ہوا ہے اور شہید تو ہمیشہ زندہ رہتے ہیں اور ...... اتنا کہہ کر سمیع نے تمام نوجوانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اور ہم سب زندہ رہنے کے لئے آئے ہیں۔ ہماری زندگی کشمیر کو زندگی دے گی اور ہمارے لہو سے آزادی کا وہ چراغ جلے گا جسے بزدل بھارتی کبھی نہیں بجھا سکیں گے۔"

"اللہ اکبر!" سمیع کی جوشیلی بات سن کر کمانڈر نے فخر سے کہا۔

"جس قوم کے بیٹے زندہ ہوں آزادی ان سے کوئی نہیں چھین سکتا۔"

کچھ ہی دیر بعد بھارتی قافلوں پر حملے کا تازہ پروگرام بنایا جا رہا تھا اور تمام مجاہدین کمانڈر کے ساتھ اس نقشے پر جھکے ہوئے تھے جہاں اچانک حملہ کر کے ایک بڑے قافلے کو تباہ و برباد کر کے بتانا تھا کہ جیالے کشمیری لہو کے چراغ روشن کر کے آزادی چھین لینا جانتے ہیں۔

نقش قدم

انسان جیسی صحبت میں بیٹھتا ہے ویسا ہی اس پر اثر ہوتا ہے اس لئے ایسا شخص جس کو اپنے اخلاق سنوارنے ہوں، اسے چاہئے کہ وہ ایسے شخص کی مجلس اختیار کرے جس کا اخلاق کامل ہو۔ اس مقصد کے لئے ہمیں رسول اکرم ؐ کی پاک سیرت کا مطالعہ کرنا چاہئے، کیونکہ اچھے اخلاق والا بننے کے لئے جو مثالیں خوش اخلاقی کی ہمیں رسول پاک ؐ کی پاک سیرت سے مل سکتی ہیں وہ کہیں اور سے نہیں مل سکتی۔

مرسلہ ...... اسجد اقبال، گجرات۔

آنکھ مچولی

کنور واجد حسین، دھنوٹ

جیسے ماں کی ٹھنڈی جھولی، دیکھو میرا آنکھ مچولی
کتنے پیارے بچے اس میں، رنگ بھی کتنے اچھے اس میں
کیسی کیسی بولے بولی
دیکھو میرا آنکھ مچولی

کتنی اچھی تحریریں ہیں، کتنی اچھی تصویریں ہیں
دیکھو گڑیا کتنی بھولی
دیکھو میرا آنکھ مچولی

جب بھی اس کو ہاتھ لگائیں، جان و دل سے صدقے جائیں
میرے سارے ہی ہم جولی
دیکھو میرا آنکھ مچولی

اس کو بنانے والے بھی، اس کو چلانے والے بھی
میٹھے لوگ ہیں میٹھی بولی
دیکھو میرا آنکھ مچولی

اور گھنٹی بج گئی

عبدالماجد خان، حیدرآباد

ہمارے دوست "پنکی" کو لوگوں کے گھروں کی گھنٹیاں بجانے کا بے حد شوق ہے۔ راہ چلتے چلتے اچانک ہی وہ گھروں کی گھنٹیاں بجانے لگتا ہے۔ اور پھر ان صاحب کی اس شرارت کی وجہ سے ہمیں بھی بھاگنا پڑتا ہے۔

بزرگوں نے کہا ہے نا کہ خربوزے کو دیکھ کر تربوزہ بھی رنگ پکڑتا ہے تو کچھ ہی دنوں بعد پنکی میاں کی شرارتیں ہم میں بھی منتقل ہو گئیں۔

اسکول سے آتے ہوئے ہم بھی پنکی کے ساتھ گھُل مِل کر لوگوں کے گھروں کی گھنٹیاں بجانے لگے۔ کوئی گھر سے نکل آتا تو پنکی آگے نکل جاتا۔ وہ صاحب ہم سے پوچھتے "گھنٹی تم نے بجائی ہے؟" "نہیں انکل! گھنٹی تو اس شیطان لڑکے نے بجائی ہے وہ دیکھئے گھنٹی بجا کر کیسے بھاگا جارہا ہے!" ہم پنکی کی طرف اشارہ کرتے اور وہ صاحب بڑے غصّے سے پنکی کو آواز دیتے "روزانہ گھنٹی بجا کر بھاگتا ہے۔ ادھر آ شیطان! مزا چکھاؤں تجھے۔" اور پنکی شیطان تیز تیز قدموں سے چلنے لگتا۔ کبھی ہم گھنٹی بجا کر آگے نکل جاتے اور پنکی پیچھے رہ جاتا تو شیطان اور خبیث کا لقب ہمیں ملتا۔

ایک روز وہ صاحب تیار بیٹھے تھے جیسے ہی پنکی نے گھنٹی بجائی اچانک دھڑ سے دروازہ کھُلا اور انھوں نے پنکی اور ہمیں پکڑ لیا۔ "آتے جاتے گھنٹی بجاتے ہو، تم دونوں نے ہمارا جینا دو بھر کر دیا ہے۔ آج گھنٹی بجانے کا مزا چکھاؤں گا تمہیں......!" "انکل! انکل!" ہم گھگیائے "انکل کے بچّوں!" انھوں نے کرارے سے دو تین تھپّڑ ہمارے منہ پر لگائے پھر وہ پکڑ کر ہمیں ہمارے گھر لے گئے اور ہمارے شیطانی کارناموں سے گھر والوں کو آگاہ کیا تو گھر والوں نے ہماری ایسی گھنٹی بجائی کہ ہم آئندہ کیلئے گھنٹیاں بجانا بھول گئے۔

کرنیں

○ — محبّت روح کا گلاب ہے جو گناہوں کی دھوپ میں مُرجھا جاتا ہے۔

○ — پھُولوں کی زندگی چند لمحوں کی یاد ہے جو ہاتھوں کی ذرا سی گرمی بھی برداشت نہیں کر سکتے۔

○ — خاموشی انسان کا وقار بڑھاتی ہے۔

مرسلہ ...... محمد سلیم امام، متّحدہ عرب امارت

آج کی تازہ خبر

مرسلہ ... سیدہ افشاں فرخ، کراچی

آج کے اخبار میں آئی ہے یہ تازہ خبر
گیدڑوں نے کر دیئے ویراں لنگوروں کے گھر
دیکھ کر بکری کو ڈر کر بھاگ اُٹھا شیرِ ببر
آج کے اخبار میں آئی ہے یہ تازہ خبر

کون کہہ سکتا ہے وہ کس بات پر آخر اڑے
بس یونہی غصّہ میں ہاتھی اور بندر لڑ پڑے
لڑتے لڑتے ہو گئے دونوں لہو میں تر بتر
آج کے اخبار میں آئی ہے یہ تازہ خبر

بلّیوں نے رات کو جلسہ کیا لاہور میں
ہم سے چوہے کس لئے ڈرتے نہیں اس دور میں
ایک چوہا بھاگ اُٹھا ان کا مائک توڑ کر
آج کے اخبار میں آئی ہے یہ تازہ خبر

مچھلیوں اور مینڈکوں میں ہاتھا پائی ہو گئی
بات ہی ایسی تھی حیراں کل خدائی ہو گئی
کل سے سب کچھوے اسی غصّے میں ہیں ہڑتال پر
آج کے اخبار میں آئی ہے تازہ خبر

ہر طرف جنگل میں تھا ظلم اور سختی کا نظام
بھیڑیوں نے کر دیا تھا چین سے جینا حرام
بھیڑیئے ب خود ہی بھاگ اُٹھے ہیں جنگل چھوڑ کر
آج کے اخبار میں آئی ہے یہ تازہ خبر

یہ آج سے تین سال پہلے کی بات ہے کہ ایک دن میں دوپہر کو سو رہا تھا کہ امّی جان نے جگا دیا اور کہا کہ میں اسٹور روم کی چھت سے لحاف گدّے

شرارت مہنگی پڑی

سیّد جنید علی، کراچی

وغیرہ لے آؤں اِس وقت گرمی کی وجہ سے یہ کام کرنے کو بالکل دل نہ چاہ رہا تھا لیکن بادل نخواستہ اُٹھ کر اسٹور میں گیا۔ راستے میں میرے ذہن میں ایک شرارتی منصوبہ آیا۔ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کیلئے میں لال دوات لے کر اسٹور روم میں گیا اور چھت سے لحاف گدّے اُتارے اور لال دوات سر پر اُنڈیل کر بہت سے لحاف گدّے اپنے اوپر ڈال لئے اور زور زور سے چیخنے چِلاّنے لگا جس پر سب گھر والے اسٹور روم میں آگئے اور مجھے زخمی دیکھ کر پریشان ہوگئے۔ امّی جان تو رونے لگیں۔ جس پر میں جلدی سے اُٹھ بیٹھا اور ان سے کہا ”امّی جان! میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ ”پھر یہ خون؟“ امّی نے گھبرا کر پوچھا۔ ”یہ خون نہیں سُرخ روشنائی ہے۔“ یہ سُنتے ہی امّی جان چپل لے کر میرے پیچھے دوڑیں۔ میں ہنستا ہوا بھاگا تو دروازے کی چوکھٹ سے سر ٹکرا گیا اور سچ مچ سر سے خون نکل آیا۔ گھر والوں کو پہلے تو یقین ہی نہ آیا کہ سچ مچ خون بہہ رہا ہے پھر یقین کرنا پڑا کیوں کہ میں گر کر بیہوش ہوگیا تھا۔

اس شرارت کے بعد میں نے کبھی ایسی شرارت نہیں کی جس کی وجہ سے سب لوگ پریشان ہو جائیں۔

خوبصورت باتیں

- جدوجہد میں ہی زندگی کا راز چُھپا ہے۔
- خوش مزاج انسان ٹوٹے ہوئے دل کی دوا ہے۔
- بُری بات کی مخالفت باہمت آدمی ہی کر سکتا ہے۔
- بندوں کی خدمت کرنا بھی عبادت ہے۔

مرسلہ...... افتخار عالم، کراچی۔

سال نیا اور......
قُلفی کھائی

کامران غوری، کراچی

گولہ گنڈا قُلفی کھائی
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بھی آئی
اوڑھنی پڑ گئی ایک رضائی
امی نے بھی ڈانٹ پلائی
کیا کیا پھر تکلیف اُٹھائی
مہنگی پڑ گئی قلفی بھائی
اللہ توبہ، میری دُہائی
خوب سزا غلطی کی پائی
وقت نے اک ترکیب بتائی
سال نیا ہے اور پڑھائی

یہ شعر مجھے پسند ہے

یہ جو زندگی ہے پہاڑ سی یہ جو روز و شب ہیں چٹان سے
انہیں ضبطِ غم، انہیں لطفِ کرم، انہیں چشمِ نم سے تراشیئے
(مرسلہ...... محمد نوید، حیدر آباد)

اپنے کردار کو موسم سے بچائے رکھنا
ٹوٹ کر پھول میں واپس آتی نہیں خوشبو
(مرسلہ...... فیصل احمد شجراہ، جیکب آباد)

مُشکلیں آپ ہی آساں ہو جاتی ہیں
حادثے جینے کا انداز سکھا دیتے ہیں
(مرسلہ...... دانش صدیق، کراچی)

اخلاص کی جاگیر کو ہم اہلِ محبت
تقسیم تو کر دیتے ہیں بیچا نہیں کرتے
(مرسلہ...... سید رشید احمد، کراچی)

علم دولت ہے

○ علم ایک ایسی دولت ہے جسے کوئی چوری نہیں کر سکتا۔

○ علم ایسی بارش ہے جو ہر ایک پر برستی ہے۔

مرسلہ... عبداللہ عرف شہزاد گل، پشاور

گذشتہ ماہ سعدیہ یاسمین کی خوبصورت کہانی "بلاعنوان" پیش کی گئی تھی۔ ساتھیوں کی کثیر تعداد نے ہمیں اچھے اچھے عنوانات ارسال کئے۔ لیکن انعام کے حقدار قرار پائے ہیں دو ساتھی محمد وسیم اور افتخار عالم جنھوں نے ایک ہی عنوان ارسال کیا ہے۔ عنوان ہے "میرا بیٹا پاکستان میں مرے گا"

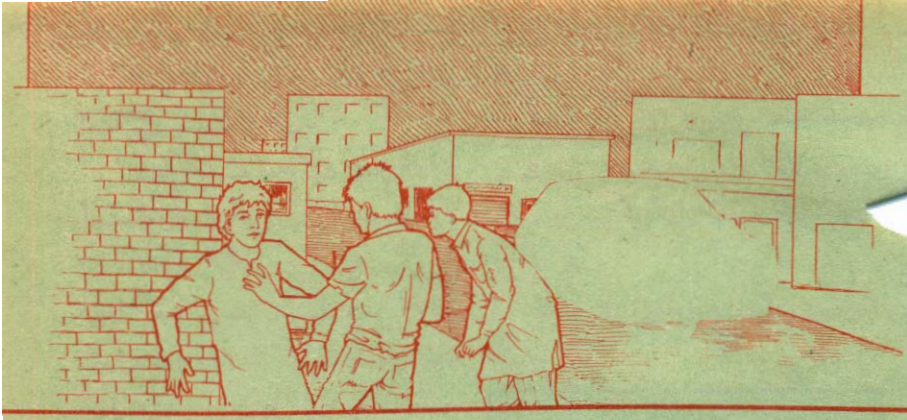

دلچسپ شرارت

عروسہ فاروقی، کراچی

سردیوں کے دن تھے۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ سردیوں کی وجہ سے رات نو بجے کے بعد ہی گلیوں کی رونقیں پھیکی پڑنا شروع ہو جاتی تھیں لیکن "چاند گلی" کی بات ہی کچھ اور تھی۔ اس دن شرارتی پارٹی سر جوڑ کر بیٹھی تھی اور کوئی نئی شرارت سوچ رہی تھی۔ ایسی شرارت جو بہت دلچسپ بھی ہو اور جس میں کسی کا نقصان بھی نہ ہو۔ تمام شرارتی لڑکے جب ذہن لڑا چکے اور کوئی شرارت ذہنوں میں نہ آئی تو شیخو نے لمبی سی جمائی لیتے ہوئے کہا۔

"بھئی! میں تو گھر جا رہا ہوں مجھے نیند آ رہی ہے۔" "لگتا ہے تم افیم کھانے لگے ہو ہر وقت نیند ہی آتی رہتی ہے تمہیں۔" دانش نے جل کر کہا تو سب ہنس پڑے۔

"ٹائم بھی تو دیکھو، دس بج رہے ہیں۔ جانے دو بے چارے کو ابو گھر پر اس کا ڈنڈا لے کر انتظار کر رہے ہوں گے۔" عماد نے شوخ لہجے میں کہا تو شیخو کو غصہ آگیا۔ آستینیں چڑھا کر بولا۔

"ڈنڈا لے کر تو تمہارے ابو انتظار کر رہے ہوں گے، ہمارے گھر میں تو ویسے بھی سب لوگ دیر سے سوتے ہیں۔"

"سوائے تمہارے کیوں کہ تم ہی افیم کھا کر سوتے ہو۔" عماد نے یہ کہہ کر شیخو کو مزید غصہ دلایا۔ اس سے پہلے کہ نوبت ہاتھا پائی تک جا پہنچتی پارٹی کے سرکردہ شرارتی ممبروں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔

اور پھر پارٹی کے سرغنہ عماد نے ایک نئی شرارت پارٹی کے سامنے منظوری کے لئے پیش کی جو اکثریتی رائے سے عماد کا کندھا تھپکنے کے بعد فوراً منظور کر لی گئی۔ شیخو بھی اس شرارت کو سُن کر ہنس

پڑا اور عماد کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔

"اگر تم افیم والی بات واپس لے لو تو میں تمہارا کندھا تھپکنے کے لئے تیار ہوں۔"

"نہ بھائی، تمہارے کندھا تھپکنے سے ہی مجھے نیند آنے لگے گی اور میں بھی....." عماد نے شیخو کو مزید تاؤ دلایا۔ "دیکھو.....!

دیکھو! تم پھر پٹڑی سے اترنے لگے ہو۔" شیخو نے سنجیدگی سے کہا تو عماد نے مسکراتے ہوئے اپنا کندھا شیخو کی طرف کر دیا اور کہا "میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں تم واقعی افیم نہیں کھاتے ہو۔ لو کندھا تھپتھپاؤ میرا جلدی سے۔"

ٹی وی پر طویل دورانئے کا کوئی ڈرامہ آ رہا تھا لوگ ڈرامہ دیکھنے میں لگے ہوئے تھے اور شرارتی پارٹی کے ارکان بڑی جلدی جلدی گلی میں کھڑی گاڑیوں کے ساتھ شرارتیں کرنے میں مصروف تھے۔ گاڑیوں کے پہیوں کی ہوا نکالنے میں نہیں بھئی بلکہ..... یہ تو کچھ اور ہی دلچسپ سی شرارت کر رہے تھے۔

صبح ہوئی تو گلی میں ایک غُل مچا ہوا تھا۔ شیخ صاحب ڈاکٹر صاحب پر برس رہے تھے اور ڈاکٹر صاحب وکیل صاحب پر تو وکیل صاحب حیران و پریشان کھڑے دیکھ رہے تھے کہ ان کی گاڑی کا کپڑا صوفی صاحب کی گاڑی پر لگا ہے۔

خیر تھوڑے سے ہنگامے کے بعد سب بڑوں کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ یہ کسی کی شرارت ہے۔ اس طرح تھوڑی گرما گرمی کے بعد مسکراہٹوں اور اپنی اپنی گاڑیوں کے کپڑوں کی واپسی کے تبادلے پر اس شرارت کا انجام ہوا۔

شرارتی پارٹی کے ارکان بڑی معصوم صورت بنائے ساری صورتِ حال سے محظوظ ہو رہے تھے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اصل شرارتی انہی کی ہے۔

شرارت ہمیشہ ایسی ہونی چاہئے جس میں کسی کا نقصان نہ ہو۔

گُڑیا

میری گُڑیا ایک نرالی
صورت کتنی بھولی بھالی
آنکھیں یہ ٹم ٹم جھپکائے
چابی دو اور چلتی جائے
بال سنہرے گال گلابی
میری گُڑیا سب سے پیاری
اک شو کیس میں رہتی ہے یہ
ہر دم سوتی رہتی ہے یہ
دل میں ہے بس ایک تمنا
سب کے پاس ہو ایسی گُڑیا

نازیہ غوری، کراچی

شریر ثروت

کامران احمد شفیق، حیدر آباد

ایک ہے لڑکی دبلی پتلی
ہلکی پھلکی جیسے تتلی
صورت اس کی پیاری پیاری
اس کو ہے بس ایک بیماری
سارا دن وہ کرے شرارت
شب آتے ہی چڑھے حرارت
بھائی کے وہ کان مروڑے
اور چوزوں کے پیچھے دوڑے
کرتی ہے جس وقت پڑھائی
بجتے ہیں چہرے پہ ڈھائی
دانت ہیں اس کے گویا پرت
اس لڑکی کا نام ہے ثروت

کرنیں

○ — اپنے دوستوں کے انتخاب میں بہت ہوشیاری سے کام لو۔ کیونکہ دوست زندگی کا قیمتی سامان ہوتے ہیں۔

○ — ہر شے کا ایک حسن ہوتا ہے۔ نیکی کا حسن یہ ہے کہ فوراً کی جائے۔

○ — کسی کا دل نہ دُکھاؤ۔ ہو سکتا ہے کہ وہ آنسو تمہارے لئے سزا بن جائیں۔

مرسلہ ..... اطہر اقبال صدیقی

جواہر پارے

○ — جو لوگ کچھ کر سکتے ہیں۔ وہ کرتے ہیں جو کچھ نہیں کر سکتے وہ ہدایات دینے لگتے ہیں۔

○ — جس کا پیٹ بھرا ہو وہ کچھ نہیں کرتا۔

○ — غریب کو روٹی کوئی نہیں دیتا، مشورے سب دیتے ہیں۔

○ — شیر کی دُم بننے سے بہتر ہے آدمی چیونٹی کا سر بن جائے۔

مرسلہ ..... عاصم، پی اینڈ ٹی کالونی، کراچی۔

اس ماہ قاسم بن نظر کی خوبصورت کہانی "بلا عنوان" شائع کی جارہی ہے اس کے لئے موزوں عنوان تجویز کر کے ہمیں ۱۰ فروری تک اس پتے پر بھجوا دیجئے۔

انچارج قلم دوست

ماہنامہ آنکھ مچولی۔ ۱۔ بی آئی بی کالونی، کراچی

قاسم بن نظر، کراچی۔

بلا عنوان

احمد کو بی اے کرنے کے بعد..... سیٹھ کبیر رضا کے ہاں نوکری مل گئی تھی لیکن اس کا کام کچھ عجیب سا تھا جسے کرتے ہوئے اسے اُلجھن محسوس ہوتی۔

سیٹھ کبیر رضا شہر کے سب سے بڑے رئیس تھے اور چوہدری فضل جو ملک کے ایک بڑے سیاست دان تھے وہ ان کے پارٹنر۔ احمد کا کام یہ تھا کہ ایک بریف کیس اسے دیا جاتا جو وہ مختلف لوگوں کو پہنچاتا۔ اس کام کے لئے بڑی راز داری برتی جاتی تھی۔ ایک ہی مہینے بعد احمد کو اندازہ ہو گیا کہ کچھ گڑبڑ ہے پھر اسے کسی طرح معلوم ہو گیا کہ جو بریف کیس اسے دیا جاتا ہے اس میں ملکی راز ہوتے ہیں جو سیٹھ کبیر اور چوہدری فضل دشمن ملک کے آدمیوں کو بیچ دیتے ہیں۔ یہ جان کر احمد کو بے حد دُکھ ہوا۔ "مجھے فوراً یہ نوکری چھوڑ دینی چاہئے۔" احمد نے استعفیٰ دینے کا سوچا۔ "لیکن نہیں..... مجھے پہلے ملک دشمنوں کو قانون کے حوالے کرنا چاہئے۔" احمد شہر کے ڈی آئی جی صاحب سے ملا اور انہیں تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔

ڈی آئی جی صاحب نے بڑے غور سے اس کی باتیں سُنیں پھر کہا۔

"تمہارا بہت شکریہ! تم نے وطن دشمن عناصر کی سرگرمیوں سے آگاہ کیا..... لیکن تمہیں معلوم ہے یہ دونوں آدمی کتنے خطرناک ہیں؟ بڑے بڑے لوگوں سے ان کے تعلقات ہیں اگر ہم نے ان پر ہاتھ ڈالا تو کُچل دئے جائیں گے۔"

"سر! یہ آپ کہہ رہے ہیں۔ قانون کے محافظ ہو کر بھی۔ قانون تو مجرموں کو پکڑنے کے لئے بنایا جاتا ہے۔"

احمد کی بات سن کر ڈی آئی جی اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور پھر کھڑکی تک گئے۔ کچھ دیر تک سوچتے رہے پھر کسی فیصلے پر پہنچ گئے۔ انہوں نے گھنٹی بجا کر اپنے اردلی کو بلایا اور احمد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ڈکیتی کیس کا جو مجرم بھاگ گیا ہے اس کا نام بھی احمد ہے اور یہ بھی احمد۔ تم اسے ڈکیتی کیس میں بھرتی کر کے جیل میں ڈال دو۔ کم از کم دو سال کی سزا تو ہوگی اسے۔"

اردلی معنی خیز انداز میں مُسکرایا پھر وہ احمد کو پکڑ کر کمرے سے باہر حوالات میں لے گیا۔ احمد بُری طرح چیخ رہا تھا اور اپنی بے گناہی کا یقین دِلا رہا تھا۔

احمد کے حوالات بھیجے جانے کے بعد ڈی آئی جی صاحب نے بڑے تھکے ہوئے انداز میں کرسی سے ٹیک لگا لی۔ انہیں احمد سے ہمدردی تھی لیکن وہ اسے حوالات میں بند نہ کرتے تو باہر سیٹھ کبیر رضا اور چوہدری فضل حق کے آدمیوں کے ہاتھوں احمد مارا جاتا کیوں کہ ان بڑے لوگوں کے ہاتھ بڑے لمبے تھے۔ اتنے لمبے کہ کبھی کسی کو گراتے تھے اور کبھی کسی کو کرسی پر بٹھاتے تھے اور انہی ہاتھوں نے قانون چلانے کے لئے خود انہیں ڈی آئی جی کی کرسی پر بٹھایا تھا۔ ○○

ایسا بھی ہوتا ہے

سیّد محمد اسامہ
راولپنڈی

ایک بیل پر لدے تھے انگور خوشنما سے لگ رہے تھے پیارے شاید تھے میٹھے میٹھے پھرتی پھراتی آئی ایک لومڑی کہیں سے بھر آیا منہ میں پانی دیکھے جو اس نے خوشے سوچا کے توڑ لوں گی ان کو اُچھل اُچھل کے وہ خوب اُچھلی کودی اُمید کے سہارے لیکن نہ ہاتھ آئے اونچے تھے وہ زمیں سے کہتی ہوئی وہ لوٹی انگور جب نہ پائے انگور ہیں یہ کھٹے، اللہ مجھے بچائے

ہمیں شرارت کرنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ دن رات دماغ میں عجیب عجیب شرارتیں گردش کرتی رہتی تھیں۔ خالہ آمنہ کا گھر ہمارے گھر کے برابر ہے ہم روزان کے گھر کی گھنٹی بجا بجا کر بھاگتے ایک دن انہوں نے ہمیں دیکھ لیا اور شکایت گھر پہنچا دی پھر تو اس شیطانی شرارت پر

شرارت ایسی ویسی

ایم۔ اعجاز احمد

ہماری خوب پٹائی ہوئی۔ ایک دن خالہ آمنہ گھر بیٹھی کھیر پکا رہی تھی۔ ہم نے کھیر کی خوشبو پالی اور لگے شرارت سوچنے اچانک ہم اچھلے کیونکہ دماغ میں ایک مزیدار شرارت آ چکی تھی۔ ہم بھاگے بھاگے بازار گئے اور ایک پاؤ دہی خریدا۔ خالہ آمنہ نے کھیر پکالی تھی اور ٹھنڈی کرنے کے لئے پلیٹ بھر کر کھڑکی کے پاس رکھ دی تھی۔ ہمارے لئے یہ ایک سنہری موقع تھا۔ ہم آہستہ آہستہ کھڑکی تک گئے اور ہاتھ بڑھا کر پلیٹ اٹھالی پھر اور جھٹ پٹ کھیر کھائی اور اسی پلیٹ میں دہی ڈال دیا اور واپس پلیٹ وہیں رکھ دی۔ خالہ آمنہ کھڑکی کے پاس آئیں اور کھیر کھانے کے لئے پہلا ہی چمچہ منہ میں لیا تو کھیر ان کے منہ سے باہر آگئی اور وہ عجیب عجیب سے منہ بنانے لگیں۔ انہیں منہ بناتا دیکھ کر ہم جو کھڑکی کے قریب چھپے کھڑے تھے ہنس پڑے۔

ہمیں ہنستا دیکھ کر وہ سب سمجھ گئیں کان پکڑ ہمیں ابّو کے پاس لے گئیں اور ابّو نے پھر ایسی کھیر کھلائی کہ ہم شرارتیں کرنا بھول گئے۔

دانائی کی باتیں

مرسلہ

اظہر خان

کراچی

○ ــ سانپ کا سر، بچھو کا ڈنک اور بُرے آدمی کا انگ انگ زہریلا ہوتا ہے۔

○ ــ تمہارے ایمان میں تمہاری سادگی ہے۔

○ ــ پہاڑوں کی چوٹیاں بنو جو ایک دوسرے کو دیکھتی رہتی ہیں۔ گڑھے نہ بنو جو ایک دوسرے کو دیکھ نہ سکیں۔

○ ــ پست خیال لوگوں سے ہمیشہ بچو۔

جب ہم چھپکلی بنے

ہرجیت سنگھ
ڈاگی محلہ

میں بہت شرارتی ہوں۔ ہر وقت نت نئی شرارتیں سوجھتی رہتی ہیں۔ ایک دفعہ مجھے بہت ہی مزے کی شرارت سوجھی۔ اصل میں ہماری بڑی باجی چھپکلیوں سے بہت ڈرتی ہیں۔ ایک دن جب وہ کپڑوں پر استری کر رہی تھیں تو میں نے یہ شرارت کی کہ کپڑوں پر ربڑ کی ایک مصنوعی چھپکلی رکھ دی۔ باجی کپڑوں کو سیدھا کرنے لگیں تو ان کے ہاتھ میں مصنوعی چھپکلی آ گئی۔ چھپکلی کو دیکھتے ہی ان کی جیسے جان نکل گئی اور وہ ایک زور دار چیخ مار کر بے ہوش ہو گئیں۔ ڈاکٹر کو بلایا گیا تب کہیں جا کر انہیں ہوش آیا۔ گھر والوں کو جب پتہ چلا کہ کپڑوں میں مصنوعی چھپکلی میں نے رکھی تھی تو پھر وہ مار پڑی کہ مجھے بھی چھپکلی بننا پڑا۔

آنکھ مچولی کا سالانہ خریداری کا کوپن

نام _____

مہینہ جس سے رسالہ شروع کروانا چاہتے ہیں _____

رقم _____ بذریعہ _____

پتہ _____

_____

فون نمبر _____

آخری بات

محمد سفیان انصاری، کراچی

غصہ انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ غصے کے وقت انسان آپے سے باہر ہو جاتا ہے، اسے کوئی برائی یا بھلائی نظر نہیں آتی، عقل کھو جاتی ہے، آنکھوں پر پردہ پڑ جاتا ہے اور دماغ غلط خیالات کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ دنیا میں بڑے بڑے فسادات اور خوں ریزیاں اس غصے ہی کا نتیجہ ہیں اسی لئے اسلام نے غصے کو حرام قرار دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے کہ "جو لوگ غصے کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کی غلطیاں معاف کر دیتے ہیں وہ میرے دوست ہیں"۔ اور اسی طرح سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث مبارکہ ہے کہ "کبھی غصہ مت کرو، کیوں کہ غصے کے وقت انسان پر شیطان کا پورا پورا قبضہ ہو جاتا ہے۔"

حضرت عمر بن العزیزؒ نے ایک دفعہ اپنے گورنروں کو ہدایت کی کہ جب تم غصے میں ہو تو کسی بھی مجرم کا فیصلہ مت کرو بلکہ جب غصہ ٹھنڈا ہو جائے تو صحیح طور پر معاملے کی چھان بین اور پوچھ گچھ کر کے فیصلہ کرو۔ اس لئے کہ غصے کی حالت میں انسان کی عقل صحیح طرح کام نہیں کرتی ایسے میں کوئی فیصلہ انصاف کے مطابق نہ ہوگا۔

غصہ ہماری معاشرتی زندگی کو بھی بہت متاثر کرتا ہے۔ غصیلے لوگ مزاج میں چڑچڑے سخت اور روکھے ہوتے ہیں۔ وہ زیادہ تر معاشرے سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ بچے بھی غصیلے اساتذہ کے بجائے نرم دل اور خوش اخلاق اساتذہ کو پسند کرتے ہیں۔

غصے سے ہماری صحت اور جسمانی حالت پر بھی منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ انجائنا (دل کا درد) بالعموم غم وغصے کی وجہ سے رہتا ہے۔ علاوہ ازیں غصے کے وقت خون کا دباؤ (بلڈ پریشر) بڑھ جاتا ہے۔ چہرے سے ہیجان کے اثرات نمودار ہوتے ہیں اور منہ سے لعاب دہن زیادہ خارج ہوتا ہے جس کے باعث بات کرنے میں دشواری ہوتی ہے، جملے پھسلنے لگتے ہیں اور جسم کانپنا شروع ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی لوگ غم وغصے کی وجہ سے پاگل بھی ہو جاتے ہیں۔

"آپ کا تو کوئی ایسا پروگرام نہیں ہے ناں؟؟"

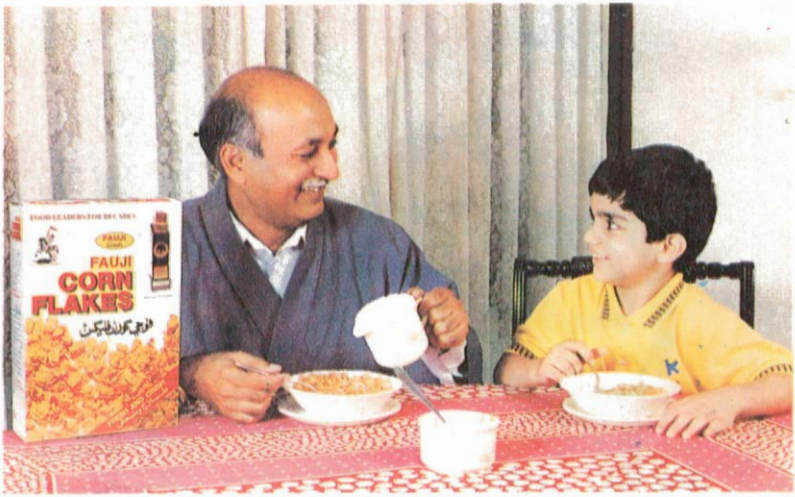

THE WISDOM

The wisdom passed on to the younger generation should include sensible nutrition.

Fauji Cereal products are full of energy and good taste.

ACCORDING TO THE STANDARDS OF W.H.O

FAUJI Cereals

Food Leaders for Decades

Fauji Cereals, Dhamial Road P.O.Box 57, Rawalpindi

REGD. No. M-266 FEBRUARY 1994
MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI

ELFY

ایلفی

ہر چیز سیکنڈوں میں جوڑے

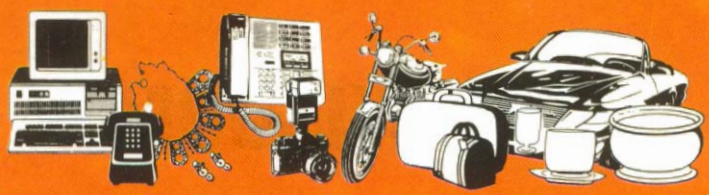

زیورات، ریڈیو، ٹیلی ویژن، ریفریجریٹر، کھلونے، کھیل کا سامان، فٹ بال، گل دان، عام گھریلو اشیاء، کار اسکوٹر، سائیکل ٹائر، ناب، ڈیش بورڈ، وینائل ٹرم، تھرماس، چشمے کے فریم، قلم، پرس، سوٹ کیس، بریف کیس جوتے، بیلٹ، سینڈل، ہینگر، کیمرہ وغیرہ کو بآسانی جوڑا جا سکتا ہے

ایلفی کے جوڑ دو ٹن سے زائد قوت برداشت کرتے ہیں

ایتھلیٹ اِن ایکشن

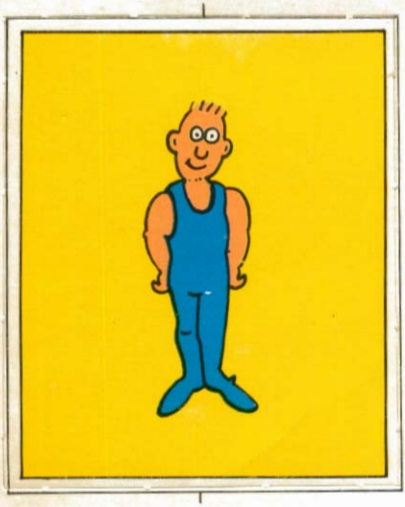

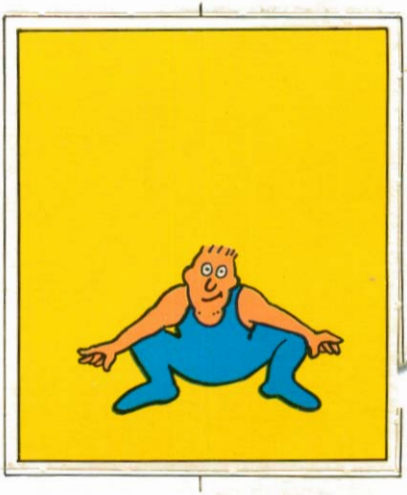

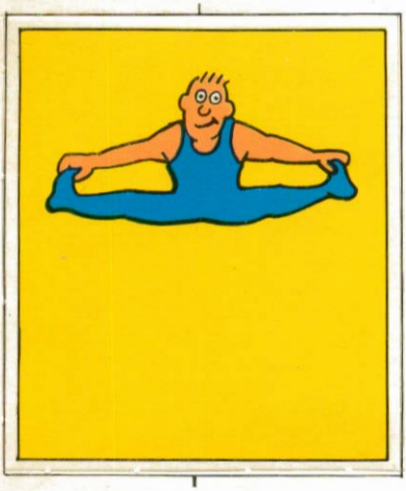

ان شرارتی کھیلوں سے متعلق تفصیلات
آنکھ مچولی شرارت نمبر کے صفحہ ۲۲۱ پر ملاحظہ فرمائیں

قیدی مچھلی

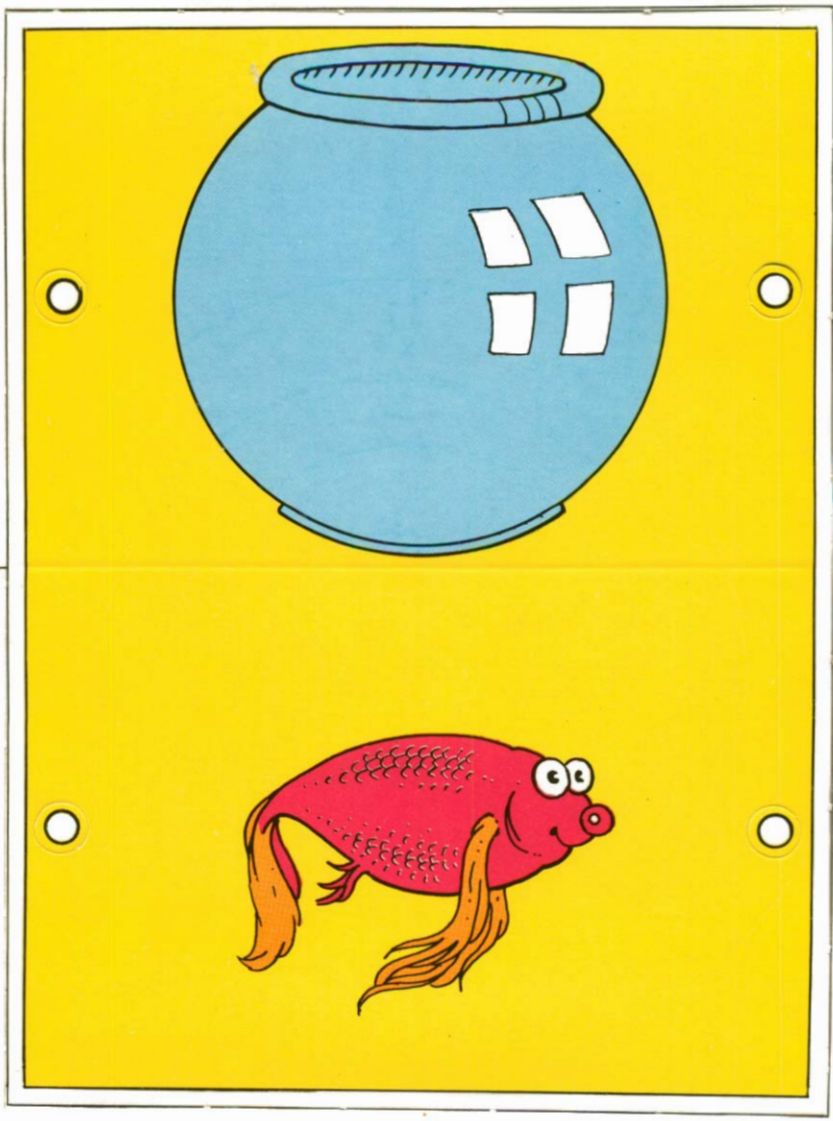

جادوئی کھیلوں کی کتاب کی علیحدہ سے قیمت ۶ روپے ہے

جادوئی کھیل

گھومنے والا سانپ

جادوئی پہیّہ

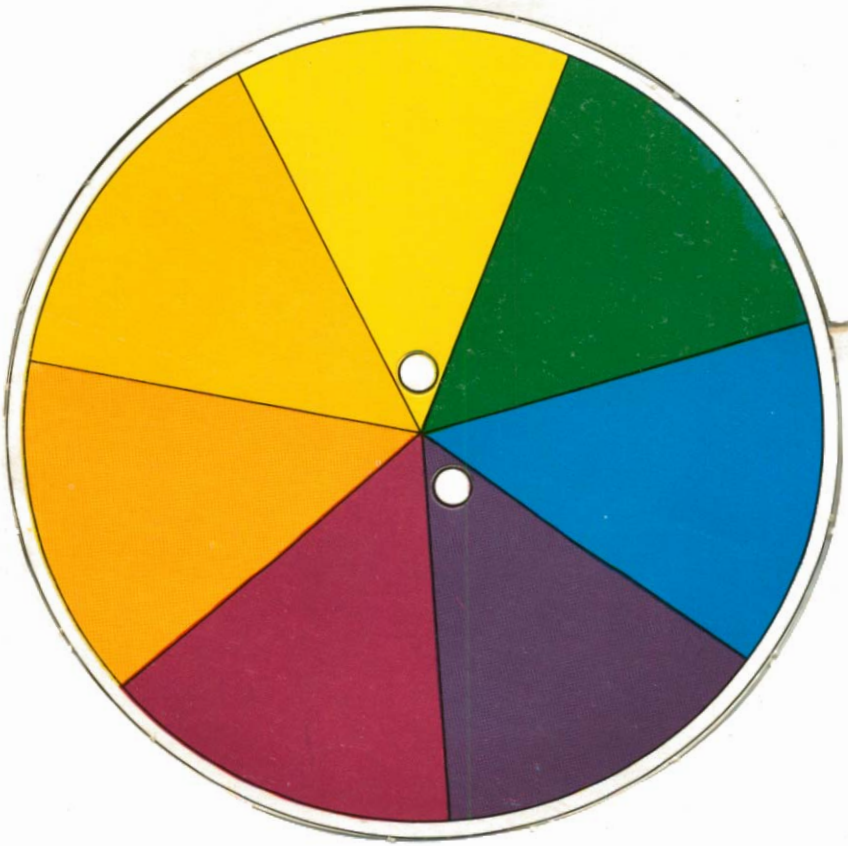

جادوئی کھیلوں کی یہ کتاب "آنکھ مچولی شرارت نمبر"
فروری ۱۹۹۴ء کے ساتھ تحفتاً پیش کی گئی۔